افسانے

کیمیا گر

شوکت صدیقی



کیمیا گر

(افسانے)

شوکت صدیقی

ڈھپالی

جاڑوں کی رات تھی۔ سرشام ہی سناٹا پڑ گیا تھا۔ میری ہمیشہ کی عادت ہے کہ دیر سے سوتا ہوں۔ کبھی اول شب نیند نہیں آئی۔ اس روز بھی ایسا ہی ہوا۔ گھر کے اور افراد تو کب کے اپنے اپنے بستروں پر جا چکے تھے۔ میں کچھ دیر تو ایک جاسوسی ناول پڑھتا رہا' پھر یوں ہی بیٹھے بیٹھے گنگنانے لگا۔

چھٹے اسیر تو بدلا ہوا زمانہ تھا
نہ پھول تھے نہ چمن تھا' نہ آشیانہ تھا
اے باغباں تجھے کیا' کیا نشان بتلاؤں

دوسرے شعر کا مصرعہ ثانی اب یاد نہیں۔ غالباً آرزو لکھنوی کی غزل کا شعر ہے۔ ان دنوں فلم ''دیوداس'' نئی نئی ریلیز ہوئی تھی۔ سہگل کے گانوں سے گلی کوچے گونجتے تھے۔ جسے دیکھو الاپ رہا ہے۔

بالم آن بسو مورے من میں

مگر یہ غزل' پہاڑی سانیال نے گائی تھی۔ فلم میں تو یہ گانا مجھے زیادہ پسند نہ آیا۔ لیکن نہ جانے کیوں اس وقت میں اسے گنگنانے لگا۔ ہوسکتا ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ میں کئی سال بعد لکھنو واپس آیا تھا۔ پرانا گھر چھٹ چکا تھا اور نئے گھر میں یہ میری پہلی رات تھی۔ پچھلے گھر سے بہت سی ایسی یادیں وابستہ تھیں' جن کے اظہار کا یہاں موقع نہیں۔

گنگناتے گنگناتے ترنگ میں جو آیا تو اونچے سروں میں گانے لگا۔ میرا کمرہ سب سے الگ تھلگ سڑک کے رخ پر تھا۔ لہٰذا یہ خدشہ بھی نہ تھا کہ گھر میں کسی کی نیند خراب ہوگی۔ پوری غزل ختم بھی نہ ہوئی تھی دفعتاً کسی نے دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔

میں لحاف میں دبکا دبکا یا بیٹھا تھا۔ باہر نکلنے کو جی نہ چاہا۔ بستر پر بیٹھے بیٹھے اونچی آواز میں پوچھا۔ ''کون ہے؟''

باہر سے آواز آئی۔ ''ذرا دروازہ تو کھولیے۔''

لہجہ میرے لیے بالکل نامانوس اور اجنبی تھا۔ خدا معلوم کون اس جاڑے پالے میں نازل ہوا تھا۔ بادل ناخواستہ لحاف چھوڑا۔ سردی سے کپکپاتا بستر سے نیچے اترا۔ دروازہ کھولا۔ سامنے ایک ادھیڑ آدمی کھڑا تھا۔ جنگلی کبوتر کی سی سرخ سرخ آنکھیں' موٹی پکوڑا

سی ناک' گھنی مونچھیں' سر پر لکھنوی بانکوں کے سے پٹے' کالا بھٹ چہرہ اور اس پر عجب سی کرختگی' بڑا ہی بدشکل آدمی تھا۔

اس نے نظر بھر کر مجھے دیکھا اور نہایت بے تکلفی سے کمرے کے اندر گیا۔ اپنی پرانی اونی شال' سنبھال کر جسم کے گرد لپیٹی اور کرسی کھسکا کر اطمینان سے بیٹھ گیا۔ میں ابھی تک گم صم کھڑا تھا۔ مجھے حیرت زدہ دیکھ کر گویا ہوا۔

''کھڑے کیوں ہیں؟ بیٹھ جایئے۔''

میں گومگو کے عالم میں قریب رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔ میرے بیٹھتے ہی اس نے پیر سے جوتا نکالا اور سامنے ڈال دیا۔ لہجے میں رقت پیدا کرتے ہوئے گھگیا کر بولا۔

''دس جوتے مار دیجئے۔''

میں ٹپٹا کے رہ گیا۔ یا اللہ یہ اس وقت کیا مصیبت آئی۔ مجھے خاموش اور بھونچکا دیکھ کر اس نے اور زیادہ رقت آمیز لہجے میں کہا۔

''اجی' دیکھ کیا رہے ہیں؟ اٹھایئے نا جوتا۔'' اس کا ہاتھ اپنے سر پر گیا' ٹوپی اتاری اور گردن جھکا کر سامنے کر دی۔

''لیجئے یہ سر حاضر ہے۔''

جی تو بہت چاہا کہ دس کی بجائے تڑاتڑ بیس جوتے لگاؤں' سخت طیش آیا۔ لیکن جس قدر مجھے طیش آرہا تھا' وہ اسی قدر بھیگی بلی کی طرح مسکین بنا بیٹھا تھا۔ سمجھ ہی میں نہ آیا' کیا کروں' کیا کہوں؟ عجب افتاد پڑی تھی۔ ذرا غور تو کیجئے۔ ایک اچھا بھلا آدمی آپ کے سر ہو جائے کہ دس جوتے مار دیجئے اور وہ بھی خواہ مخواہ۔ ایسی صورت میں بجز حواس باختہ ہو جانے کے اور ہو بھی کیا سکتا تھا۔

مجھے ششدر دیکھ کر کہنے لگا۔ ''نہیں مار سکتے۔'' اس دفعہ اس کا لہجہ تیکھا تھا۔ ہونٹوں پر زہر خند تھا۔ اپنی سرخ سرخ آنکھیں نکال کر مجھے دیکھا۔ گردن اونچی کی۔ آواز میں کھرج پیدا کرتے ہوئے تنبیہہ کی۔ ''تو پھر للہ آئندہ یہ راگ نہ الاپئے گا۔'' وہ نرم پڑ گیا اور میرے آگے عاجزی سے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔

اس حرکت پر غصہ بھی آیا' ہنسی بھی۔ مجھے اپنے بے سرے پن کا کسی نے اتنی شدت سے احساس نہیں دلایا تھا۔ مگر بات کہنے کا اس نے جو انداز اختیار کیا تھا وہ بڑا انوکھا اور عجیب و غریب تھا۔ میں نے دل ہی دل میں توبہ کیا کہ اب بھولے سے بھی کبھی نہیں گنگناؤں گا۔ اب سوال یہ درپیش تھا کہ وہ ہے کون؟

یہ معمہ ذرا دیر بعد اس نے خود ہی حل کر دیا۔ نہایت ادب سے گویا ہوا۔ ''معاف کیجئے گا اس گستاخی کو۔ میں بہت دیر سے بستر پر لیٹا' آپ کی آواز سن رہا تھا۔ بہت ضبط کیا مگر جب مجبور ہو گیا تو اٹھ کر آپ کے پاس چلا آیا۔ بات یہ ہے کہ مجھے بھی گانے بجانے سے

کچھ لگاؤ ہے۔ جس دھن میں آپ گا رہے تھے وہ راگ اساوری ہے۔ اسے یوں الاپتے ہیں۔'' اس نے مدھم سر میں گنگنانا شروع کر دیا۔ چند منٹ تک ایک ہی مصرعہ الاپتا رہا' پھر اس نے راگ اساوری پر باقاعدہ لیکچر دیا۔ جوتا اٹھا کر پہنا۔ سر پر ٹوپی رکھی اور پرانی شال سنبھالتا ہوا اٹھ کر کمرے سے چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد میں دیر تک دم بخود بیٹھا رہا۔ رہ رہ کر یہ خیال ستاتا کہ یہ غزل تو بہت مہنگی پڑی۔

استاد شیدی سے یہ میری پہلی ملاقات تھی اور اس پہلی ہی ملاقات میں ان کی شخصیت سے اتنا مرعوب ہوا کہ آج تک کبھی غسل خانے میں بھی گنگنانے کی ہمت نہیں ہوئی۔

ان کا اصل نام کیا تھا؟ یہ تو مجھے معلوم نہیں۔ مگر عرف عام میں وہ استاد شیدی کے نام سے پہچانے جاتے تھے۔ صورت شکل سے بھی وہ حبشی نژاد نظر آتے تھے۔ میرے پڑوس میں رہتے تھے۔ محلے میں ان کے علاوہ اور بھی گانے بجانے والے تھے۔ وہ کشمیری بھانڈ کہلاتے تھے۔ عورتوں کی طرح باقاعدہ لمبی لمبی چوٹیاں رکھتے تھے اور مردانہ لباس میں بڑے عجیب وغریب نظر آتے تھے لیکن جب وہ مجرا کرتے تو نوجوانوں کو پہچاننا مشکل ہو جاتا۔ گوٹا کناری لگے لہنگے اور چولیاں پہنے جب وہ زرتار دوپٹے کا گھونگھٹ نکال کر بھاؤ بتاتے اور ساز و آواز کا جادو جگاتے تو ان کے سامنے کبھی کبھی مشہور طوائفوں کا رنگ بھی پھیکا پڑ جاتا۔

ان میں سب ہی رقص کرنے والے نہیں تھے۔ بعض صرف نقل کرتے تھے۔ پھبتیاں کستے تھے۔ ٹھٹول بازی کرتے تھے۔ اہل محفل کو ہنساتے تھے۔ داد وصول کرتے تھے۔ انعام و اکرام پاتے تھے۔ جن کی عمر ڈھل گئی تھی' وہ محض گانا گاتے تھے یا کبھی کبھار کسی پرانے قدر کی فرمائش پر مجرا بھی کر لیتے تھے۔ ورنہ عام طور پر یہ نوجوان کا حصہ تھا۔

ان دنوں کرامت جان کا بھانڈوں میں بڑا شہرہ تھا۔ اس کی یہ شہرت ''چندراولی'' کی بدولت تھی۔ ''چندراولی'' نوٹنکی کے طرز کا ایک کھیل تھا۔ ایک رہس تھا۔ کرامت جان کی منڈلی ''چندراولی'' کو بڑے موثر انداز میں پیش کرتی تھی۔ کرامت جان خود چندراولی کا کردار ادا کرتا تھا اور ایسی عشوہ طرازی سے اپنی چھب دکھاتا تھا کہ اس پر کسی طرح دار نازنین کا گمان ہوتا تھا۔ تھا بھی خوش شکل' چھریرا جسم' تیکھے ناک نقشہ' آواز میں سرکارس۔ چندراولی کے روپ میں جب وہ رقص کے ساتھ ساتھ گانا بھی گاتا تو سماں بندھ جاتا۔

سنا ہے استاد شیدی ایک زمانے میں کرامت جان کے چچا فرحت جان کی منڈلی میں شامل تھے اور ''چندراولی'' میں ڈاکو در بجے سنگھ کا کردار کرتے تھے۔ کہنے والے کہتے ہیں' جب وہ اپنے کالے کلوٹے چہرے پر کالک مل کر' سرخ سرخ انگارہ سی آنکھیں نکال کر سپاہیوں کو ڈانٹتے اور طبلے کی تھاپ پر لہک لہک کر تان لگاتے۔ ''رن کرو دراز' باندھو کمر سے چست۔'' تو ان کی پاٹ دار آواز سے

سنسنی پھیل جاتی تھی۔ اہل محفل کے خون کی گردش تیز ہو جاتی۔

تھے تو وہ بھی ذات کے بھانڈ' مگر ان کا تعلق کشمیری بھانڈوں کے نچلے طبقے سے تھا جن کو ڈھپالی کہا جاتا ہے۔ ڈھپالی عام طور پر طبلہ منڈھنے کا کام کرتے تھے۔ استاد شیدی بھی لڑکپن میں طبلوں پر کھال منڈھتے تھے۔ مزاج میں سرکشی اور تنک چڑھا پن ہمیشہ سے تھا۔ ایک بار کسی کاریگر سے لاگ ڈانٹ ہو گئی۔ اسی روز روپے' سوا روپے کی روزی پر لات ماری اور استاد کلن خان کے پاس پہنچے۔ وہ مادھولال کی چڑھائی پر رہتے تھے اور اپنے وقت کے مانے ہوئے سارنگی نواز تھے۔

جن لوگوں نے انہیں استاد کلن کی شاگردی میں دیکھا ہے' ان کا کہنا ہے کہ انہوں نے استاد کی خدمت کا حق ادا کر دیا۔ چلمیں بھرنا اور پاؤں دبانا تو خیر روزمرہ کی بات تھی' بیماری کے زمانے میں انہوں نے استاد کو اپنے ہاتھوں پر تھکوایا تھا۔ تین چار میل روزانہ استاد کو پیٹھ پر پشتارے کی طرح اٹھا کر اسپتال لے جاتے تھے۔ مہینوں یہ سلسلہ جاری رہا۔ بیماری میں استاد کلن کچھ زیادہ ہی چڑچڑے ہو گئے تھے۔ ویسے بھی ان کا مزاج' خدا کی پناہ۔۔۔۔۔۔۔ بگولا تھے بگولا۔ غصہ طاری ہو جاتا تو دیوانے ہو جاتے۔ جو چیز ہاتھ میں آئی اٹھا کر کھینچ ماری۔ اس سے غرض نہیں کہ سر پھٹ گیا یا انگلیاں فگار ہوئیں لیکن پانچ سال کی سخت ریاضت کے بعد جب استاد کلن کے در سے نکلے تو اپنے فن میں کامل تھے۔

میں نے جس وقت استاد شیدی کو دیکھا' وہ کشمیری بھانڈوں کی سنگت چھوڑ چکے تھے۔ ان دنوں وہ چوک کی طوائفوں کو موسیقی کی تعلیم دیتے تھے۔ اسے وہ ٹیوشن کہتے تھے۔ روزانہ غروب آفتاب سے کچھ پہلے وہ ٹیوشن کے لیے گھر سے نکلتے۔ اس وقت ان کی وضع قطع یہ ہوتی۔ سر پر روپلی ٹوپی' ڈھیلی ڈھالی اچکن' چوڑی دار پاجامہ' پیروں میں براؤن پمپ شو اور بغل میں غلاف کے اندر لپٹی ہوئی سارنگی دبی ہوتی۔

طوائفوں کے علاوہ استاد گھر پر بھی کچھ نوجوانوں کو گانے کی تعلیم دیتے تھے۔ ان کے یہ شاگرد عام طور پر ہندو ہوتے۔ گالیاں بکنے میں استاد جواب نہ تھا۔ یہ خصوصیت انہیں استاد کلن سے ودیعت ہوئی تھی۔ مزاج بھی ویسا ہی پایا تھا۔ ذرا سی بات پر ہتھوں سے اکھڑ جاتے۔ ایسے برہم ہوتے کہ یہ بھی نہ دیکھتے کہ منہ سے کیا نکل رہا ہے۔ جو جی میں آتا اول فول بکتے چلے جاتے۔

گھر پر ان کے جو شاگرد تعلیم حاصل کرنے آتے' ان میں بیشتر اعلیٰ تعلیم یافتہ اور کھاتے پیتے گھرانوں کے نوجوان تھے۔ نیپال کے شاہی خاندان کا ایک نوجوان بھی' ان کا شاگرد تھا۔ رانا جوگندر بہادر نام تھا۔ نہایت شائستہ اور ہنس مکھ تھا۔ موسیقی سے دیوانگی کی حد تک لگاؤ تھا۔ یہی شوق اسے کشاں کشاں لکھنؤ لے آیا۔ مجھ سے اس کی تھوڑی سی یاداللہ ہو گئی تھی۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے' بسنت پنچمی کے دوسرے دن کا ذکر ہے۔ دوپہر کا وقت تھا۔ میں اپنے کمرے میں بیٹھا کسی کو خط لکھ رہا تھا۔ استاد کا مکان عین میرے کمرے کے مقابل تھا۔ درمیان میں پندرہ فٹ کی پختہ سڑک تھی۔ استاد کی بیٹھک کی ایک ایک بات مجھے سنائی دیتی تھی۔ اس وقت رانا جوگندر بہادر کو موسیقی کا درس دے رہے تھے۔ راگ راگنیوں کے نام تو مجھے اب تک یاد نہ ہو سکے۔ البتہ اتنا ضرور یاد ہے کہ اس روز وہ کوئی نیا راگ بتا رہے تھے۔ رانا ٹھیک سے بول ادا نہیں کر رہا تھا۔ استاد کئی بار اپنی پاٹ دار آواز میں اسے ٹوک چکے تھے۔ اچانک دوپہر کی خاموشی میں استاد زور سے دھاڑے۔

''ابے ہوش میں ہے یا بھنگ چڑھا کر آیا ہے۔''

رانا خاموش رہا۔ استاد نے ایک بار پھر اسے سمجھایا۔ دو تین بار خود اونچے سروں میں راگ کے بول الاپے۔ مگر رانا سے پھر چوک ہو گئی۔ استاد نے نہایت ثقیل سی گالی دی۔ ڈپٹ کر بولے۔ ''ابے پھر وہی پنچم میں۔ اب کے جو بہکا تو سالے کے حلق میں سارنگی کا پورا گز اتار دوں گا۔''

رانا اس بار بھی خاموش رہا۔ استاد دیر تک الاپتے رہے۔ رک رک کر ہر بول سمجھاتے رہے۔ رانا جوگندر بہادر نے از سر نو سا رے گا ما پا دھا نی الاپنا شروع کیا۔ مگر بات بن نہ سکی۔ استاد جل کر بولے۔ ''دھت تیرے کی۔ تجھے سکھانے والی کی'' انہوں نے غضب ناک ہو کر اپنی مری ہوئی ماں کو بھی نہ بخشا۔ استاد نے گلا پھاڑ کر رانا کو دھتکارا۔

''اچھا' اب تو بڑھاؤ اپنا ٹٹو'' انہوں نے قدرے تامل کیا۔ ''ابے اب جاتا ہے یا کچھ لے کر جائے گا۔''

پھر کوئی آواز نہ ابھری۔ گہری خاموشی چھا گئی۔ میں اٹھا اور کھڑکی کی اوٹ سے دیکھا۔ رانا دروازے کے باہر کھڑا خوشامد کر رہا تھا۔ استاد اندر چپ بیٹھے تھے۔ کھلے دروازے سے ان کا چہرہ صاف نظر آ رہا تھا۔ اس پر جھنجھلاہٹ طاری تھی۔ ذرا دیر بعد استاد اٹھے اور دھڑ سے دروازہ بند کر دیا۔ رانا بے چارہ منہ لٹکائے دیر تک دھوپ میں کھڑا رہا مگر دروازہ نہ کھلا۔ استاد نے پلٹ کر خبر بھی نہ لی۔ رانا چلا گیا۔ اس کے بعد میں نے اسے پھر کبھی نہ دیکھا۔

لیکن اس سے زیادہ ایک اور عبرتناک منظر دیکھنے میں آیا۔ اس روز بھی استاد شیدی کسی شاگرد کو ڈانٹ پھٹکار رہے تھے اور شاگرد ڈانٹ ڈپٹ کے باوجود بار بار غلطی کر رہا تھا۔ یکایک اونچی آواز سے گالیاں بکنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے گھبرا کر باہر دیکھا۔ ایک نوجوان دروازہ کھول کر استاد کی بیٹھک سے باہر نکلا۔

یہ میرے ایک ملنے والے گوکل چند رستوگی تھے۔ لکھنو یونیورسٹی میں ایم اے کے طالب علم تھے۔ مزاج میں نفاست اور شائستگی

تھی۔ خوش طبع اور خوش وضع ہونے کے ساتھ ساتھ شعر و ادب سے بھی خاص شغف تھا۔ موسیقی کا نیا نیا شوق ہوا تھا۔ میں نے غور کیا۔ وہ اس وقت سراسیمگی کے عالم میں ادھر ادھر دیکھ رہے تھے۔ ہوش ٹھکانے نہ تھے۔ چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ گوکل چند رستوگی باہر نکلے ہی تھے کہ استاد بھی دروازے سے نمودار ہوئے۔ ان کے ہاتھ میں سارنگی بجانے کا گز تھا۔ گوکل نے استاد کو دیکھا تو چپل چھوڑ کر دھوتی سنبھالتے ہوئے سڑک پر ننگے پاؤں بھاگنا شروع کر دیا۔ استاد چیختے چلاتے پیچھے پیچھے دوڑے۔

کوئی سو سوا سو گز دوڑتے رہے۔ راہ گیر ٹھٹک کر رہ گئے۔ دکاندار دکانوں سے نکل کر باہر آ گئے۔ حیرت سے دیکھنے لگے' یاالٰہی یہ ماجرا کیا ہے۔ استاد لوٹے تو سانس پھولی ہوئی تھی۔ منہ سے باہر کف جاری تھا۔ ہاتھ میں سارنگی بجانے کا گز دبا تھا اور زبان پر گالیاں تھیں۔

ان کی اس بد دماغی سے نالاں ہو کر اکثر شاگرد چند ہی روز میں بھاگ کھڑے ہوتے۔ کسی طوائف کے یہاں بھی وہ زیادہ دن نہ ٹکے۔ ان دنوں وہ لکھنؤ کی مشہور طوائف دلربا کی ایک نوچی کو راگ راگنی سکھاتے تھے۔ ویسے وہ آئی ٹی کالج میں پڑھتی تھی۔ مگر تھی تو رنڈی کی بیوی۔ عشوہ و ادا اس کی گھٹی میں پڑا تھا۔ بلا کی شوخ تھی۔ بات بات پر اٹھکیلیاں کرتی تھی۔ ایک روز بار بار ٹوکنے پر بھی وہ برابر غلط سُر نکال رہی تھی۔

استاد سخت بھنائے ہوئے تھے۔ جل کر بولے۔ "اب کے اس طرح انترا لگایا تو سالی منہ توڑ کے رکھ دوں گا۔" مگر اس نے آستائی کے بعد پھر اسی سُر میں انترا لگایا۔ غضب یہ کیا کہ دانت نکال کر کھی کھی کرنے لگی۔ اس کی ہنسی پر استاد کے غصے کا پارہ اور چڑھ گیا۔ اس قدر برہم ہوئے کہ قریب رکھا ہوا شیشے کا گلاس اٹھا کر کھینچ مارا۔ بھوں پھٹ گئی۔ وہ گلا پھاڑ کر چیخی۔

"ہائے اماں' میں مر گئی۔"

چاروں طرف سے رنڈیاں اور ان کے اہالی موالی دوڑے۔ لڑکی کی پیشانی سے خون کا فوارہ ابل رہا تھا۔ دل ربا نے اس کا لہولہان چہرہ دیکھا تو سر پیٹ لیا۔ لیکن ڈیرے دار طوائف تھی' ہر وقت کا رئیسوں کے ساتھ سابقہ تھا' مزاج میں تحمل اور رکھ رکھاؤ تھا۔ غصہ بردباری سے ضبط کیا۔ ہاتھ جوڑ کر استاد سے صرف اس قدر کہا۔

"استاد! ہم تو باز آئے اس تعلیم سے۔ خدانخواستہ بچی کی آنکھ جاتی رہتی تو سمجھ لیجئے۔ اس کی تو ہمیشہ کے لیے قسمت پھوٹ گئی تھی۔"

استاد شیدی مطلق نے پسیجے۔ تیوری پر بل ڈال کر بولے۔ "مجھ سے تعلیم دلوانا ہے تو یہی ہوگا۔ ورنہ کسی اور کو ڈھونڈ لو۔ شہر میں

بہت گویے پڑے ہیں۔"

انہوں نے سارنگی پر غلاف چڑھایا اور بغل میں دبا کر بالا خانے سے نیچے اتر گئے۔ دوبارہ بھول کر بھی ادھر کا رخ نہ کیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ دل ربا خود منانے آئی تھی۔ مشاہرہ بھی نہایت معقول دیتی تھی مگر استاد شیدی اس قدر خفا ہوئے کہ کسی طور راضی نہ ہوئے۔ انہوں نے اسی روز عہد کر لیا کہ آئندہ کسی طوائف کو موسیقی کی تعلیم نہیں دیں گے۔ ہوا بھی یہی کہ پھر کبھی بغل میں سارنگی دبا کر شام کو چوک کی جانب جاتے نظر نہ آئے۔

استاد شیدی کی بد دماغی صرف شاگردوں ہی تک موقوف نہ تھی۔ گھر والے اور زیادہ زیر عتاب رہتے۔ ان کی تین لڑکیاں تھیں اور صرف ایک لڑکا تھا۔ لڑکے کا نام منصور علی تھا۔ سب سے بڑا بھی وہی تھا۔ گانے بجانے میں اچھا خاصا چل نکلا تھا۔ استاد کا یہ عالم تھا کہ جہاں فرصت ملی سارنگی اٹھائی اور منصور علی کو تعلیم دینا شروع کر دی۔ ذرا چوکا' استاد نے گالی دی۔ زیادہ جھنجھلائے تو ہاتھ بھی چھوڑ بیٹھے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا کہ مار پیٹ اور گالی گلوچ سے کام نہ چلا تو دالان کے کھمبے سے باندھ کر چابکوں سے منصور علی کی کھال ادھیڑ تے۔ اس وقت گھر پر دہشت طاری ہوتی۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ ٹوکے۔ مگر کوئی نہ کوئی لڑکی بھائی کی محبت میں بے قرار ہو جاتی۔ گڑگڑا کر کہتی۔ "اللہ ابا' اب بھیا کو نہ ماریے۔" استاد خونخوار نظروں سے اسے دیکھتے۔ موٹی سی گالی دے کر اسے بھی گھسیٹ کر کھمبے سے باندھ دیتے۔ اب دونوں پر مار پڑتی۔ اسی اثناء میں کسی اور لڑکی کی شامت آ جاتی۔ وہ بھی بول پڑتی۔ اس کا بھی وہی حشر ہوتا۔

استاد کے گھر کا دالان خاصا طویل تھا۔ اس کے چھ سات چوبی ستون تھے۔ کبھی کبھی یہ بھی دیکھنے میں آتا کہ منصور علی کے ساتھ ساتھ تینوں لڑکیاں بھی دالان کے کھمبوں سے بندھی ہیں اور باری باری ہر ایک کے چابکیں پڑ رہی ہیں۔ بیوی ان کی طبعاً کچھ بے حس واقع ہوئی تھیں۔ خاموش بیٹھی تماشا دیکھتی رہتیں۔ جب یہ وحشت انگیز نظارہ ناقابل برداشت ہو جاتا تو اٹھ کر پڑوس کے کسی گھر میں چلی جاتیں اور جو شامت اعمال کہیں بول پڑتیں تو وہ بھی کھمبے سے باندھ دی جاتیں۔

یہ عجب ڈرامائی منظر ہوتا۔ استاد شیدی ہاتھ میں چابک دبائے اس سرے سے اس سرے تک ٹہل رہے تھے۔ گردن ہلا ہلا کر ایک ایک کو گھور رہے ہیں۔ جس نے فریاد کے لیے زبان کھولی' سڑاک سے اس کے چابک پڑی۔ کبھی خاموش رہنے پر بھی ایک سرے سے دوسرے سرے تک سڑا سڑ چابکیں برساتے چلے جاتے۔

ایسے موقعوں پر اکثر ان کی چھوٹی بیٹی مشکل کشائی کرتی۔ جو کم سن ہونے کے باعث کم ہی زیر عتاب آتی تھی۔ وہ استاد کی نظر بچا کر باہر چلی جاتی اور استاد کے ماموں کو بلا کر لاتی۔ وہ بہت ضعیف ہو چکے تھے۔ لاٹھی ٹیکتے' کپکپاتے ہوئے آتے اور اپنے پوپلے منہ

سے ایسی ایسی بے نقط سناتے کہ استاد کے ذخیرے میں ہمیشہ کچھ نہ کچھ گالیوں کا اضافہ ہو جاتا۔

استاد دھڑا دھڑ گالیاں سنتے مگر دم نہ مارتے۔ بات یہ تھی کہ استاد شیدی کی والدہ کا انتقال ان کی کم سنی ہی میں ہو گیا تھا۔ ماموں نے انہیں پالا پوسا تھا۔ لہٰذا ان کا اس قدر احترام کرتے تھے کہ بد دماغی کے باوجود کبھی ماموں کو پلٹ کر جواب نہ دیا۔ بڑے میاں آتے تو سب اسیروں کو رہائی نصیب ہوتی۔ جب کبھی ایسا معرکہ پڑتا ماموں کی آواز سنتے ہی استاد رفو چکر ہو جاتے۔ رات کو دیر سے گھر لوٹتے۔ مگر ایسا کبھی نہیں ہوا کہ واپسی پر مٹھائی کا دونا ہاتھ میں نہ دبا ہو۔ آتے ہی بیوی کو مناتے۔ ایک ایک بچے کو جگاتے' چمکارتے اور اصرار کر کے خود اپنے ہاتھ سے ہر ایک کو مٹھائی کھلاتے۔ ان کے کردار میں ایسے ہی اور نہ جانے کتنے تضادات تھے۔

گالیاں بکنے کے معاملے میں وہ بہت پھوہڑ تھے۔ جہاں غصہ آیا' بھڑ سے گالی دے بیٹھے۔ ایک روز ایسا ہوا۔ سہ پہر کو وہ منصور علی کو موسیقی کی تعلیم دے رہے تھے۔ اس نے کوئی غلط سر نکالا۔ استاد نے حسب معمول غلیظ گالی دی۔ قریب ہی ان کی بیوی بیٹھی چھالیا کتر رہی تھی۔ انہوں نے چیں بہ جبیں ہو کر ٹوکا۔

''ذرا تو کسی کا خیال کیا کرو۔ سیانی سیانی جوان جہان لڑکیاں گھر میں موجود ہیں اور تم ہو کہ جو منہ میں آیا' دبک دیا۔ تمہاری ان گالیوں نے تو ناک میں دم کر دیا ہے۔''

استاد نادم ہونے کے بجائے ایک دم بھڑک اٹھے' بگڑ کر بولے۔ ''اچھا تو اب ہم گالی بکتے ہیں۔'' ساتھ ہی انہوں نے بیوی کے بارے میں نہایت واہیات بات کہی۔ گلا پھاڑ کر چیخے۔ ''یہ اولادیں تم جہیز میں اپنے ساتھ لائی تھیں۔'' بیوی بیچاری کو سانپ سونگھ گیا۔ پھر ان کی آواز سنائی نہ دی۔

استاد شیدی نے طوائفوں اور طوائف زادیوں کو فن موسیقی کی تعلیم دینے کا سلسلہ بند کیا تو گھر پر شاگردوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا۔ اب انہوں نے اپنا نام شیدی کے بجائے مرزا رشید علی بیگ رکھ لیا تھا۔ شاگرد پہلے انہیں استاد کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ اب مرزا صاحب کہنے لگے تھے۔ اگر بھولے سے کوئی انہیں استاد کہہ کر مخاطب کرتا تو بھڑک اٹھتے۔ کبھی کبھی تو گالیاں دینے سے بھی نہ چوکتے۔

استاد کا بیشتر وقت گھر ہی پر گزرتا تھا۔ سویرے ہی سویرے سارنگی لے کر بیٹھ جاتے اور رات گئے تک راگ راگنیوں کا سلسلہ جاری رہتا۔ ان دنوں ان میں ایک نیا مرض یہ پیدا ہو گیا تھا کہ فن موسیقی پر لیکچر دیتے دیتے بات بات پر لیکچر دینے لگتے۔ معلوم نہیں ان کے سر میں یہ خناس کیسے سمایا اور کیوں سمایا۔ بہر حال اس نئی عادت کی مشق ستم عام طور پر بے چاری بیوی بنتی۔ وہ سیدھی سادی گھریلو عورت تھی۔ استاد تھے کہ موسیقی کے بارہ ٹھاٹھ بیان کرتے کرتے ہر موضوع پر بحث شروع کر دیتے۔ اکثر رات کو سناٹے میں

استاد کی پاٹ دار آواز سنائی دیتی۔ وہ اس وقت کسی مسئلے پر لیکچر دینے میں ہمہ تن مصروف ہوتے۔ یہ لیکچر ذرا ذرا سی گھریلو باتوں سے شروع ہوتے اور رفتہ رفتہ ان کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہو جاتا۔

یہ بھی عجیب اتفاق تھا کہ لیکچر دینے کا یہ مذاق انہیں راس آ گیا۔ یعنی وہ میوزک کالج میں باقاعدہ لیکچرار مقرر ہو گئے۔ اس اعزاز سے استاد کی وضع قطع میں تو کوئی فرق پیدا نہ ہوا۔ البتہ یہ انقلاب ضرور رونما ہوا کہ ان کے دروازے پر ایک تختی آویزاں ہو گئی۔ جس پر انگریزی کے موٹے موٹے حروف میں لکھا تھا۔ ''پروفیسر مرزا شیدا علی بیگ'' حالانکہ استاد انگریزی زبان سے قطعی نا آشنا تھے مگر اب وہ پروفیسر کہلانے پر نہ صرف فخر محسوس کرتے تھے بلکہ سختی سے اصرار بھی کرتے تھے۔ دو چار بار کی ڈانٹ ڈپٹ کے بعد گھر پر آنے والے شاگردوں نے انہیں پروفیسر کہنا شروع کر دیا تھا۔

انہوں نے اپنی برادری کے کشمیری بھانڈوں سے بھی تقریباً ملنا جلنا ترک کر دیا تھا۔ عزیز داری اور قرابت داری کی ناجائز اولاد کی طرح پردہ پوشی کرتے تھے۔ لیکن انہوں نے محلہ نہ چھوڑا۔ اس کا سب سے بڑا سبب مکان تھا جو بقول ان کے بزرگوں کی یادگار تھا۔ اس بوسیدہ اور کھنڈر نما مکان کی وہ آئے دن مرمت کراتے رہتے۔ اس مرمت کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کا مکان محلے میں خاصا نمایاں نظر آنے لگا۔

آمدنی معقول تھی۔ مزے سے گزر بسر ہو رہی تھی۔ مگر اب وہ اور بھی زیادہ وزنی گالیاں بکنے لگے تھے۔ شاگردوں کو بات بات پر کتوں کی طرح دھتکارتے اور شاگرد تھے کہ دم سادھے بیٹھے رہتے' چوں تک نہ کرتے۔ ان میں بعض ایسے بھی تھے جن سے میرے مراسم تھے۔ پوچھا' بھائی یہ استاد شیدی میں کیا سرخاب کا پر لگا ہے کہ فیس بھی تگڑی دیتے ہو اور دھڑا دھڑ گالیاں بھی کھاتے ہو۔ کسی اور استاد سے موسیقی کی تعلیم کیوں نہیں حاصل کرتے؟ کم و بیش سب کا ایک ہی جواب ہوتا اور وہ یہ ہوتا کہ جس طرح سارنگی بجانے میں دور دور تک استاد شیدی کا جواب نہ تھا اسی طرح وہ راگ داری کی ایک ایک رگ اور ایک ایک ریشے سے واقف تھے۔ فن موسیقی کے تمام اسرار و رموز ان پر منکشف تھے۔ اس قدر مہارت رکھتے تھے کہ بتانے پر آتے تو یہ تک بتا دیتے کہ فلاں راگ کا موجد کون تھا۔ کب نکلا' کیسے نکلا اور اب تک اس میں کیا کیا تبدیلیاں رونما ہوئیں۔

انہی دنوں کا ذکر ہے۔ راجہ بانگی پور نے اپنی قیصر باغ کی کوٹھی میں ایک تقریب منعقد کی۔ رقص و موسیقی کا بھی اہتمام کیا گیا تھا۔ دور دور سے طوائفیں آئی تھیں۔ کلاونت' موسیقار اور گویے بھی تھے۔ استاد شیدی کو بھی بلایا گیا۔ ہر چند کہ اب وہ موسیقی کی محفلوں اور مجروں میں بہت کم شرکت کرتے تھے مگر منصور علی کے اصرار پر چلے گئے۔ راجہ صاحب نے نہایت دھوم دھام سے جشن کا انتظام کیا

تھا۔ رات بھر راگ رنگ کی محفل گرم رہی۔

سراور سنگیت کے وہ وہ روپ دیکھنے میں آئے کہ اہل ذوق دل تھام کر رہ گئے۔ مگر استاد شیدی کے ساتھ ایک حادثہ پیش آ گیا۔ ہوا یہ کہ رات کے کوئی گیارہ بجے بدر منیر نے ایک دادرا گایا۔ بدر منیر کے عروج کا زمانہ تھا۔ قبول صورت طوائف تھی۔ کھلتا ہوا چمپئی رنگ' تیکھے نقش و نگار' سرو قد' آنکھوں میں جگمگ کرتے ستاروں کی کہکشاں۔ اس نے دادرا چھیڑا تو محفل میں شعلے بھڑک اٹھے۔ بولے تھے:

اندھریا ہے رات سجن رہیو کہ جیو

آدھی رات کا وقت تھا' اودھ کے تعلق داروں کی محفل' بدر منیر نے کھڑے ہو کر نرت کے ساتھ دادرے کے بول ادا کئے تو وہ معجون شباب آور کا کام کر گیا۔ چہار سمت سے واواہ سبحان اللہ ہونے لگی۔ روپوں کی بارش شروع ہو گئی۔ محفل میں راجہ صاحب اجے گڑھ بھی موجود تھے۔ اس زمانے میں بدر منیر ان کے پاس تھی۔ انہوں نے دونوں ہاتھوں سے روپے نچھاور کئے۔

بدر منیر نے نرت ادا کرنے میں بانکی چتونوں کی ایک ایک گھات' بدن کا ہر پیچ و خم' روپ کی ہر چھب داؤں پر لگا دی۔ اہل محفل بے قرار ہو کر بار بار پہلو بدلتے۔ بار بار راجہ اجے گڑھ کو چھیڑتے اور وہ بڑے فخر سے مسکرا مسکرا کر دیکھتے اور آنکھوں ہی آنکھوں میں بدر منیر سے راز و نیاز کرتے۔ غرضیکہ اس نے بزم طرب کو تلپٹ کر دیا۔

بدر منیر کا مجرا ختم ہوا تو محفل کا رنگ ایسا بدلا کہ چراغوں میں روشنی نہ رہی۔ اس کے رخصت ہوتے ہی استاد شیدی اپنی سارنگی سنبھالے ہوئے نمودار ہوئے۔ وہ حسب معمول ڈھیلی ڈھالی اچکن پر دوپلی ٹوپی لگائے تھے۔ ان کی وضع قطع اور شکل و صورت دیکھ کر بعض من چلے بھڑکے' مگر آداب مجلس کے پیش نظر صرف مسکرا کر رہ گئے۔ کسی کو پھبتی کسنے کی جرات نہ ہوئی۔

استاد نے سارنگی پر راگ ایمن کلیان چھیڑا اور دھیرے دھیرے آستائی میں چلے' مگر محفل کا مطالبہ کچھ اور تھا۔ استاد کو اس کا اندازہ نہ تھا۔ وہ طبلے کی سنگت کے ساتھ مدھم سروں میں سارنگی بجاتے رہے۔ کچھ دیر سکوت طاری رہا' پھر سامعین کی دلچسپی بھٹکنے لگی۔ محفل پر اکتاہٹ اور بیزاری چھانے لگی۔ سر جوالا پرشاد سریواستوا بھی موجود تھے۔ غالباً مہمان خصوصی تھے۔ تقریب میں شرکت کے لیے خاص طور پر کانپور سے آئے تھے۔ ان سے ضبط نہ ہو سکا۔ زیر لب مسکرا کر بولے۔

"استاد جی! یہ کیا روں روں لگا رکھی ہے۔ اپنے فن کی کچھ بانڈگی دکھایئے۔"

استاد شیدی محفل کے رنگ ڈھنگ سے پہلے ہی بیزار تھے۔ سر جے پی سریواستوا کے ٹوکنے پر ان کے تن بدن میں آگ ہی تو لگ گئی۔ فوراً ہاتھ روک لیا۔ پلٹ کر طبلچی کی جانب دیکھا۔ ڈپٹ کر بولے۔ "روک بے ہاتھ۔" طبلچی نے گھبرا کر ہاتھ کھینچ لیا۔ انہوں نے

خاموشی سے قریب رکھا ہوا غلاف اٹھایا اور سارنگی پر چڑھانے لگے۔ سر جے پی سریواستوا کو فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ نرم لہجے میں گویا ہوا ''معلوم ہوتا ہے استاذ آپ میری بات کا برا مان گئے۔ میں نے تو آپ سے ایک درخواست کی تھی۔'' وہ کھل کر مسکرائے۔
''اب تو آپ کو کچھ سنا کر ہی جانا ہوگا۔'' راجہ بانگی پور نے بھی ان کی ہاں میں ہاں ملائی۔

استاد نے جل کر کہا۔ ''اجی سنانے والے کی تو۔۔۔۔۔۔۔'' انہوں نے بھر سے گالی دی۔ بدستور سارنگی کو غلاف میں لپیٹتے رہے۔ ''آپ نے مجھے کوئی میراثی سمجھا ہے۔ برسوں خون پانی کر کے ریاض کیا ہے۔ رنڈیوں کے در پر جوتیاں سیدھی نہیں کی ہیں۔ واہ صاحب واہ کیا قدردانی کی ہے۔ مجھے کیا خبر تھی کہ سالے ایسے بدذوقوں سے سابقہ پڑے گا۔'' انہوں نے سارنگی بغل میں دبائی اور اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

محفل پر سناٹا چھا گیا۔ سر جوالا پرشاد ان دنوں وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے رکن تھے۔ بالفاظ دیگر مرکزی وزیر کے منصب پر فائز تھے۔ خدشہ پیدا ہوا کہ استاد اگر جوتے مار کر محفل سے نکالے نہ گئے تو کم از کم جیل کی ہوا ضرور کھانا پڑے گی۔ انہوں نے بھری محفل میں سر جے پی سریواستوا کی بے عزتی کی تھی۔ لیکن استاد بڑی بے نیازی سے آگے بڑھے اور ایک شان استغنا کے ساتھ محفل سے چلے گئے۔

سر جوالا پرشاد ذات کے کائستھ تھے۔ آداب مجلس کے ساتھ مزاج میں رکھ رکھاؤ اور بردباری بھی تھی۔ فن کے قدردان بھی تھے۔ استاد شیدی کی جلی کٹی سن کر بھی ان کی پیشانی پر شکن نہ آئی۔ بدستور مسکراتے رہے۔ راجہ صاحب بانگی پور کو اشارہ کیا۔ وہ اٹھے اور کسی نہ کسی طرح استاد کو منا کر محفل میں واپس لائے۔

اس دفعہ استاد نے بہار کا خیال چھیڑا اور کئی گھنٹے تک سارنگی پر اپنے فن کا مظاہرہ کرتے رہے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ استاد کا یہ عالم تھا کہ آنکھیں بند تھیں۔ جسم پتھر کی مانند ایک جگہ جم کر رہ گیا تھا۔ صرف ہاتھ چل رہا تھا اور سارنگی سے سنگیت کی بارش ہو رہی تھی۔ پھاگن کی مدھ ماتی رات تھی۔ ہوا میں پھولوں کی مہک رچی تھی۔ ہر طرف چاندنی چٹکی تھی۔ بہار کی آمد آمد تھی۔ کچھ تو موسم کا اثر تھا اور کچھ یہ بھی تھا کہ استاد چوٹ کھا کر اپنے فن کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ انہوں نے دادرے کی تندی ٹھمرے کے نشے کی طرح اتار کر رکھ دی۔ وہ رنگ جمایا کہ بہار کی کیفیت طاری ہو گئی۔ رات ڈھلتی گئی۔ استاد کا ہاتھ سارنگی پر چلتا رہا۔ سماں بندھ گیا۔ کلیاں چٹکنے لگیں۔ پھولوں کے تختے مہکنے لگے۔ چاندنی کی رنگت نکھر گئی۔ ہوا میں جھرنوں کی پائل بجنے لگی۔ محفل پر سکوت طاری ہو گیا۔ ہر شخص مبہوت تھا۔ بے خود تھا۔

استاد نے ہاتھ روکا تو وہ اکڑ کر رہ گیا تھا۔ واللہ عالم یہ واقعہ کہاں تک درست ہے۔ میں تو اس محفل میں شریک نہ تھا۔ البتہ اتنا ضرور دیکھا کہ استاد شیدی نے شاگردوں کو کچھ عرصے کے لیے موسیقی کی تعلیم دینا بند کر دی تھی۔ ان کا دایاں ہاتھ سفید پٹی میں جھولتا رہا۔ روزانہ سویرے سویرے ایک مالشیا آتا اور ان کے ہاتھ کی دیر تک مالش کرتا رہتا۔

اس بات کو زمانہ ہو گیا۔ زندگی میں بہت سے تغیرات رونما ہوئے۔ استاد شیدی میں بھی تغیر پیدا ہوا۔ اس کا انکشاف بالکل اچانک ہوا۔ ایک روز ایسا ہوا کہ وہ اپنا ایک ٹیلیگرام پڑھوانے میرے پاس آئے۔ جب ان کے شاگرد موجود نہ ہوتے تو وہ اس قسم کی خدمات اکثر مجھ سے لیا کرتے تھے۔ اس وقت میرے ایک دوست بھی موجود تھے۔ میں نے استاد کا ان سے تعارف کراتے ہوئے کہا۔

''آپ سے ملیے' آپ استاد شیدی ہیں۔ میوزک کالج میں موسیقی کی تعلیم دیتے ہیں۔ سارنگی بجانے میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔''

میں نے تعارف کرانے میں حتی الوسع یہ کوشش کی تھی کہ منہ سے کوئی ایسی بات نہ نکلے کہ استاد کی طبع نازک پر گراں گزرے۔ مگر غلطی سرزد ہو گئی۔ اس کا اندازہ مجھے استاد کی آنکھوں میں اڈتی ہوئی جھنجھلاہٹ سے ہوا۔ انہوں نے تیوری پر بل ڈال کر مجھے قہر آلود نظروں سے کچھ اس طرح دیکھا کہ اگر کوئی شاگرد ہوتا تو منہ پر زناٹے کا وہ ہاتھ پڑتا کہ دن میں تارے نظر آ جاتے۔ میں چونکہ ان کے شاگرد ہونے کی سعادت سے محروم تھا لہٰذا انہوں نے صرف نگاہ عتاب پر اکتفا کیا۔ میرے دوست کو مخاطب کرتے ہوئے غلطی کی اس طرح اصلاح کی۔

''جناب! اس ناچیز کو پرنس مرزا شیدا علی گورگانی کہتے ہیں۔ میوزک کالج میں پروفیسر ہوں۔ موسیقی کی تعلیم دیتا ہوں' مگر یہ میرا خاندانی پیشہ نہیں۔''

اس کے بعد استاد نے اپنا شجرہ نسب بیان کرنا شروع کیا تو دودمان مغلیہ سے اپنا رشتہ ملا دیا۔ دیر تک اس بات پر زور دیتے رہے کہ وہ آل سے ہیں اور کھرے مغل ہیں۔ موسیقی جو عام طور پر ان کی گفتگو کا موضوع ہوتی تھی' اس کے بارے میں انہوں نے ایک لفظ نہ کہا۔

استاد رخصت ہوئے تو میں حیرت زدہ رہ گیا۔ سوچتا رہا کہ اس دفعہ استاد نے بڑی اونچی زغند لگائی۔ آج تک انہوں نے اشارتاً اپنے آل تیمور ہونے کا اظہار نہ کیا تھا۔ یہ اچانک ان پر اپنے مغل شہزادے ہونے کا انکشاف کیسے ہوا؟ تحقیقات کرنے پر پتہ چلا کہ یہ دور کی کوڑی استاد کے فرزند ارجمند' منصور علی ڈھونڈ کر لائے تھے۔ وہ بھی خیر سے اب ٹیوشن کے دھندے پر لگ گئے تھے۔ ان دنوں کی کی عوضی پر میوزک کالج میں موسیقی کی تعلیم بھی دے رہے تھے۔

حقیقت حال کچھ اس طرح سننے میں آئی کہ کالج میں ایک روز کسی گویے نے منصور علی کو بھانڈ کہہ کر طعنہ دیا اور خود کو نواب واجد علی شاہ کا پڑپوتا بتایا۔ اس وقت بات تو تکرار تک پہنچ کر ختم ہوگئی۔ مگر منصور علی نے اس مسئلے پر سنجیدگی سے سوچنا شروع کردیا۔ پھر وہ دن بھی آیا کہ منصور اس گویے سے سبقت لے گیا۔ ایک ڈگری اور اونچا گیا یعنی مغل شہزادہ بن گیا۔

استاد نے بیٹے کی ہرزہ سرائی نہ صرف قبول کرلی بلکہ اسے عملی جامہ پہنانے کے لیے باقاعدہ تبلیغ بھی شروع کردی۔ ان کے مکان کی تختی بھی بدل گئی۔ نئی تختی پر لکھا تھا۔ ''پرنس مرزا شیدا علی بیگ گورگانی'' مگر اتنی بڑی تبدیلی کو کشمیری بھانڈوں نے قبول کرنے سے انکار کردیا۔ استاد کو نیچا دکھانے کے لیے طرح طرح کے حربے آزمائے جانے لگے۔ ان کے خلاف بھانڈوں اور ڈھپالیوں کا باقاعدہ محاذ قائم ہوگیا۔ اس محاذ میں محلے کے ایسے لوگ بھی شامل ہوگئے جو بھانڈوں کی برادری سے تعلق نہ رکھتے تھے۔

جن دنوں یہ کشمکش زوروں پر تھی' میں لکھنو سے ہجرت کرکے کراچی آ گیا اور زندگی کے جھمیلوں میں ایسا پھنسا کہ آج تک لکھنو جانا نصیب نہ ہوا۔ موسیقی سے مجھے کبھی نہ زیادہ لگاؤ تھا اور نہ اب ہے۔ چنانچہ استاد شیدی بھی کبھی یاد نہ آئے۔

کئی سال قبل کا ذکر ہے۔ میں ایک عزیز سے ملنے ملیر گیا۔ واپسی پر بس کے انتظار میں اسٹینڈ پر کھڑا تھا کہ کسی نے قریب آ کر خالص لکھنوی انداز میں جھک کر سلام کیا۔ سورج ڈوب چکا تھا۔ جھٹپٹے میں اس شخص کا چہرہ نہ دیکھ سکا۔ البتہ اتنا خیال ضرور آیا کہ اسے کہیں دیکھا ہے۔ کہاں دیکھا ہے اور کب دیکھا ہے' یہ مطلق یاد نہ آیا۔ اسی اثناء میں اس نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

''نہیں پہچانا؟'' اس نے آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔ ''ہاں بھئی غریبوں کو کون پہچانتا ہے۔ یہ تو سالی اس سرزمین کی خاصیت ہے۔''

میں نے فوراً پہچان لیا۔ وہ استاد شیدی تھے۔ ابھی خیر و عافیت دریافت کرنے کا سلسلہ جاری تھا کہ بس آ گئی میں آگے بڑھا اور جھپاک سے بس میں سوار ہوگیا۔ اس وقت تھا بھی عجلت میں۔ استاد سے یہ پوچھنے کا موقع نہ ملا کہ ان کا قیام کہاں ہے۔ اور کب تک کراچی میں ٹھہرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ عارضی طور پر آئے ہیں یا مستقل سکونت اختیار کرلی؟

لیکن اس سرسری ملاقات سے میں نے یہ اندازہ ضرور لگا لیا کہ ان کی حالت بہت پتلی تھی۔ اچکن بھی میلی کچیلی پہنے ہوئے تھے۔ چہرہ بجھا بجھا تھا۔ آواز میں بھی وہ کرارہ پن نہ تھا جسے سن کر سینکڑوں کے ہجوم میں انہیں پہچانا جا سکتا تھا۔

لگ بھگ ہفتے بھر بعد ان سے پھر سرراہے مڈبھیڑ ہوگئی۔ اس دفعہ خاصی تفصیلی ملاقات رہی۔ باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ کراچی آئے ہوئے سات آٹھ ماہ کا عرصہ ہو چکا ہے۔ دونوں بیٹیوں کی شادی انہوں نے لکھنو ہی میں کردی تھی۔ بیوی کے علاوہ

صرف چھوٹی بیٹی کراچی میں ان کے ساتھ تھی۔

میوزک کالج کی ملازمت ہندو پرنسپل کی جن سنگھی ذہنیت کے باعث جاتی رہی تھی۔ بات صرف اتنی تھی کہ ہولی کے تہوار پر پرنسپل نے کالج کے تمام اساتذہ کو اپنے گھر پر مدعو کیا تھا۔ استاد شیدی نے ٹالنا چاہا' عذر بھی پیش کیا۔ مگر اس نے ایک نہ سنی۔ سر ہو گیا۔ مجبوراً استاد شیدی کو بھی دوسرے اساتذہ کے ساتھ جانا پڑا۔

پرنسپل کی کوٹھی پر پہنچے۔ دیکھا وہاں ہاؤ ہو کا بازار گرم ہے۔ ہر طرف رنگ کی پچکاریاں چلتی تھیں۔ ابیر اور گلال اڑتا تھا۔ ہولیارے بھنگ اور دارو چڑھائے رنگ کھیلتے تھے۔ مجیرے بجاتے تھے۔ ڈھولک کی تھاپ پر لہک کر گاتے تھے۔

کہے سنے کا برا نہ مانو آج ہماری ہولی ہے
رنگ ابیر لے لے کر آئی ہماری ٹولی ہے
ہولی ہے بھئی ہولی ہے ہولی ہے بھئی ہولی ہے

استاد شیدی نے یہ رنگ ڈھنگ دیکھا تو بہت چکرائے۔ اسی اثنا میں پرنسپل ایک طرف سے نمودار ہوا۔ عالم یہ تھا کہ نشے سے جھومتا تھا۔ آنکھیں چڑھی تھیں۔ چہرے پر لال لال گلال ملا تھا۔ طرح طرح کے رنگوں سے لباس شرابور تھا۔ ہاتھ میں رنگ بھری پچکاری تھی۔

اس نے رنگ ڈالنے کے لیے پچکاری اٹھائی۔ استاد نے ہاتھ جوڑ کر معذرت چاہی۔ ''حضور! مجھے تو معاف ہی رکھئے۔ میں ہولی کھیل کر خود کو جہنمی نہیں بنانا چاہتا۔''

پرنسپل ٹھٹھا مار کر ہنسا۔ بے نیازی سے بولا۔ ''اماں چھوڑو استاد' کیا رکھا ہے اس نرک اور سورگ کے چکر میں۔''

استاد سیدھے سچے مسلمان تھے۔ مصلحت اندیشی کے گر سے ناواقف تھے۔ منہ پھٹ بھی تھے۔ بگڑ کر بولے۔ ''واہ صاحب' یہ بھی خوب رہی۔ آپ کو کیا پتہ جسم پر جہاں جہاں ہولی کا رنگ پڑے گا وہ حصہ جہنم کی آگ میں جلے گا۔ مجھے تو اس شیطانی چرخے سے باز ہی رکھئے۔ میں ہرگز ہرگز رنگ نہیں ڈلواؤں گا۔''

ان کے اس رویے سے پرنسپل کے مذہبی جذبات کو شدید ٹھیس پہنچی۔ تلملا کر رہ گیا' مگر خاموش رہا۔ بعد میں استاد شیدی کے خلاف اس نے درپردہ کاٹ پیچ شروع کر دی۔ آخر ایک دن ایسا بھی آیا کہ انہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کالج کو خیرباد کہنا پڑا۔

ملازمت سے علیحدگی کے باوجود ان کے حالات برے نہ تھے۔ شاگرد حسب معمول آتے رہے۔ استاد انہیں فن موسیقی کی تعلیم

دیتے رہے۔ کسی نہ کسی طرح گزر بسر ہو رہی تھی۔ مگر فرقہ وارانہ فسادات کا خطرہ ہر وقت سر پر منڈلاتا رہتا۔ آئے دن طرح طرح کی وحشت ناک افواہیں سننے میں آتیں۔ مسلمان کچھ فسادات کے ڈر سے اور کچھ معاشی پریشانیوں کے باعث دھڑا دھڑ پاکستان جا رہے تھے۔ ایک روز منصور علی بھی پاکستان چلا گیا۔ اس کی تحریک پر استاد شیدی بھی پاکستان آ گئے۔

میں نے پوچھا۔ ''منصور کہاں ہے؟''

جل کر بولے۔ ''آج کل ملتان میں ہے' اس نے قوالوں کی چوکی بنالی ہے۔''

''قوالوں کی چوکی'' میں نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔

اس دفعہ وہ مسکرائے۔ ''آخر کچھ نہ کچھ تو پیٹ پالنے کا دھندا کرتا۔ یہاں گانے بجانے کی بھائی کون قدر کرتا ہے۔''

''اور آپ؟'' میں غیر ارادی طور پر پوچھ بیٹھا۔

یکا یک پرانے استاد شیدی جاگ اٹھے۔ انہوں نے ایک عدد سڑی ہوئی گالی دی۔ جھنجلا کر بولے۔ ''اجی قوالی بھی کوئی راگ یا سنگیت ہے۔ لاحول ولا قوۃ! منصور میرے سر بہت ہوا۔ میں نے کہا' ابے بیدھا ہوا ہے۔ گھاس تو نہیں کھا گیا۔ اب میں تالیاں بجا پٹخار کر اور گلا پھاڑ پھاڑ کر الٹی سیدھی تانیں لگاؤں گا' قوالی گاؤں گا۔ ذرا غور تو کیجیے۔ زندگی بھر کا ریاض چند ٹکوں کی خاطر قربان کر دوں۔ واہ صاحب' یہ بھی ایک رہی۔''

وہ دیر تک ایسی ہی باتیں کرتے رہے۔ مگر ان کی حالت بہت خستہ تھی۔ اچکن بوسیدہ ہو کر جگہ جگہ سے مسک گئی تھی۔ پاجامے پر گھٹنے کے پاس پیوند لگا تھا۔ چہرہ جھلس کر زیادہ سیاہ اور بدوضع ہو گیا تھا۔ دوبارہ ملنے کا وعدہ کر کے وہ رخصت ہو گئے۔

چند روز گزرے تھے کہ میرے دفتر آئے۔ تھوڑی دیر ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد انہوں نے ریڈیو پاکستان کے ایک بڑے افسر کا نام لیا۔ پوچھا۔ ''آپ کی ان سے کچھ یاد اللہ ہے۔ ریڈیو سے لگ جاؤں تو دال روٹی کا سیتا ہو جائے گا۔''

میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے اپنی مجبوری کا اظہار کیا۔ ''میری تو ان سے کوئی شناسائی نہیں۔ کبھی ملنے کا بھی اتفاق نہیں ہوا۔''

میرا جواب سن کر ان کا چہرہ اتر گیا۔ نہ جانے وہ میرے پاس کتنی توقعات لے کر آئے تھے۔ دل گرفتہ ہو کر بولے۔ ''یہاں بھی قسمت جل دے گئی۔ سوچا تھا' شاید آپ کے وسیلے سے ان تک رسائی ہو جائے۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ بغیر سفارش کے یہاں کوئی گھاس نہیں ڈالتا۔''

ان کی باتیں سن کر میں نے غور کیا۔ استاد شیدی کو زندگی برتنے کا اب تک گر نہ آیا۔ وہ ہمیشہ اپنے فن کی گہرائیوں میں اس قدر ڈوبے رہے کہ کبھی جھانک کر بھی زندگی کو سمجھنے اور پرکھنے کی کوشش نہ کی۔ میری سفید پوشی سے خواہ مخواہ مرعوب ہو گئے۔ یہ بھی نہ سوچا کہ سفارش ایک ہاتھ سے دینے اور دوسرے ہاتھ سے وصول کرنے کا کاروبار ہے اور اس لین دین کے کاروبار میں کسی طور پر فریق بننے کی اہلیت نہ رکھتا تھا۔

یہ محض اتفاق تھا کہ ریڈیو پاکستان کے ایک پروڈیوسر سے ایک محفل میں ملاقات ہو گئی۔ ان سے کچھ صاحب سلامت بھی تھی۔ میں نے ان سے استاد شیدی کا تذکرہ کیا۔ انہوں نے حتی الوسع مدد کرنے کا وعدہ بھی کیا۔ کچھ عرصے بعد استاد شیدی میرے پاس آئے تو فوراً ان کے پاس بھیجا۔ استاد ان سے مل کر آئے تو کسی قدر مطمئن نظر آتے تھے۔

میں نے دریافت کیا۔ ''کہئے استاد کچھ کام بنا؟''

مسکرا کر بولے۔ ''پرسوں آڈیشن کے لیے بلایا ہے۔'' انہوں نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ''وقت جو کچھ نہ دکھائے تھوڑا ہے۔ ایک زمانہ ایسا تھا کہ میں میوزک کالج میں پروفیسر تھا۔ راگ راگنیاں سکھاتا تھا' پڑھاتا تھا' امتحان لیتا تھا۔ کیا خبر تھی کہ تقدیر یہ دن بھی دکھائے گی کہ مجھے بھی مبتدیوں کی طرح امتحان دینا پڑے گا۔'' استاد شیدی نے قدرے توقف کیا۔ ''آڈیشن ایک طرح کا امتحان ہی ہو تو ہوتا ہے نا؟''

میں نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔ ''تو پھر کیا ارادہ ہے؟''

بجھے ہوئے لہجے میں بولے۔ ''جاؤں گا' جھک مار کر جاؤں گا۔ پیٹ پالنے کی شاید کوئی صورت نکل آئے۔ کسی نے سچ کہا ہے۔ ہم پہ ایسی پڑے گی ہمیں معلوم نہ تھا۔''

استاد چلے گئے' چند روز بعد دفتر آئے تو منہ لٹکا ہوا تھا۔ میرا ماتھا ٹھنکا کہ کام نہیں بنا۔ خدشہ غلط نہ نکلا۔ دریافت کیا۔ ''استاد آڈیشن کا کیا نتیجہ نکلا؟''

کہنے لگے۔ ''پروڈیوسر صاحب اس دفعہ بھی تپاک سے ملے۔ آڈیشن کے لیے اسٹوڈیو میں لے گئے۔ ایک گانے والی وہاں پہلے ہی موجود تھی۔ خوب بن ٹھن کر آئی تھی۔ سن بھی زیادہ نہ تھا۔ صورت شکل بھی اچھی تھی۔ اسے ایک ٹھمری گانا تھی اور مجھے سارنگی پر اس کے ساتھ سنگت دینا تھی۔ آڈیشن شروع ہوا۔ اس نے ٹھمری چھیڑی۔ نہایت بے سری گانے والی تھی۔ سر تال کا کچھ پتہ نہ تھا۔ بس صورت ہی صورت تھی۔''

''تب تو آپ کے لیے مشکل پیدا ہوئی ہوگی۔'' میں نے اپنے فوری ردعمل کا اظہار کیا۔ بولے۔ ''اجی میرے لیے کیا مشکل پیدا ہوتی۔ زندگی میں ایسی بے سری گانے والیوں سے پہلے بھی سابقہ پڑ چکا ہے۔ مگر اس آڈیشن میں ایک ایسی واردات پیش آئی کہ میں آپ سے کیا عرض کروں۔''

میں نے بے چین ہو کر دریافت کیا۔ ''وہ کیا؟''

''ٹھمری کے بارے میں تو آپ کو بھی معلوم ہوگا کہ اس میں گوپیوں کے ساتھ کرشن کنھیا کی چھیڑ چھاڑ کا ذکر ہوتا ہے۔''

مجھے ٹھمری کے متعلق کچھ پتہ نہیں کہ کیا ہوتی ہے اور کیسے گائی جاتی ہے۔ مگر میں خاموش رہا۔ استاد بتاتے رہے۔ ''یہ مشہور ٹھمری تو آپ نے ضرور سنی ہوگی۔ ''بیاں مرورو شام مراری'' لیکن صاحب' اس گانے والی نے تو کمال ہی کر دیا۔ اس نے ٹھمری کا جو بول چھیڑا' وہ یہ تھا۔ ''بیاں نے مرور عبدالباری'' میں اسے سن کر چونکا۔ سوچا' شاید میری سماعت میں کچھ خلل پڑ گیا ہے۔ انگلی ڈال کر کان کریدا۔ مگر وہ برابر عبدالباری' عبدالباری کی رٹ لگا رہی تھی۔''

حیرت زدہ ہو کر میں نے پوچھا۔ ''استاد' واقعی ایسا ہوا؟''

''اجی' میں کوئی جھوٹ بول رہا ہوں۔ آپ کے سر عزیز کی قسم' بالکل یہی ہوا۔'' استاد نے مجھے یقین دلایا۔ ''بار بار شام مراری کی بجائے عبدالباری سنا تو میں بہت چکرایا۔ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے۔ پروڈیوسر صاحب سے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ ''حضور' یہ عبدالباری کون بزرگوار ہیں؟ جانتے ہیں آپ' انہوں نے کیا جواب دیا؟ ہنس کر بولے۔ ''دیکھئے استاد' پاکستان اسلامی ملک ہے' یہاں ہندوؤں کا شام مراری نہیں چل سکتا۔ یہاں تو ٹھمری میں عبدالباری ہی چلے گا۔ شام مراری کو اب بھول جایئے۔''

''آپ نے یہ سن کر کیا جواب دیا؟''

''جواب کیا دیتا' خاموشی سے سارنگی پر غلاف چڑھایا۔ ہاتھ باندھ کر پروڈیوسر صاحب سے عرض کیا۔ سرکار' میں آپ کے عبدالباری کے ساتھ نہیں چل سکتا۔ اٹھا اور اسٹوڈیو سے باہر آ گیا۔'' استاد شیدی کا لہجہ اچانک تیکھا ہو گیا۔ ''ارے صاحب' کیا ہم مسلمان نہیں ہیں مگر راگ تو راگ ہی ہوتا ہے۔ اودھ کے بادشاہ' جان عالم واجد علی شاہ بھی تو مسلمان ہی تھے۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے' انہوں نے دس بیس نہیں سینکڑوں ہی ٹھمریاں کہی ہیں۔ بڑے ذوق وشوق سے ٹھمری سنتے بھی تھے اور انعام واکرام دے کر قدر افزائی فرماتے تھے۔''

استاد نے قدرے تامل کیا۔

''ذرا غور تو کیجیے' ٹھمری ایسے مشہور اور مقبول راگ کو اس طرح مشرف بہ اسلام کیا کہ سالے کا بالکل حلیہ ہی بگاڑ دیا۔ واللہ' ایسا خون کھولا کہ جی چاہا اپنا سر پھوڑ لوں۔ بھئی واہ واہ' کیا سنگیت کی درگت بنائی۔ ایسی کی تیسی کر کے رکھ دی۔ ٹھمری کی ماں ۔۔۔۔۔۔''
انہوں نے بھڑ سے گالی دی۔

وہ جھنجلاہٹ میں ابھی نہ جانے اور کیا کیا کہتے۔ میں نے فوراً مداخلت کی۔ ''استاد یہ تو بہت برا ہوا'' دبی زبان سے احتجاج بھی کیا۔ ''مصلحت کا تقاضا تو یہ ہے کہ آپ کو اس طرح اٹھ کر آنا نہیں چاہیے تھا۔''

''اجی چھوڑیئے' ان باتوں میں کیا رکھا ہے۔ کیسی مصلحت اور کہاں کی مصلحت'' استاد شیدی ایک دم بھڑک اٹھے۔ ''تف ہے' ایسی روزی پر' میں تو اب وہاں کھڑے ہو کر پیشاب بھی کرنے کا نہیں۔''

میں نے انہیں اس قدر طیش کے عالم میں دیکھا تو بات کا رخ پلٹتے ہوئے کہا۔ ''منصور کا کیا حال احوال ہے؟''

''اس کا خط آیا ہے' وہ بھی آج کل پریشان ہے۔ لکھا ہے کہ گلا خراب ہو گیا۔ کسی نے پان میں سیندور کھلا دیا۔'' دفعتاً ان کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ ''اجی سیندور ویندور کسی نے کیا کھلایا ہو گا' سالے نے قوالیاں گا گا کر اپنی آواز کا ستیاناس کر لیا۔''

میں خاموش رہا۔ استاد نے مزید بات چیت نہ کی۔ وہ چلے گئے۔ مگر تھوڑی ہی دیر بعد واپس آ گئے۔ مجھے ایک طرف لے گئے۔ چند لمحے چپ چاپ کھڑے رہے پھر ہچکچاتے ہوئے بولے۔ ''کچھ روپے ہوں گے آپ کے پاس؟ بخدا دو روز سے گھر میں فاقہ ہے۔'' یہ بتا کر وہ اس طرح سہمے ہوئے نظر آئے جیسے چوری کرتے ہوئے پکڑے گئے ہوں۔''

میرے پاس اس وقت صرف ایک روپیہ تھا۔ دو روپے دفتر کے ایک رفیق کار سے قرض لیے اور تینوں روپے استاد کو دے دیئے۔ انہیں گھر کا پتہ بھی بتا دیا۔ کہا' وہاں آ جائیں تو کچھ اور بندوبست بھی کر دوں گا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کا حال زار سن کر کلیجہ دھک سے رہ گیا تھا۔

دوسرے ہی روز وہ گھر پر آئے۔ میں نے دس روپے دیئے۔ انہوں نے کپکپاتے ہاتھوں سے نوٹ پکڑا۔ لمحہ بھر بت بنے کھڑے رہے۔ پھر دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر اس طرح دھاڑیں مار کر روئے جیسے کوئی اپنے عزیز کی میت کے سرہانے کھڑے ہو کر روتا ہے۔

ایک عرصے تک وہ نظر نہ آئے۔ میں نے سوچا کہیں کام کاج مل گیا ہو گا۔ مگر جب وہ ملے تو ان کی حالت اور بھی زیادہ خستہ تھی۔ اچکن میلی چیکٹ ہو گئی تھی۔ ان کی موٹی ناک پچک گئی تھی۔ جنگلی کبوتر کی سی سرخ آنکھیں اندر دھنس گئی تھیں۔ اس بار وہ صرف یہ مدعا

لے کر آئے تھے کہ میں انہیں کہیں چھوٹے موٹے کام دھندے سے لگوادوں۔ اس روز بھی میں نے انہیں کچھ رقم دی۔ وعدہ کیا کہ کہیں ملازمت دلوادوں گا۔

وہ برابر آتے رہے اور میں ہر بار وعدہ کرتا رہا۔ ان کے لیے ملازمت کی کوئی سبیل پیدا نہ کرسکا۔ بات یہ تھی کہ قیام پاکستان کو چند ہی برس گزرے تھے۔

روزگار کے مواقع بہت کم تھے اور ہندوستان سے ہجرت کرنے والے پریشان حال مسلمانوں کی آمد کا سلسلہ ہنوز جاری تھا۔ لہٰذا بے روزگاروں کی تعداد کم ہونے کے بجائے بڑھتی جارہی تھی۔ اور استاد شیدی کے ساتھ تو یہ بھی قباحت تھی کہ وہ سنگیت کے سات سروں کے علاوہ کوئی اور ہنر جانتے بھی نہ تھے۔ کچھ پڑھے لکھے بھی نہ تھے۔ انہیں کوئی کام دھندا ملتا بھی کیسے!''

وہ میرے وعدہ پر بار بار یقین کرکے چلے جاتے۔ اپنی عبرتناک حالت کی المناک داستان بھی سناجاتے۔ آخر ایک ایسا وقت بھی آیا کہ میں ان سے بیزار ہوگیا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ میں ہر بار ان کی مالی امداد کرنے سے معذور تھا۔

ایک روز وہ آئے تو میں نے کہلوادیا۔ ''گھر پر نہیں ہیں۔'' نہ جانے کیا بات تھی کہ واپس جانے کے بجائے وہ دروازے پر ٹھہر گئے اور ٹہل ٹہل کر میرا انتظار کرتے رہے۔ عجب مصیبت تھی۔ میں گھر کے اندر قید تھا اور وہ دروازے کے سامنے گویا پہرا دے رہے تھے۔ شاید وہ دن کے نو بجائے تھے۔ سہ پہر تک مسلسل ٹہلتے رہے۔ مجھے ان کی حالت پر ترس آ گیا۔ خدا معلوم کیا افتاد پڑی تھی کہ صبح کے بھوکے پیاسے وہ اس طرح بے چینی سے میرا انتظار کررہے تھے۔

مشکل یہ تھی کہ میرے گھر میں آمدورفت کے لیے صرف ایک ہی دروازہ تھا اور اس دروازے پر موجود تھے۔ ورنہ میں کسی نہ کسی طرح ان کے پاس ضرور پہنچ جاتا۔ بہرحال جب تک وہ موجود رہے' بڑا ذہنی کرب رہا۔ جھٹپٹا ہونے سے کچھ دیر قبل وہ چلے گئے۔ اس وقت وہ بیماروں کی طرح نڈھال اور لاغر نظر آرہے تھے۔ لیکن اس روز کے بعد وہ دوبارہ میرے گھر نہ آئے۔ ایک مدت گزرگئی۔ خدا جانے کس حال میں تھے۔

چند ماہ بعد کا واقعہ ہے۔ ایک ضرورت سے لارنس روڈ پر واقع شو مارکیٹ کی طرف جانے کا اتفاق ہوا۔ جوتے بنانے والے ایک کارخانے میں داخل ہوا تو مجھے ایک شخص پر استاد شیدی کی شباہت کا گمان ہوا۔ وہ فرش پر بیٹھا' رانپی سے بڑی محویت کے عالم میں چمڑا کاٹ رہا تھا۔ گرمی کا موسم تھا۔ اس کے بدن پر صرف ایک گندہ جانگیا تھا۔ دبلا پتلا اتنا تھا کہ ایک ایک ہڈی نظر آتی تھی۔

اس نے گردن اٹھا کر دیکھا تو میں ششدر رہ گیا۔ وہ استاد شیدی ہی تھے۔ میں نے دل ہی دل میں کہا۔ استاد نے مجھے یہاں دیکھ

لیا تو بہت خفیف ہوں گے انہیں ٹھیس پہنچے گی۔ میں واپس جانے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ انہوں نے مجھے دیکھ لیا۔ فوراً اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ خلاف توقع بڑی گرمجوشی سے ملے۔ پرتپاک لہجے میں گویا ہوئے۔

''ارے آپ ہیں! خیریت تو ہے؟''

انہوں نے جھٹ باہر والے کو آواز دی۔ وہ آیا۔ انہوں نے دو چائے کا آرڈر دیا۔ چائے آئی تو اصرار کر کے بڑے چاؤ سے پلائی۔ میں نے اظہار ہمدردی کے طور پر کہا۔ ''مرزا صاحب! یہ آپ نے کیا حالت بنا رکھی ہے؟''

ہنس کر بولے۔ ''بھائی دونوں وقت پیٹ بھر کر روٹی مل جاتی ہے اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔''

میں نے دریافت کیا۔ ''تو گویا آپ نے موسیقی کو بالکل ترک کر دیا؟''

نہایت بے نیازی سے بولے۔ ''اجی لعنت بھیجئے سالی موسیقی کو۔''

''آپ نے برسوں خون پسینہ کر کے ریاضت کی۔ اپنے فن میں کمال حاصل کیا۔'' میں نے انہیں یاد دلانے کی کوشش کی۔

''عزت اور وقار حاصل کیا۔ بڑا نام پایا۔''

''اجی کیا رکھا ہے ان باتوں میں۔'' وہ دل گرفتہ ہو کر بولے۔ ''نہ جانے کیسے پرنس کہلانے کا سر میں خناس سمایا۔'' ان کا چہرہ بجھ گیا۔ ''اسی چکر میں مارا گیا۔''

''ایسا کیا' تب بھی آپ نے کوئی جرم تو نہیں کیا۔'' میں نے ان کی دلجوئی کی۔ ''ٹھاکر اونکار ناتھ بھی تو آپ ہی کی طرح کے بڑے گانے بجانے والوں میں سے ہیں۔ فن کی عزت افزائی کے طور پر انہیں پرنس نہیں سمراٹ کہا جاتا ہے۔''

''اجی ہندوستان کی باتیں ہندوستان میں رہ گئیں۔ ایسے ہی بڑے نامی گرامی استادوں کی دیکھا دیکھی میرے سر میں بھی پھوڑا نکلا۔ اتنی اونچائی تک پہنچنے کی کوشش کی کہ دھڑام سے منہ کے بل گرا۔''

اپنی بات کہتے کہتے وہ مسکرائے۔

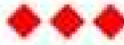
''میاں! سچ پوچھئے تو اپنی اوقات بھول گیا تھا۔ میں ڈھپالی تھا' ڈھپالی ہی رہا۔ پہلے ساز اور سر کے طبلوں پر کھال منڈھتا تھا' اب پیروں کے لیے لکڑی کے فرموں پر چمڑا منڈھتا ہوں۔ بات تو ایک ہی ہے نا۔''

میں نے کرید کر پوچھا۔ ''مگر سارنگی سے تو کبھی کبھار شوق پورا کرتے ہی ہوں گے؟''

چمک کر بولے۔ ''اجی کیسی سارنگی' کہاں کی سارنگی۔ جب جوتوں کے تلے بھی جواب دے گئے اور گھر باہر نکلنے کے قابل نہ رہا تو

ایک روز سارنگی اونے پونے بیچ کر ایک جوڑی جوتے کی خرید لی۔ سارنگی بیکار ہی تو پڑی تھی۔'' ان کے چہرے پر گہری سنجیدگی چھا گئی۔ ''آپ خود غور کیجئے۔ ساز اور سر کے بغیر دنیا کے کون سے کام بند ہوتے ہیں۔ مگر پیر میں جوتے کے بغیر گزارہ نہیں۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟''

میں نے غور کیا۔ وہ ٹھیک ہی کہہ رہے تھے۔ استاد شیدی سالہا سال تک فن موسیقی کے اسرار و رموز سیکھتے اور سکھاتے رہے۔ اب وہ زندگی کے اسرار و رموز بھی سیکھ گئے تھے۔



خفیہ ہاتھ

دن ڈھلے علیم الدین سبزواری نے ایک بار پھر فون کیا۔ اس دفعہ داد محمد سومرو کی کوٹھی سے منیجر کے بجائے کوئی اور بول رہا تھا۔ یہ سومرو کا پرائیویٹ سیکرٹری علی بخش ناریجو تھا۔

علیم الدین نے دریافت کیا۔ ''مسٹر سومرو تشریف رکھتے ہیں؟''

جواب ملا۔ ''جی نہیں' وہ یہاں سے چلے گئے؟''

''کوئی حرج نہ ہو تو زحمت کر کے یہ بھی بتا دیجئے کہ وہ کہاں گئے ہیں؟''

''سائیں! میں آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں؟'' ناریجو نے نرم لہجے میں پوچھا۔

''میں اخبار ''ندائے وطن'' کا ایڈیٹر علیم الدین سبزواری بول رہا ہوں۔''

''آپ سومرو صاحب سے کس سلسلے میں ملنا چاہتے ہیں؟''

''کچھ ضروری کام ہے جس کی اہمیت کا ان کو بھی بخوبی علم ہے۔'' علیم الدین نے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ''ملاقات کے لیے مجھ سے شام کا وقت بھی مقرر کیا تھا۔ حیرت ہے انہوں نے نہ میرا انتظار کیا نہ اپنی روانگی سے مطلع کیا۔ ہوسکتا ہے کسی بہت ضروری کام سے اچانک جانا پڑا ہو' مگر مجھے فون تو کر دیتے۔'' اس نے قدرے توقف کیا۔ ''کہاں گئے ہیں؟''

''سندرولی گئے ہیں۔ سرلاج میں ٹھہریں گے۔'' پرائیویٹ سیکرٹری نے ہچکچاتے ہوئے بتایا۔ ''مگر وہ صرف رات بھر وہاں رہیں گے۔''

''کل شام تک تو یہاں واپس آ جائیں گے نا؟'' علیم الدین نے قیاس آرائی کی۔

''نہیں سائیں'' سیکرٹری نے اس کی توقعات خاک میں ملا دیں۔ ''فوری طور پر ان کی واپسی کا کوئی امکان نہیں۔ سندرولی سے وہ ایک شادی میں شرکت کرنے ٹنڈو الہ یار چلے جائیں گے۔''

''تو گویا' ان کی واپسی کی فی الحال کوئی توقع نہیں۔''

''جی ہاں' کوئی امید نہیں۔'' سیکرٹری نے علیم کو یقین دلایا۔ ''میں ڈائری دیکھ کر ان کا پروگرام بتا رہا ہوں۔''

علیم الدین سبزواری نے پرائیویٹ سیکرٹری کا شکریہ ادا کیا اور ریسیور رکھ دیا۔ اب سوال یہ درپیش تھا کہ داد محمد سومرو سے کیوں کر ملا جائے؟ ملنا نہایت ضروری تھا۔ علیم الدین نے کچھ سوچ کر ایک ٹرانسپورٹ کمپنی کو فون کیا جس کی بسیں ٹھٹھہ اور حیدر آباد جاتی تھیں۔ اس کا مالک علیم کا پرانا واقف کار تھا۔ اس نے علیم کی رہنمائی کی اور جو معلومات فراہم کیں ان کے مطابق موٹر روڈ سے سندرولی تک ۴۲ میل کا فاصلہ تھا۔ بسیں اور لاریاں صرف عالمگیری تک جاتی تھیں۔ وہاں سے سندرولی ۱۵ میل دور تھا۔ کچھ فاصلے تک نیم پختہ سڑک تھی۔ آگے کچا راستہ تھا جس پر جگہ جگہ گڑھے تھے۔ راہ میں آبادی برائے نام تھی۔ ویران اور بنجر علاقہ تھا۔ علیم الدین نے ساری اطلاعات نوٹ کر لیں۔

آدھ گھنٹہ کے اندر اندر وہ سفر کے لیے تیار ہو چکا تھا۔ اس نے جیپ نکالی۔ پٹرول پمپ پہنچ کر جیپ کی ٹینکی پوری طرح بھروائی اور اللہ کا نام لے کر چل کھڑا ہوا۔ شہر سے نکل کر وہ نیشنل ہائے وے پر چند ہی میل دور گیا ہوگا کہ شام ہو گئی۔ ہر طرف دھند لکا پھیل گیا۔ سڑک کی پچھلے ہی دنوں مرمت ہوئی تھی۔ ٹریفک بھی کم تھی۔ راستہ بہت اچھا تھا۔ اس نے جیپ کی رفتار تیز کر دی اور اسٹیرنگ وہیل سنبھال کر مستعدی سے بیٹھ گیا۔

جب وہ عالمگیری پہنچا تو رات کے آٹھ بجے کا عمل تھا۔ یہ مختصری مضافاتی بستی تھی۔ سڑک کے دونوں جانب پیلی مٹی کی دیواروں کے کچے مکانات تھے جن پر لکڑی اور کھجور کے پتوں کی چھتیں تھیں۔ بازار کی رونق اجڑ چکی تھی۔ صرف بسوں کے اڈے پر چند دوکانیں ابھی تک کھلی تھیں۔ ان میں ایک چائے خانہ بھی تھا جس میں نہایت اونچی آواز سے فلمی گانوں کے ریکارڈ بج رہے تھے۔

علیم نے جیپ ایک جانب ٹھہرائی۔ نیچے اترا اور چائے خانے کے اندر چلا گیا۔ چائے خانہ زیادہ کشادہ نہ تھا۔ ہر طرف دھواں پھیلا ہوا تھا۔ چائے خانے میں پٹرومیکس روشن تھا۔ اس کی تیز روشنی میں بھدی اور گندی میزوں کے اردگرد ٹین کی بوسیدہ کرسیاں پڑی تھیں۔ کرسیوں پر بیٹھے ہوئے لوگ سایوں کی مانند دھندلے دھندلے نظر آ رہے تھے۔ وہ چیخ چیخ کر باتیں کر رہے تھے۔ قہقہے لگا رہے تھے۔ گرم گرم چائے کے گھونٹ بھر رہے تھے اور فلمی گانے سن رہے تھے۔

علیم نے چائے خانے کے ماحول پر کوئی توجہ نہ دی۔ سیدھا کاؤنٹر پر پہنچا۔ ایک چائے منگوائی۔ چائے آئی تو اس نے وہیں کھڑے کھڑے ایک گرم گرم پیالی ختم کی۔ چائے کا ذائقہ کسیلا تھا۔ ضرورت سے زیادہ میٹھی بھی تھی۔ شکر کے ساتھ اس میں گڑ کی بھی آمیزش تھی۔ چائے خانے سے باہر نکل کر اس نے سگریٹ سلگائی اور جیپ سے ٹیک لگا کر کش لگانے لگا۔ جیپ کے اندر دیر تک مسلسل بیٹھے رہنے سے اس کی ٹانگوں اور کمر کے جوڑ دکھنے لگے تھے۔ پٹھوں میں اینٹھن ہو رہی تھی۔

جب تکان ذرا کم ہوئی اور جسم میں تازگی پیدا ہوئی تو وہ جیپ کے اندر گیا۔ اسٹیرنگ وہیل سنبھالا۔ انجن اسٹارٹ کیا۔ گیئر بدلا۔ ایکسیلیٹر دبایا۔ جیپ آگے بڑھی۔ مڑی اور اس سڑک پر دوڑنے لگی۔ جو سندرولی جاتی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے بس اسٹینڈ کی روشنیاں آنکھیں جھپکا جھپکا کر دھندلی پڑ گئیں۔ عالمگیری کی بستی پیچھے رہ گئی۔ نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

سڑک بالکل سنسان تھی۔ دونوں جانب اونچے نیچے ٹیلے تھے جو تاریکی میں ڈوبے ہولناک نظر آ رہے تھے۔ جیپ ان کے درمیان سے شور مچاتی ہوئی گزر رہی تھی۔ علیم اپنی نشست پر بیٹھا شکار پر جھپٹنے والے چیتے کی سی تیز نظروں سے جیپ کی روشنی میں سڑک کو دیکھ رہا تھا۔ اب سمندر کی جانب سے آنے والی تیز ہوا کے جھونکوں کے ساتھ جھینگوں اور مچھلیوں کی بو محسوس ہونے لگی تھی۔ چٹانوں سے ٹکراتی ہوئی شوریدہ سر لہروں کا شور قریب آتا جا رہا تھا۔

ویران سڑک پر اکادکا راہ گیر نظر آ رہے تھے۔ یہ گھروں کو لوٹنے والے مچھیرے تھے۔ ان کی بستی امیر گوٹھ ٹیلوں کے اس پار نشیب میں واقع تھی۔ علیم لگ بھگ دس میل کا فاصلہ طے کر چکا تھا۔ اب نیم پختہ سڑک ختم ہو چکی تھی۔ جیپ کچے راستے پر دوڑ رہی تھی۔ راستہ ناہموار تھا۔ جگہ جگہ گڑھے تھے۔ جیپ بار بار ہچکولے کھاتی 'ڈگمگاتی اور ادھر ادھر جھک جاتی۔

علم الدین سبزواری بہت سنبھل کر جیپ دوڑا رہا تھا۔ ہوا بپھری ہوئی تھی۔ آسمان پر بادل چھائے تھے۔ یکا یک بوندا باندی شروع ہوگئی۔ علیم نے جیپ کی رفتار اور کم کر دی۔ سامنے شیشے پر وائپر تیزی سے گردش کر رہے تھے۔ مگر راستہ ٹھیک سے سجھائی نہ دیتا تھا۔ اندھیرا ابھی گہرا ہو گیا تھا۔ راستہ بالکل سنسان تھا۔ ہر طرف ہو کا عالم طاری تھا۔ احتیاط کے باوجود بائیں جانب کا اگلا پہیہ ایک گڑھے میں کچھ اس طرح اترا کہ جیپ زور سے اچھلی اور الٹتے الٹتے رہ گئی۔ علیم الدین سراسیمہ ہوگیا۔ خوف سے آنکھیں بند ہوگئیں۔ پہلی بار وہ اپنی غیر دانشمندی پر پچھتایا۔ اتنی رات گئے ایسے خراب راستے پر اسے سفر نہیں کرنا چاہیے تھا۔ کرتا بھی کیا۔ داد محمد سومرو سے فوری طور پر ملنا اس کے لیے نہ صرف ضروری بلکہ بہت ضروری تھا۔

خدا خدا کر کے جیپ سندرولی پہنچی۔ سڑک کے ایک طرف لکڑی کا بوسیدہ بورڈ آویزاں تھا جس پر دھندلے دھندلے انگریزی حروف میں سندرولی لکھا تھا۔ بورڈ کے فرلانگ ڈیڑھ فرلانگ کے فاصلے پر بستی کے کچے مکانات اندھیرے میں پرچھائیوں کی مانند نظر آ رہے تھے۔ مکانوں میں کہیں کہیں چراغوں کی روشنیاں ٹمٹما رہی تھیں۔ جگہ جگہ پر فضا تھی۔ ہر طرف درختوں کے جھنڈ تھے۔ جھاڑیاں تھیں۔ ہوا میں جنگلی پھولوں کی مہک رچی ہوئی تھی۔

سر لاج کے ایک دریچے سے پھوٹتی ہوئی روشنی دور ہی سے نظر آتی تھی۔ یہ کالونیل (کالونیل) طرز تعمیر کی دو منزلہ حویلی تھی اور

راستے سے ہٹ کر ایک اونچے ٹیلے کے دامن میں واقع تھی۔ علیم نے جیپ موڑی اور ایک گھنے درخت کے نیچے پہنچ کر انجن بند کیا۔ کنجی احتیاط سے جیب میں رکھی۔ جیپ سے نیچے اترا اور اس پگڈنڈی پر چلنے لگا جو حویلی تک جاتی تھی۔ پگڈنڈی کشادہ تھی اور ہموار بھی تھی۔ علیم اطمینان سے حویلی تک اپنی جیپ لے جا سکتا تھا' لیکن اس نے پیدل چلنا مناسب سمجھا۔ قریب پہنچا۔ حویلی کی چار دیواری اونچی تھی اور پرانی بھی تھی۔ جگہ جگہ سے پلستر اکھڑا ہوا تھا۔ چار دیواری کا قد آدم پھاٹک بھی بوسیدہ تھا۔ لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ اس میں تالا بھی پڑا ہوا نہ تھا۔ یہ حویلی شکار پور کے ایک سندھی تاجر ہری چند مول چند رام چندانی کی ملکیت تھی جو فرقہ وارانہ فسادات کے خوف سے نقل مکانی کر کے ہانگ کانگ چلا گیا تھا جہاں اس کا پہلے سے جما جمایا کاروبار تھا۔ مگر حویلی اب بلا شرکت غیرے داد محمد کے قبضے میں تھی۔

علیم الدین سبزواری آسانی سے پھاٹک کا ایک پٹ کھول کر اندر چلا گیا۔ سامنے وسیع احاطہ تھا۔ احاطے میں گھنے درخت تھے۔ خودرو پودوں کی جھاڑیاں تھیں' اونچی اونچی گھاس تھی۔ بارش اب رک گئی تھی۔ احاطے میں ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ درختوں کی آڑ سے سرلاج کی پرشکوہ عمارت نظر آ رہی تھی۔ جس کی روکار کے بلند و بالا استونوں پر بوگن ویلا کی بیلیں چڑھی ہوئی تھیں جو بالائی منزل کی محرابوں کے ساتھ جھول رہی تھیں۔ وہ سنبھل سنبھل کر قدم رکھتا ہوا قریب پہنچ گیا۔ برساتی میں سومرو کی لمبی چوڑی سیاہ بیوک کھڑی تھی۔ کار کے آس پاس کوئی نہ تھا۔ ہر طرف گہری خاموشی چھائی تھی۔ نہ کوئی آہٹ تھی نہ آواز۔

اس نے سیڑھیاں طے کیں اور اوپر برآمدے میں پہنچ گیا۔

علیم الدین بڑھ کر صدر دروازے پر پہنچا۔ دروازہ اونچا اور چوڑا چکلا تھا۔ اس پر نہایت دیدہ ریزی اور ہنر مندی سے خوبصورت نقش و نگار بنائے گئے تھے۔ جگہ جگہ پیتل کے باریک تاروں سے پچی کاری کی گئی تھی۔ دروازہ نہایت مضبوط اور عالیشان تھا۔ مگر اس کی چمک دمک اب ماند پڑ چکی تھی۔

علیم دروازے تک تو پہنچ گیا۔ لیکن اب یہ سوال درپیش تھا کہ داد محمد سے کس طرح ملاقات کی سبیل پیدا کی جائے۔ پہر رات گزر چکی تھی۔ سناٹا بھی بہت گہرا تھا اور داد محمد سومرو سے علیم زیادہ یاد اللہ بھی نہ تھی۔ علیم سے اس کی پہلی ملاقات کراچی میں ایک پریس کانفرنس کے دوران ہوئی تھی جس کا بندوبست سومرو کی کوٹھی ہی میں کیا گیا تھا۔ وہسکی اور بیئر کے ساتھ طرح طرح کے عمدہ اور مرغن کھانوں سے اخبار نویسوں کی تواضع بھی کی گئی تھی جن میں تیتر اور بٹیر کا بھنا ہوا گوشت خصوصیت کے ساتھ قابل توجہ تھا۔ نہایت لذیذ تھا اور سب ہی نے رغبت سے کھایا تھا۔ بعد میں بھی سرکاری تقریبات اور غیر ملکی سفارت خانوں کی پارٹیوں میں علیم سے اکثر اس کی ملاقات ہوئی۔ مگر یہ رسم و راہ صاحب سلامت سے آگے نہ بڑھ سکی۔ دونوں کے درمیان اجنبیت اور دوری بدستور حائل رہی۔

داد محمد سومرو کا چہرہ گینڈے کی طرح چوڑا چکلا' قد ٹھگنا اور جسم بے ڈول اور بدوضع تھا۔ آنکھیں خوفناک حد تک ابھری ہوئی تھیں۔ آواز حلق سے اس طور نکلتی تھی جیسے ٹین کے خالی پیپے کے اندر سے بول رہا ہو۔ سیاسی بصیرت کا یہ عالم تھا کہ قومی مسائل کا تجزیہ عام طور پر محکمہ موسمیات کی پیشین گوئیوں کی طرح الل ٹپ کرتا تھا۔ البتہ سرکار دربار میں اس کی رسائی تھی۔ وزیروں اور اعلیٰ حکام سے ہمیشہ خوشگوار تعلقات رکھتا تھا۔ خود بھی بہت بڑا وڈیرا تھا۔ وہ اخبار نویسوں سے مختلف حیلوں بہانوں سے ملتا رہتا۔ ان کو متاثر کرنے کی بھی کوشش کرتا۔ وہ ٹھہر ٹھہر کر اور سنبھل سنبھل کر باتیں کرتا تھا۔ بات کہتے کہتے اکثر الجھ جاتا۔ بار بار اپنی سیاہ گھنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرتا۔ بولتا کم تھا ہاتھوں اور آنکھوں کی گردش سے زیادہ کام لیتا تھا۔ ہر جملے پر چہرے کے اتار چڑھاؤ میں جاگیردارانہ طنطنہ پیدا کرتا۔ اپنے ہر انداز اور رویے سے یہ ثابت کرنا چاہتا کہ وہ ارادے کا پختہ ہے۔ قول کا سچا ہے۔ فولاد کی طرح اپنے عزائم میں مضبوط اور مستحکم ہے۔ ایسا مرد آہن ہے جو نہ گر سکتا ہے نہ پسپا ہو سکتا ہے۔ ریس کھیلنا' یورپ اور امریکہ کے دورے کرنا اور سیاست لڑانا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔

وہ ان خوش نصیبوں میں سے تھا جو اپنی روزی کے لیے خود محنت نہیں کرتے بلکہ دوسروں کی محنت پر رانڈ کے سانڈ کی طرح پلتے ہیں اور جن کے پیٹ میں ملک وقوم کا درد اکثر موقع اور بے موقع مروڑ بن کر اٹھتا رہتا ہے۔ داد محمد کے پیٹ میں جب ایسا درد اٹھتا تو وہ فوراً اخبارات کے لیے بیان جاری کرتا اور اسے اپنی تصویر کے ساتھ شائع کرانے کی ہر ممکن کوشش کرتا۔ علیم الدین کا ایسے سیاست دانوں سے آئے دن سابقہ پڑتا رہتا تھا۔ وہ ہمیشہ ان کی کمزوریاں معلوم کرنے کی ٹوہ میں رہتا اور اپنے اخبار کے ذریعے ان کمزوریوں سے فائدہ اٹھانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتا۔ یہ اخبار سہ پہر دن چڑھے نکلتا تھا اور ایونگر کہلاتا تھا۔ مشکل سے ڈھائی تین ہزار چھپتا تھا۔ مگر اس کی لوح کے ساتھ کثیر الاشاعت کا دم چھلا نمایاں طور پر درج ہوتا۔ اس میں چٹ پٹی خبروں اور طرح طرح کے سنسنی خیز اسکینڈلوں کے ساتھ ساتھ پوشیدہ زنانہ اور مردانہ علاج کرنے والے ماہرین' قسمت کا حال بتانے والے پروفیسروں اور فلموں کے ہیجان انگیز اشتہارات شائع ہوتے تھے۔

بارش پھر شروع ہو گئی تھی۔ ہوا بھی رفتہ رفتہ تیز ہوتی جا رہی تھی۔

علیم الدین نے صدر دروازے سے کان لگا کر اندر کی سن گن لینے کی کوشش کی۔ مگر وہاں قبرستان کی سی خاموشی چھائی تھی۔ البتہ اوپر کی منزل کی کھڑکیوں کے شیشوں سے روشنی چھن چھن کر اندھیرے میں بکھرتی جا رہی تھی۔ اس نے دروازے کو ہولے سے دھکا دیا۔ لیکن دروازہ اندر سے بند تھا۔ دروازے پر پیتل کے دو مضبوط کڑے' کنڈوں میں لٹک رہے تھے۔ علیم چند لمحے خاموش کھڑا رہا'

پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر پیتل کے دونوں کڑوں کو تھاما اور دروازے سے ٹکرا کر آہستہ آہستہ آہٹ پیدا کی۔ مگر نہ دروازہ کھلا نہ حویلی کے اندر کوئی آواز سنائی دی۔

اس نے کسی قدر زور سے کڑوں کو ٹکرایا۔ لیکن اس پرانی حویلی پر بدستور خاموشی چھائی رہی۔ اس نے بار بار کڑوں کو زور زور سے ٹکرایا۔ کچھ دیر بعد چاپ سنائی دی۔ دروازہ چرچراتا ہوا کھلا۔ ایک لحیم شحیم' کالا کلوٹا آدمی جو وضع قطع سے ملازم نظر آتا تھا' دروازے کا ایک پٹ کھول کر سامنے آ گیا۔ اس کا سینہ ڈھول کی طرح ابھرا ہوا تھا۔

دروازہ کھولتے ہی اس نے علیم سے پوچھا۔ ''کون ہو تم؟'' یہ سوال اس نے اس قدر گرج دار لہجے میں کیا گویا علیم کو خوفزدہ کر دینا چاہتا ہو۔

علیم نے اس کے گرج دار لہجے سے مرعوب ہوئے بغیر نہایت اطمینان سے دریافت کیا۔ ''سومرو صاحب جاگ رہے ہیں یا سو گئے؟''

''وہ یہاں نہیں ہیں۔'' اس نے نہایت بے رخی سے اسی گرجدار لہجے میں جواب دیا۔

علیم پہلے تو ذرا سا جھجکا پھر سنبھل کر بولا۔ ''ہیں تو وہ یہیں۔ ان کی کار بھی موجود ہے۔'' اس نے برساتی میں کھڑی ہوئی بیوک کی جانب مڑ کر دیکھا۔ ''تم اندر جا کر اطلاع کر دو۔''

کالا کلوٹا آدمی نتھنے پھلا کر گرجا۔ ''کہہ دیا کہ وہ یہاں نہیں ہیں۔''

''میں کہتا ہوں کہ وہ یہاں ہیں۔'' سبزواری بھی ڈھٹائی پر اتر آیا۔ ''اور مجھے ان سے ملنا ہے۔''

وہ شخص بہت شپٹایا۔ لحظہ بھر خاموش رہ کر بولا۔ ''اگر وہ یہاں ہیں بھی تو مل نہیں سکتے۔''

''کیسے نہیں مل سکتے۔ ضرور ملیں گے۔''

''بس کہہ دیا' نہیں مل سکتے۔''

اتنا کہہ کر لحیم شحیم آدمی نے دروازہ جھٹ سے بند کر دیا۔

سخت کوفت ہوئی۔ علیم الدین بند دروازے کو تکتا رہا اور سوچتا رہا کہ اتنی رات گئے ایسا خطرناک سفر بھی کیا مگر بات کچھ نہ بنی۔ بارش اب تیز ہوتی جا رہی تھی۔ ہوا درختوں کی شاخوں سے گزرتے ہوئے سیٹیاں بجا رہی تھیں۔ اندھیرا اس قدر گہرا ہو گیا تھا کہ چند قدم کے فاصلے پر کچھ نظر نہ آتا تھا۔ واپس جانے کا بھی سوال پیدا نہ ہوتا تھا اور نہ وہ دادِ محمد سے ملے بغیر واپس جانے کے ارادے سے

آیا تھا۔

وہ خاموش کھڑا رہا۔ چھما چھم مینہ برستا رہا۔ بپھری ہوئی ہوا شور مچاتی رہی۔ علیم نے ہمت نہ ہاری۔ ایک بار پھر ہاتھ بڑھا کر پیتل کے کڑوں کو دروازے سے ٹکرا کر آواز پیدا کی۔ نہ کوئی چاپ سنائی دی نہ دروازہ کھلا' مگر علیم سبزواری باز نہ آیا۔ رک رک کر پیتل کے کڑوں کو دروازے سے ٹکرا کر آہٹ پیدا کرتا۔

کچھ دیر بعد کالا کلوٹا لحیم شحیم آدمی پھر دروازے پر نمودار ہوا اور خونخوار نظروں سے علیم کو گھورنے لگا۔

علیم اس دفعہ بھی مرعوب نہ ہوا بلکہ اس کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے مسکرا کر گویا ہوا۔ "یار' اتنا ناراض کیوں ہوتے ہو۔" اس کے لہجے میں بے تکلفی تھی۔ "یہ تو بتاؤ تمہارا نام کیا ہے؟"

"ہمارا نام عبدالرحمن گمسی ہے۔" اس کے چہرے پر بدستور جھنجلاہٹ چھائی رہی۔ "پر تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟" اس نے قدرے توقف کیا۔ "اور تم ابھی تک یہاں سے گئے بھی نہیں۔"

اس کے لہجے میں ہلکی سی لڑکھڑاہٹ تھی۔ یہ نیند کی غنودگی کا اثر معلوم ہوتا تھا۔ علیم فوراً تاڑ گیا۔ ڈھٹائی سے بولا۔ "تم سمجھتے ہو میں آسانی سے چلا جاؤں گا؟"

گمسی بھنا گیا۔ "تو پھر کھڑے رہو۔"

گمسی نے ایک بار پھر دروازہ بند کر دیا۔ لیکن وہ چند ہی قدم گیا ہو گا کہ علیم نے پیتل کے کڑوں کا دروازے سے ٹکرا کر کھٹکھٹایا۔

گمسی جھنجلایا ہوا واپس آیا۔ غرا کر بولا۔ "تم سے کہہ دیا کہ وہ نہیں مل سکتے۔"

وہ کھا جانے والی نظروں سے علیم کو گھورنے لگا۔

"میں کہتا ہوں وہ ملیں گے' ضرور ملیں گے۔"

"اچھا تو پھر مل لو۔"

دروازہ چرچراتا ہوا بھڑ سے بند ہو گیا۔ علیم نے فوراً ہی اسے کھٹکھٹایا۔ دروازہ کھلا۔ گمسی آنکھیں نکال کر غرایا۔ جھنجلاہٹ اور خفگی کا اظہار کیا۔ علیم ذرا بھی مرعوب نہ ہوا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

کئی بار دروازہ بند ہوا کئی بار کھلا۔

اب علیم کو اس سے چھیڑ خانی کرنے میں مزہ آنے لگا تھا۔ آخر کالا کلوٹا عبدالرحمن گمسی زچ ہو کر خوشامد پر اتر آیا' کہنے لگا۔

''سائیں' تم نے ہماری نیند خراب کردی۔ ہم کو سویرے بہت تڑکے اٹھنا پڑتا ہے۔ تم ہم کو کیوں تنگ کر رہے ہو؟''

''اور میں یہاں آرام سے کھڑا عیش کر رہا ہوں۔''

''تو پھر جاؤ' آرام کرو۔ بعد میں مل لینا۔''

''لیکن مجھے تو اسی وقت ملنا ہے۔'' علیم نے نرم لہجے میں اپنی مجبوری جتانے کی کوشش کی۔ ''ملنا بہت ضروری ہے۔ ورنہ میں اتنی رات کو یہاں کیوں آتا۔ سومرو صاحب ہی نے مجھے یہاں ملنے کے لیے بلایا تھا۔''

''پرانہوں نے حکم دیا ہے کہ رات کو وہ کسی سے نہیں ملیں گے۔''

''ان کو یاد نہیں رہا ہوگا۔'' علیم نے جیب سے وزیٹنگ کارڈ نکالا۔ مگسی کی طرف بڑھا کر بولا۔ ''لو یہ کارڈ ان کو پہنچا دو۔ وہ فوراً مجھے بلالیں گے۔''

مگسی نے کارڈ لینے سے انکار کر دیا۔ ''نا سائیں' یہ نہیں ہوسکتا۔ میں ان کے پاس نہیں جاسکتا۔ ایسا تو میں ہرگز نہیں کرسکتا۔'' اس کے رویے سے صاف اندازہ ہوتا تھا کہ وہ علیم کو کسی طور اندر داخل ہونے کی اجازت نہیں دے گا۔

علیم نے فوراً پینترا بدلا۔ دس روپے کا ایک نوٹ نکالا۔ مگسی کی جانب بڑھایا۔ ''لو اسے رکھ لو۔'' مگسی نے ہچکچاتے ہوئے نوٹ لے لیا۔ لیکن اپنی جگہ پر جما ہوا کھڑا رہا۔ رشوت لے کر بھی ٹس سے مس نہ ہوا۔ علیم نے بے چین ہو کر کہا۔ ''یار اب تو اندر آنے دو۔'' وہ بے تکلفی سے کھل کر مسکرایا۔ ''یوں کب تک کباب میں ہڈی بنے کھڑے رہو گے؟''

مگسی نظریں جھکائے چند لمحے سوچتا رہا پھر اس نے علیم کو نظر بھر کر دیکھا۔ ''سائیں' معاف کرنا۔ اس دروازے سے تو تم ہرگز اندر نہیں آسکتے۔ ہم کو حکم دیا گیا ہے کہ رات کو اس دروازے سے کسی کو بھی اندر نہ آنے دیا جائے۔ ہم مالک سے نمک حرامی نہیں کر سکتے۔'' اس نے گردن موڑ کر اس کھڑکی کی جانب دیکھا جو دروازے سے کچھ فاصلے پر تھی۔ ''تم چاہو تو اس کھڑکی سے اندر آسکتے ہو۔''

ظاہر ہے علیم کو اس تجویز پر کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ وہ فوراً رضامند ہوگیا۔ ''تم کہتے ہو تو دروازے کے بجائے کھڑکی سے اندر آجاؤں گا۔ تم ہرگز نمک حرامی نہ کرو۔''

مگسی نے زبان سے ایک لفظ نہ نکالا۔ خاموشی سے دروازہ بند کر دیا۔ علیم مڑا۔ سیڑھیوں سے نیچے اترا اور بارش کے چھینٹوں سے بچتا بچاتا کھڑکی کے قریب پہنچ گیا۔ کھڑکی کھلی تھی۔ زیادہ اونچی بھی نہ تھی۔ علیم ہمت کر کے اوپر چڑھ گیا۔ مگسی وہاں موجود تھا۔ اس نے علیم کا بازو پکڑ کر سہارا دیا۔ علیم نیچے اترا۔ اب وہ حویلی کے اندر پہنچ چکا تھا۔

دونوں دھندلی روشنی میں خاموش کھڑے تھے۔ باہر رم جھم بارش ہو رہی تھی۔ تیز ہوا درختوں کی شاخوں سے الجھتی ہوئی شور مچا رہی تھی۔ علیم نے خاموشی کو توڑا۔ سرگوشی کرنے کے انداز میں آہستہ سے پوچھا۔

''سومرو صاحب کہاں ہیں' جاگ رہے ہیں نا؟''

''سائیں اوپر کے کمرے میں ہیں۔'' مگسی نے ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔''ابھی جاگ رہے ہیں۔ جاؤ جا کر مل لو۔''

''اوپر جانے کا راستہ تو بتا دو۔'' علیم نے بے چین ہو کر کہا۔'' مجھے تو یہاں کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔''

مگسی مڑا۔ علیم کی جانب دیکھے بغیر بولا۔ ''آؤ میرے ساتھ۔'' وہ آگے بڑھا۔ علیم اس کے ساتھ ساتھ چلا۔

ہر طرف گہرا سناٹا تھا۔ دونوں ایک غلام گردش سے گزر رہے تھے اور آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ غلام گردش سے گزر کر ایک وسیع ہال میں پہنچے۔ ہال بہت شاندار تھا۔ فرنیچر پرانا مگر قیمتی تھا۔ دیواروں پر تصاویر کے ساتھ ساتھ عہد رفتہ کی یادگار پرانی بندوقیں' ڈھالیں اور تلواریں سلیقے سے آراستہ تھیں۔ عمدہ اور دبیز قالین کا فرش تھا۔ وکٹورین طرز کے ہال کو دیکھ کر علیم بہت مرعوب ہوا مگر خاموش رہا۔

ہال کے ایک گوشے میں زینہ تھا جس کی سیڑھیاں ہلکا سا نیم دائرہ بناتی ہوئی اوپر جاتی تھیں۔ دونوں زینے کی جانب بڑھے۔ قریب پہنچ کر مگسی نے سرگوشی کی۔ ''اب تم اوپر جاؤ'' اس نے قدرے توقف کیا۔ ''سائیں نے تم کو ملنے کے لیے بلایا ہے نا؟'' مگسی نے مڑ کر علیم کی جانب استفہامیہ نظروں سے دیکھا۔

''بالکل بلایا ہے۔'' علیم نے نہایت ڈھٹائی سے جھوٹ بولا۔

''میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گا۔'' مگسی نے علیم کو خبردار کیا۔''سائیں' تم کو پتہ نہیں۔ خان صاحب کا غصہ بہت خراب ہے۔ اگر وہ ناراض ہوا یا کوئی گڑبڑ ہوئی تو تم ہی آگے نمٹنا۔ ہمارا نام نہ لینا۔ بالکل یہ نہ بتانا کہ ہم نے تم کو اندر آنے کا راستہ بتایا۔'' اس نے قہر آلود نظروں سے علیم کو دیکھا۔ ''یہ سمجھ لو وہ الٹا لٹکا کر ہماری چمڑی ادھیڑ ڈالے گا اور نوکری سے بھی نکال دے گا۔ پر ہم تمہارا سر توڑ ڈالیں گے۔''

''نہیں نہیں ایسا نہیں ہوگا۔'' علیم نے خائف ہو کر اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ ''تم بالکل اطمینان رکھو۔''

مگسی نے کچھ نہ کہا۔ خاموش کھڑا رہا۔ علیم الدین زینے کی سیڑھیاں طے کرتا ہوا اوپر پہنچ گیا۔ اس نے مڑ کر نیچے دیکھا۔ مگسی

وہاں موجود نہ تھا۔علیم آگے بڑھا۔اس کمرے کے قریب پہنچا جس سے روشنی نکل کر باہر پھیلی ہوئی تھی۔دروازے کا ایک پٹ کھلا تھا۔ علیم نے ہچکچاتے ہوئے پردہ آہستہ سے سرکایا۔اندر نظر ڈالی تو ٹھٹک کر جہاں تھا وہیں رہ گیا۔

کمرہ لمبائی' چوڑائی کے اعتبار سے ہال کی طرح کشادہ تھا۔دروازے کے عین مقابل داد محمد سومرو ایک چوڑے چکلے صوفے پر نہایت اطمینان سے بیٹھا تھا۔صوفے کے قریب جھلکتی ہوئی میز رکھی تھی۔میز پر اسکاچ وہسکی کی کھلی ہوئی بوتل تھی۔پانی سے بھرا ہوا شیشے کا جگ تھا' گلاس تھا جس کی وہسکی تھی۔اس وقت داد محمد سومرو کا چہرہ اور بھی زیادہ بھدا نظر آ رہا تھا۔سر کے بال جنگلی گھاس کی طرح کھڑے تھے۔وہ لمبا ریشمی گاؤن پہنے ہوئے تھا۔آنکھوں پر سیاہ رنگ کی چھوٹی سی دوربین لگائے ایک طرف دیکھ رہا تھا۔علیم نے مڑ کر اس سمت نگاہ دوڑائی۔

سامنے دیوار سے پیٹھ لگائے ایک دلکش اور طرح دار لڑکی کھڑی تھی۔اس کے جسم پر نام کو لباس نہ تھا۔آنکھوں میں پچھی رات کے ستارے جھلملاتے تھے۔رخساروں پر تازہ گلاب کھلتے تھے۔سرخ سرخ لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔مگر اس کے چہرے سے بے چینی صاف جھلکتی تھی۔ہلکی ہلکی نیلگوں روشنی میں اس کا برہنہ جسم بلور کی طرح ترشا ہوا نظر آتا ہے۔ایک ایک عضو مچھلی کی مانند پھڑکتا تھا۔داد محمد سومرو ہاتھ ہلا کر اشارہ کرتا۔وہ کبھی جھک جاتی۔کبھی جسم موڑ لیتی کبھی تن کر کھڑی ہو جاتی۔

داد محمد سومرو کے ایک ہاتھ میں دوربین دبی تھی۔دوسرے کو ادھر ادھر ہلا کر ہدایت دیتا۔اسی ہاتھ سے رک رک کر گلاس اٹھاتا۔ وہسکی کی چسکی لگاتا۔کبھی مسکراتا' کبھی منہ بگاڑ کر ناگواری کا اظہار کرتا۔کبھی آڑا ہو جاتا کبھی ترچھا۔وہ دیوار کے قریب کھڑی ہوئی لڑکی کے سڈول جسم کو مختلف زاویوں سے دیکھ رہا تھا اور اپنی دھن میں ایسا مگن تھا کہ اسے علیم الدین کی موجودگی کا مطلق پتہ نہ چلا۔

علیم الدین سبزواری نے دروازے کی دہلیز پر کھڑے کھڑے سوچا کہ لڑکی واقعی غضب کی دلکش اور دل آرا ہے۔ہلکی ہلکی نیلی روشنی نے اس کے حسن و شباب کو اور نکھار دیا ہے۔کسی عشوہ طراز اور کافر ادا حسینہ کو دیکھنا ہو تو ایسی ہی ہلکی ہلکی نیلگوں روشنی میں دیکھا جائے اور دوربین آنکھوں پر لگا کر دیکھا جائے تو اس کے سڈول جسم کے زاویے اور خطوط کچھ اور ہی تاثر پیدا کرتے ہوں گے۔

علیم اس فتنہ ساماں کی ڈھٹائی سے ابھی لطف اندوز ہو ہی رہا تھا کہ اچانک وہ مڑی۔اس کی نگاہیں دروازے کی سمت پہنچیں۔ اس نے پریشان ہو کر علیم الدین سبزواری کو دیکھا۔اس کے چہرے پر گھبراہٹ اور وحشت طاری ہو گئی۔حلق سے چیل کی سی تیز آواز نکلی۔بدحواس ہو کر آگے بڑھی اور بھاگ کر غڑپ سے داد محمد سومرو کے صوفے کی اوٹ میں گم ہو گئی۔

سومرو نے آنکھوں سے لگائی ہوئی دوربین ہٹائی۔حیرت زدہ ہو کر سامنے کھڑے ہوئے علیم الدین کو دیکھا۔پریشان ہو کر

آنکھیں پٹ پٹائیں۔ نشے میں ڈوبی ہوئی بوجھل آواز میں بولا۔ ''یہ تو کوئی مانٹرو معلوم ہوتا ہے۔ ہاں کوئی مانٹرو ہی ہے۔ مگر مسی تو نہیں لگتا۔ یہ تو کوئی اور ہے۔'' وہ آنکھیں پھاڑے حیران و پریشان نظروں سے علیم کی جانب گھورتا رہا۔ ''کون ہو تم؟'' اتنا کہہ کر وہ نشے سے جھوم کر ذرا سا آگے جھک گیا۔

علیم نے اس قدر سرخوشی کے عالم میں اسے دیکھا تو ساری گھبراہٹ اور پریشانی جاتی رہی۔ نڈر ہو کر بولا۔ ''میں وہ ہوں جسے آپ پہچان کر بھی پہچان نہیں رہے ہیں۔'' وہ بڑھ کر سامنے آ گیا۔

داد محمد سومرو جیسے ٹین کے خالی پیپے کے اندر اتر گیا۔ بطخ کی طرح قیں قیں کر کے ہنسنے لگا۔ لہرا کر گویا ہوا۔ ''اوہو ہو تم وہ ہو جسے پہچان کر بھی پہچان نہیں رہا ہوں۔ بات تو کچھ ٹھیک ہی معلوم ہوتی ہے۔ لگتا ہے تم کو پہلے بھی دیکھا ہے۔'' پھر اچانک چونک کر اس نے پوچھا۔

''مگر تم یہاں آئے کیسے؟''

''اگر آپ کو کوئی اعتراض ہے تو میں اس دروازے سے آ جاؤں جس سے کمرے کے اندر آنا چاہیے۔'' علیم بدستور غیر سنجیدہ بنا رہا۔

''کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ وہ چور دروازہ کون سا ہے اور کس طرف ہے؟''

''میں پوچھتا ہوں' تم کو کس نے یہاں آنے کی اجازت دی۔'' اس دفعہ داد محمد سومرو نے گرجدار آواز میں کہا۔ ''تم کو میرے ملازم نے روکا کیوں نہیں؟ میں نے اسے سختی سے منع کر دیا تھا کہ کسی کو اندر داخل نہ ہونے دیا جائے۔''

علیم ذرا مرعوب نہ ہوا۔ ڈھٹائی سے بولا۔ ''آپ کا ملازم بڑا نمک حلال ہے۔ اس نے مجھے بڑے دروازے میں داخل ہونے کی کسی طرح اجازت نہیں دی۔ البتہ وہ کھڑکی بتا دی جسے پھاند کر میں یہاں تک پہنچ گیا۔

داد محمد نے جھنجلا کر اسے دیکھا۔ گلاس اٹھا کر منہ سے لگایا اور غٹا غٹ چڑھا گیا۔ علیم نے موقع غنیمت جانا۔ آگے بڑھا اور اطمینان سے ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ اب دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ داد محمد نے گلاس میز پر رکھ کر علیم کو تیکھی نظروں سے دیکھا۔ لیکن قبل اس کے کہ وہ کچھ کہے علیم نے صوفے کی آڑ سے نظر آنے والی لڑکی کی برہنہ ٹانگ کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ان محترمہ سے کہیے کہ اپنے جسم کو اچھی طرح چھپا لیں۔ ان کی یہ باہر نکلی ہوئی ٹانگ اچھی نہیں لگتی یا پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سامنے آ کر اطمینان سے بیٹھ جائیں۔'' لڑکی نے فوراً اپنی ٹانگ سمیت کر صوفے کی آڑ میں کر لی۔

داد محمد سومرو تیوری پر بل ڈال کر غصے سے بولا۔ ''تم اس کے بارے میں اس طرح بات نہیں کر سکتے۔ وہ تمہارے سامنے کیسے آ

سکتی ہے؟ اس کے بدن پر کچھ بھی نہیں ہے۔ میں نے ایک ایک کپڑا اتروالیا تھا۔ وہ اس حالت میں تمہارے سامنے کس طرح آ سکتی ہے؟''

علیم نے ہنس کر بے تکلفی سے کہا۔ ''بالکل اسی طرح جیسے وہ آپ کے سامنے آ سکتی ہے۔''

''میرے سامنے؟'' سومرو بھنا کر بولا۔ ''یعنی تم میرے بارے میں کہہ رہے ہو۔ جانتے ہو میں اسے کراچی سے اپنے ساتھ لایا ہوں۔ صرف آج رات کے لیے پانچ سو روپے دیئے ہیں' پورے پانچ سو۔''

''کوئی بات نہیں' پانچ سو روپے اور دے دیجئے۔''

''کیوں دے دوں' کس لیے دے دوں؟'' اس دفعہ وہ زور سے دھاڑا۔

''دیکھئے اس قدر خفا ہونے کی ضرورت نہیں۔'' علیم نے نرم لہجے میں کہا۔ ''میں آپ کا مہمان ہوں اور آپ تو بہت مہمان نواز واقع ہوئے ہیں۔'' وہ زیر لب مسکرایا۔ ''ایک شو تو ہو چکا۔ سیکنڈ شو کے لیے میرا ٹکٹ بھی لے لیجئے۔ صرف پانچ سو روپے کی تو بات ہے۔ آپ کے ایسے خاندانی رئیس کے لیے تو یہ بہت معمولی رقم ہے۔''

داد محمد سومرو کچھ نہ بولا۔ اس نے گلاس میں وہسکی انڈیلی۔ جگ اٹھا کر پانی ڈالا۔ پیگ بنایا اور گلاس اٹھا کر منہ سے لگایا۔ وہسکی کا ایک بڑا گھونٹ بھرا۔ نظریں اٹھا کر علیم کو دیکھا۔ نفرت سے منہ بگاڑ کر بولا۔ ''تم ابھی تک یہاں بیٹھے ہو۔ فوراً باہر نکل جاؤ۔'' اس کی ابھری ہوئی بڑی بڑی آنکھیں غصے سے اور خوفناک ہو گئیں۔

''مجھے معلوم تھا' آپ یہی کہیں گے۔ لیکن آپ نے یہ نہیں سوچا کہ جو شخص اتنی رات گئے کھڑکی پھاند کر یہاں آ سکتا ہے اس آسانی سے کیسے نکل سکتا ہے۔''

''پھر تم کس طرح یہاں سے جاؤ گے؟''

''جس طرح میرا دل چاہے گا۔'' علیم نے نہایت ڈھٹائی سے جواب دیا۔

داد محمد سومرو غصے اور نفرت سے سرخ پڑ گیا۔ وہ ہانپنے کے سے انداز میں' زور زور سے سانس بھرنے لگا۔ علیم بغور اس کے ہاتھ کی جانب دیکھتا رہا کہ اگر وہ گلاس اٹھا کر مارے تو اپنا سر صرف بچا لے۔

باہر چھما چھم بارش ہو رہی تھی۔ ہوا میں شوریدہ سری تھی۔

کمرے میں خاموشی تھی۔ اچانک کوئی زور سے چیخا۔ ''باپ رے باپ' مار ڈالا سالے نے۔''

دونوں نے سراسیمہ ہو کر اس طرف دیکھا۔ پردے کے پیچھے سے ایک شخص اپنا بازو سہلاتا ہوا نکلا اور سامنے آ گیا۔ اس کا قد اونچا تھا۔ جسم مضبوط اور گٹھا ہوا تھا۔ ننگے بدن پر خوب تیل چپڑا ہوا تھا۔ وہ بار بار دونوں کو دیکھ رہا تھا اور اپنا بازو سہلا رہا تھا۔ نہ وہ حیران تھا نہ پریشان۔ نہایت اطمینان سے کھڑا تھا۔ اس کا تیل سے چپڑا ہوا بدن روشنی میں چمک رہا تھا۔

داد محمد سومرو چند لمحے تو سہما ہوا خاموش بیٹھا رہا۔ پھر اس نے اٹکتے ہوئے پوچھا۔ ''تم کون ہو؟''

''میرا نام بھورے خان ہے۔''

''بھورے خان کے بچے' میں پوچھتا ہوں تم یہاں کیسے آئے؟ کس لیے آئے؟'' داد محمد نے ڈپٹ کر کہا۔

''صاف بات یہ ہے کہ آیا تو میں چوری کی نیت سے تھا۔'' بھورے خان نے صاف گوئی سے بتایا۔ ''میں آپ سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔''

''تو چوری کے لیے یہاں آیا تھا؟''

''میں نے آپ کی تجوری بھی کھولی تھی۔'' بھورے خان نے نہایت اطمینان سے کہا۔ ''یہ ہاتھ دیکھ رہے ہیں آپ۔'' اس نے دونوں ہاتھ سامنے کر دیے۔ ''کیسا بھی تالا ہو یوں چٹکی بجاتے ان ہاتھوں سے کھول لیتا ہوں۔ ایسے مانے ہوئے استاد سے یہ ہنر سیکھا کہ بڑے بڑے نامی گرامی کاریگر ان کے سامنے کان پکڑتے تھے۔ ایسی دھاک بیٹھی تھی کہ خدا جھوٹ نہ بلوائے' ان کے پیشاب سے چراغ جلتا تھا۔''

''بند کر اپنی بکواس'' داد محمد سومرو تلملا کر زور سے گرجا۔ ''میں تجھے جیل میں بند کرا دوں گا۔''

''ارے ارے' آپ اس قدر خفا کیوں ہو رہے ہیں۔ میں نے تجوری میں سے کچھ اٹھایا ہو تو قسم لے لیجیے۔'' بھورے خان نے مسکین سی صورت بنا کر سادگی سے کہا۔ ''اس میں دھرا ہی کیا تھا۔ جنے کیا الم غلم بھرا تھا۔ عورتوں کی تصویریں تھیں۔ ایک دم ننگی ننگی۔ دوائیوں کی چھوٹی بڑی شیشیاں تھیں۔ انجکشن لگانے کی سرنج تھی۔ یہ بڑی سی۔''

اس کی باتیں سن کر علیم الدین سبزواری کو بے ساختہ ہنسی آ گئی۔

داد محمد نے علیم کی جانب کوئی توجہ نہ دی۔ قہر آلود نظروں سے بھورے خان کو دیکھا۔ ''نکل جا یہاں سے بدمعاش'' وہ غصے سے پیچ و تاب کھا رہا تھا۔

''آپ تو خوامخواہ ناراض ہو رہے ہیں۔'' بھورے خان نے اطمینان سے کہا۔ ''میں تو یہاں سے بہت پہلے ہی چلا جاتا۔ وہ تو عین

موقع پر آپ کمرے کے اندر آ گئے۔ میں گھبرا کر پردے کے پیچھے چھپ گیا۔ پھر جو آپ نے آنکھوں پر دوربین لگا کر تماشا شروع کیا۔ قسم اللہ کی' جوانی کا مزہ آ گیا۔ مگر کسی کیڑے نے ایسا کاٹا کہ اب تک کھجلی ہو رہی ہے۔" اس نے اپنا بازو سامنے کر دیا جس پر سرخ سرخ دھبے صاف نظر آ رہے تھے۔ "یہ دیکھئے' سالے نے کیسا کاٹا ہے۔"

"فضول کی بکواس نہ کر اور فوراً یہاں سے نکل جا۔" داد محمد نے ایک بار پھر اس کو ڈانٹا۔ مگر بھورے خان چپ چاپ اپنی جگہ پر کھڑا رہا اور برابر سہلاتا رہا' کھجاتا رہا۔ داد محمد سومرو غصے سے دوبارہ برسنے ہی والا تھا کہ بھورے خاں بول پڑا۔ "خفا نہ ہوں' میں ابھی چلا جاؤں گا۔ ذرا سی دارو پینے کو مل جائے۔ کئی روز سے ایک گھونٹ نہیں ملی۔" اس نے للچائی ہوئی نظروں سے میز پر رکھی ہوئی وہسکی کی بوتل دیکھی۔ "اصل ولایتی معلوم ہوتی ہے۔ صاحب' آپ کی بھی کیا بات ہے۔ گلاس پر گلاس چڑھا گئے اور ویسے کے ویسے ہی بیٹھے ہیں۔" وہ بے تکلفی سے مسکرایا۔ "اجازت ہو تو لگا لوں دو گھونٹ؟ قسم اللہ کی دل بری طرح مچل رہا ہے۔"

علیم الدین اب خاموش نہ رہ سکا۔ کہنے لگا۔ "تم خواہ مخواہ انتظار کر رہے ہو۔ اٹھاؤ بوتل اور شروع ہو جاؤ۔"

بھورے خاں کچھ نہ بولا۔ آگے بڑھا۔ بوتل اٹھائی اور گلاس بھی اٹھا لیا۔ مڑ کر علیم کی جانب دیکھا۔ علیم نے اشارے سے اسے اپنے پاس بلا لیا۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا قریب پہنچا اور برابر کے صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس نے گلاس کی وہسکی انڈیلی۔ اسے اٹھا کر منہ سے لگایا اور ایک ہی سانس میں خالی کر دیا۔

"تم دونوں فوراً یہاں سے نکل جاؤ۔" سومرو غصے سے چیخا۔

"دیکھئے' مسٹر سومرو! زیادہ جوش نہ دکھایئے۔" علیم نے سنجیدگی سے کہا۔ "یہ شخص جو میرے نزدیک بیٹھا مزے سے وہسکی پی رہا ہے۔ اس کی انگلیاں لوہے کی تجوری توڑ دیتی ہیں۔ آدمی کا سر تو یہ اس قدر آسانی سے توڑ سکتا ہے جیسے اخروٹ کے اندر سے گری نکالی جاتی ہے۔"

وہ جھنجھلا کر بولا۔ "معلوم ہوتا ہے' تم اس کے ساتھی ہو۔"

"جی نہیں' میں اخبار ندائے وطن کا ایڈیٹر ہوں۔" علیم نے اپنا تعارف کرایا۔

داد محمد سومرو نے چونک کر علیم کو دیکھا۔ یقین نہ آنے کے انداز میں بولا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"یہ ایسے ہی ہو سکتا ہے' جیسے آپ دیکھ رہے ہیں۔"

اسی وقت لڑکی نے صوفے کی آڑ سے ہلکی سی آہ بھری۔ اکڑوں بیٹھے بیٹھے اس کا جسم اینٹھنے لگا تھا۔ اس نے بے چین ہو کر پہلو

بدلا۔اس کی پیٹھ کا بالائی حصہ روشنی میں آ گیا تھا۔ہلکی نیلی روشنی میں اس کی اجلی اجلی جلد پھولوں کی مانند نرم اور گداز معلوم ہو رہی تھی۔

علیم الدین سبزواری نے اسے نظر بھر کر دیکھا۔داد محمد سومرو کو مخاطب کیا۔"مسٹر سومرو! ہم لوگ باتوں میں ایسے الجھے کہ بالکل بھول گئے یہاں کوئی اور بھی موجود ہے۔"

"یہاں اور کون موجود ہے؟" اس نے حیرت سے منہ پھاڑ کر پوچھا۔

"ذرا اپنے صوفے کے پیچھے مڑ کر دیکھئے۔"

"اچھا' اچھا' تم شیریں کی بات کر رہے ہو۔" وہ بے تکلفی سے مسکرایا۔مگر فوراً منہ بگاڑ کر بولا۔"تم اس کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"ابھی بتاتا ہوں۔" علیم اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ایک دروازے کی جانب بڑھا۔اس کا پردہ جھٹکا مار کر علیحدہ کیا۔مڑا اور داد محمد کے قریب پہنچ کر پردہ صوفے کے پیچھے پھینکا۔شیریں سے کہا۔"لو! اسے بدن پر لپیٹ لو۔" اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔"غسل خانہ ہی زیادہ نزدیک ہے۔اسی میں چلی جاؤ۔"

صوفے کی پشت پر ہلکی ہلکی سرسراہٹ ہوئی۔علیم الدین سبزواری پھر اپنے صوفے پر جا کر بیٹھ گیا۔

شیریں جسم کو پردے سے چھپائے ہوئے جھکی جھکی اٹھی اور غسل خانے کے دروازے کی جانب بڑھی۔دروازہ کھولتے ہوئے اس نے پلٹ کر سبزواری کی طرف دیکھا۔وہ اس وقت شوخی سے مسکرا رہی تھی۔اس کی خوبصورت آنکھوں میں سرِ شام نکلنے والے ستارے جھلملا رہے تھے۔وہ اسے خود فراموشی کے عالم میں دیکھتا ہی رہ گیا۔شیریں نے دروازہ کھولا اور غسل خانے کے اندر داخل ہو گئی۔دروازہ بند ہو گیا۔

داد محمد خاموش بیٹھا تھا۔بھورے خان سب سے بے نیاز وہسکی کی چسکی لگا رہا تھا۔

"آپ نے آج صبح ایک بیان جاری کیا تھا۔" سبزواری نے داد محمد سومرو کو مخاطب کیا۔"میں اس کے متعلق بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"یہ بھی کوئی سیاست پر بات کرنے کا وقت ہے۔"

"میرا خیال ہے یہی سب سے زیادہ موزوں وقت ہو سکتا ہے۔" علیم نے مسکرا کر کہا۔

"جی نہیں' میں اس وقت کوئی ایسی بات کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔"

علیم کچھ نہ بولا۔ نظر بھر کر داد محمد کو دیکھا۔ اس کا چہرہ جھنجھلاہٹ سے سرخ ہو رہا تھا۔ علیم الدین نے اس کی خفگی نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ''کہئے' آپ کا یورپ کا دورہ کیسا رہا؟''

''آپ ندائے وطن ہی کے تو ایڈیٹر ہیں نا؟'' داد محمد نے دریافت کیا۔ ''کیا نام ہے آپ کا؟''

''علیم الدین سبزواری''

''سائیں سبزواری' مجھے آپ سے سخت شکایت ہے۔'' داد محمد کے چہرے سے جھنجھلاہٹ جاتی رہی۔ ''آپ کے اخبار نے تو میرے خلاف زبردست اسکینڈل کھڑا کر دیا تھا۔''

علیم الدین سبزواری اسے مرعوب کرنے کے لیے یہی بات یاد دلانا چاہتا تھا۔ قصہ دراصل یہ تھا کہ داد محمد سومرو جس زمانے میں فرانس میں تھا انہی دنوں ''ندائے وطن'' میں ایک سنسنی خیز خبر شائع ہوئی تھی۔ خبر پیرس کے ایک مشہور نائٹ کلب کی ایک اطالوی نژاد کیبرے ڈانسر کے بارے میں تھی جسے پراسرار طور پر قتل کر دیا گیا تھا۔ پیرس کی پولیس بھاگ دوڑ اور تمام کوششوں کے باوجود نہ تو قتل کے اسباب کا سراغ لگا سکی تھی اور نہ کسی مشتبہ شخص کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہو سکی تھی۔ مقامی اخبارات میں اس پراسرار قتل کا بہت چرچا ہوا۔ مقتولہ کے بارے م یں پولیس نے معلومات حاصل کیں تو بہت سے رازہائے سربستہ افشا ہوئے۔ اس کے جن افراد سے مراسم تھے ان میں داد محمد سومرو کا نام بھی شامل تھا۔ یہ خبر لندن کے ایک انگریزی اخبار میں بھی نہایت تفصیل سے شائع ہوئی۔ یہ اخبار کسی طور علیم الدین سبزواری کے ہاتھ آ گیا۔ اس نے ''مکتوب پیرس'' بنا کر ندائے وطن'' میں نہ صرف نمایاں طور پر شائع کیا بلکہ اداریہ میں اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ پاکستان کے بعض بااثر اور صاحب حیثیت افراد یہ حیلہ تراش کر بیرونی ممالک کے دورے کرتے ہیں کہ وہاں زراعت کے جدید اور ترقی یافتہ طریقوں کا مشاہدہ کریں گے۔ نئی صنعتوں کے فروغ کے لیے ضروری معلومات حاصل کریں گے۔ مگر اس کے برعکس ہوتا یہ ہے کہ ان کی راتیں' نائٹ کلبوں' شراب خانوں' قمار خانوں اور عیاشی کے اڈوں میں گزرتی ہیں اور اس طرح عوام کے گاڑھے پسینے سے کمایا ہوا قیمتی زرمبادلہ بے دردی سے برباد کیا جاتا ہے۔ وطن عزیز کی عزت اور قومی وقار کو رسوا کیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں داد محمد سومرو کو خصوصیت کے ساتھ ہدف ملامت بنایا گیا تھا۔

علیم الدین جو ''ندائے وطن'' کا ایڈیٹر ہونے کے ساتھ ساتھ مالک بھی تھا' اس قسم کے اسکینڈل شائع کرنے کے معاملے میں خاصا مشہور تھا۔ ایسے ہی اسکینڈل اور سنسنی خیز خبروں کے ذریعے وہ ''ندائے وطن'' کو چلا رہا تھا۔ اس نے خبر کی اشاعت کے بعد اخبار کی ایک کاپی نہ صرف داد محمد کے منیجر کے پاس پہنچائی بلکہ اس کے بارے میں ٹیلیفون سے مطلع بھی کیا اور اطمینان سے نتیجے کا انتظار

کرنے لگا۔ نتیجہ حسب توقع خاطر خواہ نکلا۔ منیجر نے خبر پڑھتے ہی فوری طور پر ''ندائے وطن'' کے تراشے کے ساتھ داد محمد سومرو کو صورت حال سے آگاہ کیا۔ داد محمد سخت برہم ہوا۔ اپنے غم و غصے کا اظہار اس طرح کیا کہ ایک وکیل کے ذریعے علیم الدین کو نوٹس بھیجا کہ آٹھ روز کے اندر اندر خبر کی تردید شائع کی جائے اور غیر مشروط معافی مانگی جائے۔ ورنہ ہتک عزت کے الزام میں ''ندائے وطن'' کے خلاف دو لاکھ روپے ہرجانے کا مقدمہ دائر کیا جائے گا۔

نوٹس ملنے کے بعد علیم سبزواری ذرا مرعوب نہ ہوا۔ وہ تو چاہتا بھی یہی تھا۔ چنانچہ وکیل کو جواب بھیجنے کے بجائے اس نے نوٹس کی نقل اپنے اخبار میں شائع کر دی۔ ساتھ ہی سومرو کو للکارا کہ ''ندائے وطن'' کے خلاف بلا تاخیر قانونی کارروائی کی جائے۔ خبر کے صحیح اور مصدق ہونے کے سلسلے میں ضروری دستاویزی ثبوت عدالت میں پیش کر دیا جائے گا۔ اس سلسلے میں اس نے یہ دھمکی بھی دی کہ جلد ہی ''ندائے وطن'' میں مزید سنسنی خیز انکشافات کیے جائیں گے اور ان کی تائید میں دلچسپ اور اہم تصاویر کے ساتھ ان رقومات کے بل اور رسیدوں کا عکس بھی شائع کیا جائے گا جو سومرو نے اپنی عیاشی پر خرچ کی تھیں۔ حالانکہ علیم کے پاس نہ ایسی کوئی تصویر تھی نہ رسید تھی نہ بل تھا۔ مگر وہ سومرو کی کمزوری سے بخوبی آگاہ تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس دھمکی کے ساتھ ہی سومرو ہتھیار ڈال دے گا۔ ہوا بھی ایسا ہی۔ کچھ ہی روز بعد سومرو کا منیجر گھبرایا ہوا علیم کے پاس آیا۔ تین ہزار بطور رشوت دیئے اور داد محمد سومرو کی جانب سے معذرت بھی کی۔ علیم نے تردید شائع کر دی۔

یہ واقعہ اب پرانا ہو چکا تھا۔ مگر علیم الدین کو اب تک اس کی ایک ایک تفصیل یاد تھی۔ اس نے مسکرا کر داد محمد کو مخاطب کیا۔ ''مسٹر سومرو! اس قصے کو تو آپ نے وکیل کے ذریعے نوٹس دے کر خواہ مخواہ بڑھایا تھا۔''

''اس اسکینڈل سے میری بہت بدنامی ہوئی تھی۔'' داد محمد نے گلہ کیا۔

''لیکن میں نے اس کی تردید بھی شائع کر دی تھی۔'' سبزواری نے صفائی پیش کی۔

سومرو نے الجھنے کی کوشش نہ کی۔ ''آپ میرے پاس اب کس لیے آئے ہیں؟'' اس کے لہجے سے بیزاری عیاں تھی۔

''دراصل میں آپ کا انٹرویو لینا چاہتا ہوں تاکہ اس کی روشنی میں اس بیان پر مناسب اظہار خیال کیا جائے' جو آپ نے کل جاری کیا تھا۔'' علیم نے وضاحت کی۔ ''وہ بیان شائع کر دیا گیا ہے۔ آپ نے ''ندائے وطن'' میں دیکھا بھی ہو گا۔''

داد محمد سومرو نے کچھ نہ کہا۔ خاموشی سے اٹھا۔ لڑکھڑاتا ہوا الماری تک گیا۔ اسے کھولا۔ وہسکی کی نئی بوتل نکالی۔ گلاس نکالا۔ واپس آیا اور اپنی جگہ پر اطمینان سے بیٹھ گیا۔ اس نے بوتل کھولی۔ وہسکی گلاس میں ڈالی۔ پانی ملایا' گلاس اٹھایا اور ایک بڑا گھونٹ

بھرا۔

علیم خاموش بیٹھا رہا۔ چند لمحے بعد سومرو نے خود ہی گفتگو کا آغاز کیا۔ ''ہاں مسٹر'' وہ لمحہ بھر کے لیے اٹکا۔ ''کیا نام ہے آپ کا؟''

''علیم الدین سبزواری'' علیم نے مسکرا کر جواب دیا۔

''ہاں تو مسٹر اب میں آپ سے بات کرسکتا ہوں۔'' اس نے وہسکی کی چسکی لگائی۔ ''پوچھیں' کیا پوچھنا چاہتے ہیں آپ؟''

اب وہ نہایت خوشگوار موڈ میں نظر آ رہا تھا۔ چہرے پر چھائی ہوئی خشونت زائل ہو چکی تھی۔ خمار آلود آنکھوں میں ستارے جھلملا رہے تھے۔ اس وقت وہ ایسا چھوٹا موٹا گینڈا نظر آ رہا تھا جس کے سر پر کوئی سینگ نہ تھا۔

علیم الدین سبزواری نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا۔ ایک سگریٹ سلگائی۔ چند کش لگائے۔ نوٹ بک سنبھالی اور قلم انگلیوں میں دبا کر سوال کیا۔ ''پچھلی ربیع کی فصل پر آپ نے کتنے ہزار ٹن گندم سرحد پار بھجوائی؟''

''کیا مطلب؟'' داد محمد سومرو کا موڈ فوراً خراب ہو گیا۔ تیوری پر بل ڈال کر بولا۔ ''آپ اخبار کے ایڈیٹر ہیں یا خفیہ پولیس کے اہلکار؟''

''دیکھئے خفیہ پولیس تو ساری کی ساری کمیونسٹوں اور ایسے ہی دوسرے ملک دشمن عناصر کے خلاف لگا دی گئی ہے۔'' علیم نے اس کی خفگی نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ کو تو خفیہ پولیس سے ذرا بھی خطرہ نہ ہونا چاہیے۔ ویسے بھی وہ آپ کا کیا بگاڑ سکتی ہے۔ آپ تو محب وطن سیاست دان ہیں۔ نہایت معزز شہری ہیں۔''

''کیا آپ کے خیال میں' میں محب وطن اور معزز شہری نہیں ہوں۔'' اس نے تیکھی نظروں سے علیم کو دیکھا۔ ''کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ میں اسمگلر ہوں؟''

''یہ میری کہاں مجال کہ آپ کے متعلق ایسا خیال دل میں لاؤں۔ آپ تو ہر طرف سے محب وطن اور معزز شہری نظر آتے ہیں۔'' علیم نے نرم لہجے میں کہا۔ ''برسات کی اس بھیگی بھیگی رم جھم کرتی رات میں سراج کے اس عشرت کدے میں بیٹھ کر وہسکی سے شغل فرماتے ہیں اور پورے کپڑے پہن کر دوربین سے برہنہ جوانی کا نظارہ کرتے ہیں۔''

داد محمد سومرو اپنی گول گول آنکھوں سے علیم کو احمق کی طرح دیکھ رہا تھا۔

بھورے خان کو دونوں کو گفتگو سے مطلق دلچسپی نہ تھی۔ وہ صوفے کی پشت سے ٹیک لگائے خود میں مگن تھا۔ وہسکی سے بھرا گلاس ہاتھ میں تھامے کبھی اسے ہونٹوں سے چومتا کبھی گالوں سے لگاتا۔ کبھی روشنی کے سامنے کر کے اس کا رنگ دیکھتا اور آہستہ آہستہ وہسکی

کی چسکی لگاتا۔ وہ نہایت بے نیازی کے عالم میں اپنی علیحدہ دنیا بسائے ہوئے تھا۔

بارش کے قطرے کھڑکی کے شیشے پر ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔ رات بھیگ کر سرد ہو گئی تھی۔ سمر لاج کے باہر ہر سو اندھیرا تھا' ویرانی تھی' سناٹا تھا۔

''معاف کیجئے گا مسٹر سومرو۔'' علیم نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ ''میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ گندم اور ایسی ہی دوسری اشیاء سرحد پار بھیجنے کے بعد آپ کو کس قدر رقم مل جائے گی؟''

''آپ میرے خلاف مخبری کرنا چاہتے ہیں؟'' سومرو نے جل کر کہا۔

''آپ کو مغالطہ ہوا۔'' علیم نے سنجیدگی کا دامن ہنوز ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ ''میں تو یہ بات اس لیے جاننا چاہتا ہوں تاکہ یہ اندازہ لگا سکوں کہ الیکشن پر آپ کتنی رقم صرف کر سکیں گے۔ سنا ہے کہ آپ نے نہ صرف ربیع کی پیداوار بلکہ خریف کی فصل کی تمام کپاس صرف اسی مقصد کے لیے وقف کر دی ہے۔ کیا یہ اطلاع درست ہے؟''

''یہ بات' میں آپ کو ہرگز نہیں بتاؤں گا۔'' داد محمد سومرو نے بگڑ کر کہا۔ ''آپ بہت خطرناک آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ اپنے اخبار میں کوئی نیا اسکینڈل بنا کر چھاپ دیں گے۔''

علیم کھلکھلا کر ہنسا۔ ''آپ اس قدر برا مان رہے ہیں تو میں ہرگز ایسی بات نہیں پوچھوں گا۔'' اس نے نظر بھر کر سومرو کی جانب دیکھا۔ ''آپ سندھ کے بہت بڑے زمیندار ہیں۔ یہ تو آپ کو علم ہو گا کہ آپ کی زمینداری کتنے ہزار ایکڑ پر مشتمل ہے۔''

داد محمد سومرو کچھ دیر خاموش بیٹھا غور کرتا رہا پھر بیزاری سے بولا۔ ''سائیں' صاف بات یہ ہے کہ مجھے اس بارے میں کچھ پتہ نہیں۔ ایسی باتیں ہمارے منیجروں اور منشیوں کے جاننے کی ہوتی ہیں۔ آخر ان کو تنخواہ کس بات کی دی جاتی ہے۔''

''بالکل درست فرمایا آپ نے۔'' علیم نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ ''میں پوچھ سکتا ہوں کہ فصلوں کی بٹائی اور طرح طرح کے ٹیکسوں کی صورت میں ہر سال ہاریوں سے آپ کتنی رقم وصول کر لیتے ہیں؟''

''یہ بات بھی منیجروں اور کمداروں ہی کو معلوم ہو گی۔ میں نے کبھی یہ جاننے کی کوشش نہیں کی۔''

''معاف کیجئے۔ اس دفعہ بھی مجھ سے غلطی ہو گئی۔ آپ تو عام طور پر کراچی میں رہتے ہیں۔ آپ کو یہ تفصیلات کیوں معلوم ہونے لگیں۔'' علیم نے سوال کیا۔ ''مگر یہ تو معلوم ہو گا کہ آپ کی زمینداری میں کتنے گوٹھ اور گاؤں ہیں۔ ان میں کتنے لوگ آباد ہیں؟''

''یہ بات تو دفتر مال کے ریکارڈ سے معلوم ہو گی اور مردم شماری کرنے والوں کو اس کا پتہ ہو گا۔''

دادمحمد سومرو نے علیم کو بتایا۔ ''ایسی اطلاعات تو مختیار کار' گرداور اور پٹواریوں کے پاس ہونی چاہئیں۔''

علیم الدین سبزواری ٹھٹھا مار کر ہنسا۔ ''بہرحال' آپ کو یہ تو پتہ ہوگا کہ آپ کی اولادیں کتنی ہیں؟'' دادمحمد سومرو بھی ہنسنے لگا۔ نشے سے جھوم کر بولا۔ ''سائیں ان کی تعداد بھی ان کی ماؤں کو معلوم ہوگی۔'' اس نے نوجوانوں کی طرح سینہ تان کر بڑے فخر سے علیم الدین کو دیکھا۔

''آپ کی بیگمات کتنی ہیں؟''

علیم کی بات سن کر دادمحمد سومرو دیر تک ہنستا رہا' پھر اس نے گلاس اٹھا کر وسکی کا بڑا گھونٹ بھرا۔ ہاتھ اٹھا کر بھیگی ہوئی مونچھوں کو صاف کیا۔ بے نیازی سے بولا۔ ''ان کی تعداد تو مولوی ثناء اللہ لاشاری کے رجسٹر میں درج ہوگی جو نکاح پڑھاتا ہے اور طلاق دلواتا ہے۔ میں اسی کام کے لیے اسے تنخواہ بھی دیتا ہوں۔ ویسے تو وہ میرے گوٹھ کی مسجد کا ملا ہے۔

دونوں اس زور سے ٹھٹھا مار کر ہنسے کہ شیریں ہوکر غسل خانے کے دروازے سے جھانکنے لگی۔ دونوں کچھ دیر تک بے تکلفی سے ہنستے رہے۔

علیم نے مڑکر غسل خانے کی جانب دیکھا۔ دروازہ اب بند ہو چکا تھا۔ اس نے دادمحمد سے دریافت کیا۔ ''شکاری کتوں پر ہر سال کتنی رقم خرچ ہو جاتی ہوگی؟''

''سائیں' تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔'' دادمحمد نے منہ بگاڑ کر کہا۔ ''اس طرح کا حساب کتاب تو میرا منشی رکھتا ہے۔'' اس نے قدرے تامل کیا۔ ''ہاں' خوب یاد آیا۔ پچھلے سال میں نے پچاس ہزار روپے خرچ کر کے اپنے کتوں کے لیے بہت شاندار ڈاگ ہاؤس بنوایا تھا۔ اس کا نام ایک شاعر نے سگ لیلیٰ رکھا ہے۔ پسند آیا؟ اسے دیکھے گا تو دل خوش ہو جائے گا۔ میرے پاس ایک سے ایک اعلیٰ نسل کا کتا ہے۔ سو سے اوپر ہی ہوں گے۔ ہمیشہ کتوں کی دوڑ میں جیتتے ہیں اور جب ان کو لڑاتا ہوں تو شیر کی طرح جھپٹ جھپٹ کر حملہ کرتے ہیں۔'' اس کا وسکی کا گھونٹ بھرا۔ ''آپ نے کبھی کتوں کی لڑائی دیکھی ہے؟ ہزاروں روپے کی شرطیں لگائی جاتی ہیں۔''

''بہت خوب' کتوں کے معاملے میں آپ کا ذوق بہت بلند معلوم ہوتا ہے۔'' علیم نے مسکرا کر تبصرہ کیا۔ ''ویسے مسٹر سومرو' آپ کے کتے بھی بڑے باذوق ہوں گے۔ کھانے کے کمرے میں کرسیوں پر بیٹھ کر نہایت سلیقے سے راتب نوش فرماتے ہوں گے۔

راہداریوں میں چہل قدمی کرتے ہوں گے۔ ڈرائنگ روم میں صوفوں پر بیٹھ کر سیاست پر تبادلہ خیال کرتے ہوں گے۔"

"نا سائیں! آپ کی یہ بات اپنی سمجھ میں نہیں آئی" داد محمد نے منہ بگاڑ کر اپنے ردعمل کا اظہار کیا۔ "کتے اور سیاست پر بات کریں۔ یہ کیسے ہوسکتے ہے؟ سائیں! وہ تو کتے ہوتے ہیں۔"

"معاف کیجئے، میں غلطی سے یہ سمجھ بیٹھا کہ اعلیٰ نسل کے باذوق کتے سیاست پر بھی بات کرسکتے ہیں۔ آپ کہتے ہیں تو مانے لیتا ہوں۔ ورنہ میرا خیال ہے کہ وہ ضرور سیاست پر گفتگو کرتے ہوں گے۔ قومی مسائل کو آپ کے اصیل کتوں سے زیادہ اور کون بہتر طور پر سمجھ سکتا ہے۔" اس نے گفتگو کا رخ بدلتے ہوئے پوچھا۔ "یہ فرمایئے آپ نے بلیاں کتنی پال رکھی ہیں؟"

"بلیاں" داد محمد سومرو نے تیوری پر بل ڈال کر تیکھے لہجے میں کہا۔ "جی میں ایسی علت نہیں پالتا۔ ایک بار کسی نے تحفے میں ایک سیامی بلی پیش کی تھی۔ مگر وہ تو مدت ہوئی مرکھپ گئی۔"

"کسی شاعر نے اس کی تاریخ وفات بھی کہی ہوگی۔"

"جی نہیں" اس نے منہ بگاڑ کر اپنی بیزاری کا اظہار کیا۔ "میں شاعروں واعروں سے میل ملاپ نہیں رکھتا۔"

"آپ کتے پالتے ہیں۔ شاعروں کی پرورش نہیں کرتے؟"

"نا سائیں! میں ایسا کام نہیں کرتا۔ ہاں مرغ ضرور پالتا ہوں۔ اور لمبی لمبی شرط لگا کر ان کو لڑاتا ہوں۔ آپ میرے ساتھ گوٹھ چلیں۔ ادھر اسی ہفتے مرغوں کی زبردست پالی ہوگی۔ میرے ایک مرغ پر پچیس ہزار کی شرط لگی ہوئی ہے۔" اس نے مسکرا کر بتایا۔

"مرغ لڑانے کا مجھے ہمیشہ سے شوق ہے۔ یہ میری ہابی ہے۔"

"ہاریوں کی بیٹیاں اور نوجوان بیویاں اٹھوانا بھی آپ کا محبوب مشغلہ ہوگا۔"

داد محمد سومرو نے علیم الدین سبزواری کو تیکھی نظروں سے دیکھا۔ مگر خاموش رہا۔

علیم الدین سبزواری ذرا دیر کے لیے سنجیدہ ہوگیا۔ "تو گویا مسٹر سومرو! آپ نے الیکشن لڑنے کی تیاریاں شروع کردی ہیں۔"

"جی ہاں! اب میں غیر ملکی دورہ کرنے کے بعد واپس آ گیا ہوں۔" سومرو نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ "الیکشن لڑنے کا کام میں نے شروع کردیا ہے۔" اس نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "ویسے الیکشن میں اب چھ سات ہی مہینے تو رہ گئے ہیں۔"

"یورپ آپ ووٹوں کی گنتی میں الٹ پھیر اور بیلٹ بکس توڑنے کے جدید طریقے معلوم کرنے گئے تھے؟"

"جی نہیں۔" اس کی آواز میں جھنجلاہٹ تھی۔ "آپ ایسی بات نہ کریں۔"

''آپ کہتے ہیں تو ایسی بات نہیں پوچھوں گا۔'' علیم نے مسکرانے کی کوشش کی۔ ''مگر یہ تو پوچھ سکتا ہوں کہ اپنے حلقہ انتخاب کے حکام سے آپ نے ربط ضبط تو بڑھا ہی لیا ہوگا۔ معاف کیجئے یہ بات میں نے آپ ہی کے انٹرسٹ میں کہی ہے۔''

''سائیں! آپ ان کی فکر نہ کریں۔ اپنی پہنچ بہت اوپر تک ہے۔ گورنر سے صدر مملکت تک سب ہی میری شکارگاہ میں ہر سال شکار کھیلنے آتے ہیں۔ کئی کئی دن مہمان رہتے ہیں۔ ویسے ضلع کے سارے ہی افسران سے ہمیشہ ہی اپنا اچھا میل ملاپ رہا ہے۔'' داد محمد سومرو نے اپنی بات پر زور دے کر کہا۔ ''سائیں' سچ پوچھیں تو انہیں ساتھ ملائے بغیر الیکشن جیتنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ سب کچھ کرا سکتے ہیں۔ غلط کہہ رہا ہوں میں؟''

''بالکل درست فرمایا آپ نے۔'' علیم نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ ''میں تو آپ کو یہ مشورہ دوں گا' ہو سکے تو ڈپٹی کمشنر یا ایسے ہی کسی بڑے افسر کو نئی ماڈل کی کار ضرور پیش کریں۔ اس سے فائدہ یہ ہوگا کہ وہ اسے ہر وقت آپ کی یاد دلاتی رہے گی اور دیکھئے افسروں کی بیگمات کو ہرگز نہ بھولیے گا۔ ان کی خوشنودی کرنے کے لیے قیمتی تحائف پہنچاتے رہیں۔''

داد محمد نے اس کی تجویز سے اتفاق کیا۔ ''ان کے لیے تو میں لندن سے ڈھیر سارے تحفے لایا ہوں۔ پرفیوم اور میک اپ کا سامان تو تین سوٹ کیس بھر کر لایا ہوں۔ ساڑھیاں اور دوسرے کپڑے لتے اس کے علاوہ ہیں۔''

''تیاری تو آپ نے بہت اچھی کر رکھی ہے۔'' علیم نے مسکرا کر داد محمد کو دیکھا۔ ''عوام کو خوش کرنے کے بارے میں بھی آپ نے کچھ سوچا؟''

''عوام! وہ تو سائیں ایک دم الو کے پٹھے ہوتے ہیں۔ ان کو تو خواہ مخواہ ووٹر بنا دیا۔ بھلا ان کا حکومت سے کیا ناتا۔''

''ویسے میرا ذاتی خیال بھی یہی ہے۔'' علیم الدین سبزواری نے اپنی بات پر اڑنے کی مطلق کوشش نہیں کی۔ ''سچ پوچھئے تو یہ جمہوریت وموریت سب فراڈ ہے۔'' وہ بے تکلفی سے کھلکھلا کر ہنسا۔ ''یہ تو عوام کو بیوقوف بنانے کا چکر ہے۔''

داد محمد اس بار خاموش رہا۔ اس نے خالی گلاس میں وہسکی ڈالی۔ پانی ملایا اور ہونٹوں سے لگا کر آہستہ آہستہ چسکی لگانے لگا۔

''الیکشن سے پہلے باقاعدہ منصوبہ بندی کر لیجئے گا۔'' علیم زیادہ دیر خاموش نہ بیٹھ سکا۔ ''مثلاً یہ کہ فی ووٹر کیا ریٹ مقرر کیا جائے۔ ان کے کھانے پینے اور نشے پانی کا کس طرح بندوبست کیا جائے۔ مخالف امیدواروں کو کس طرح جھوٹے مقدموں میں پھنسایا جائے۔ ان کے کارکنوں کے حوصلے پست کرنے کے لیے مسلح حملے کس کس موقع پر کئے جائیں۔ ہو سکے تو ایک آدھ کو قتل بھی کرا دیا جائے۔ مطلب یہ کہ ایسی دہشت گردی پھیلا دی جائے کہ دوسرے امیدواروں کے پولنگ ایجنٹ تک خوفزدہ ہو جائیں۔ آپ کے

بوگس ووٹ کو چیلنج کرنے کی ہمت نہ کرسکیں۔" اس نے قدرے توقف کیا۔ "اپنے غنڈوں اور کارندوں کی ٹریننگ تو آپ نے ابھی سے شروع کرادی ہوگی۔"

"سائیں! اپنے کو الیکشن کو بہت تجربہ ہے۔" داد محمد نے مسکرا کر بتایا۔ "اس دفعہ تو ایسے ایسے نئے طریقے استعمال کروں گا کہ آپ حیران رہ جائیں گے۔" اس نے گلاس اٹھا کر گھونٹ بھرا۔ "اب آپ سے کیا چھپانا' جس روز الیکشن کا اعلان ہوا اسی روز سے کام کرنے والوں کی بھرتی شروع کردی تھی۔ زبردست ٹیم بنائی ہے۔ ان کو ٹریننگ دینے کے لیے میں نے ایک علیحدہ بنگلہ دے رکھا ہے۔ کھانے کا' پینے کا' لیٹنے بیٹھنے کا ہر طرح کا انتظام ہے۔"

"یہ تفصیلات بتا کر تو آپ نے دل خوش کردیا ہے۔" علیم الدین سبزواری نے کہا۔ "میرا خیال ہے اس حلقہ انتخاب سے مسلم لیگ کا ٹکٹ تو آپ کو مل ہی جائے گا؟"

"کیا کہا' مجرم لیگ؟" بھورے خان نے مداخلت کی۔ "اماں' پھر تو الیکشن لڑنے کا ٹکٹ مجھے ملنا چاہیے ورنہ میں ایک ایک کی ایسی کی تیسی کردوں گا۔ میں نے آٹھ بار جیل کاٹی ہے' آٹھ بار۔ کیا سمجھے؟"

"تم کو ٹکٹ کیسے مل سکتا ہے؟" علیم الدین نے بھورے خان کو ڈانٹا۔ "تم' سومرو صاحب کا کیا مقابلہ کرسکتے ہو۔ دونوں کے درمیان بہت بڑا فرق ہے۔ تمہارا کام جیل جانا ہے اور ان کا کام جیل بھجوانا ہے۔"

"اماں' تم کو یہ بھی خبر ہے۔ میں شاہجہانپور کا رہنے والا ہوں۔" بھورے خان نے تڑپ کر جوش و خروش کا اظہار کیا۔ "پانچ قتل کئے ہیں اب تک' قتل ہی کے ایک مقدمے میں جیل کاٹ رہا تھا کہ فرار ہوکر ادھر آ گیا۔ سچ پوچھو تو پاکستان کی محبت کھینچ لائی۔"

علیم الدین نے اس کی بات پر کسی ردعمل کا اظہار نہ کیا۔ مڑا اور داد محمد سومرو کی جانب متوجہ ہوا۔ "مسٹر سومرو' جنگلی سور کے شکار میں پچھلے سال آپ کی بندوق سے کتنے آدمی ہلاک ہوئے؟ اس سال تو آپ یورپ کا دورہ کررہے تھے۔"

"چھ سات ہاری تو ایسی بیگار میں مرے ہوں گے۔" داد محمد سومرو نشے سے جھوم کر بولا۔ "مگر سائیں' آپ یہ بات کس لیے پوچھ رہے ہیں؟"

"یہ تو میں آف دی ریکارڈ پوچھ رہا ہوں۔" سبزواری نے اس کی بدگمانی رفع کرنے کی کوشش کی۔ "آپ اطمینان رکھئے' میں تھانے میں جاکر آپ کے خلاف رپورٹ درج نہیں کراؤں گا۔"

"ارے یار کرو ابھی دو گے تو میرا کیا بگاڑ لو گے؟" سومرو نے خمار آلود نظروں سے علیم کو دیکھا۔ "تھانیدار اپنا ہی آدمی ہے۔ جتنی

حکومت سے تنخواہ لیتا ہے اس کا دوگنا میں اسے ہر مہینے بھتہ دیتا ہوں۔ تم نے میرے خلاف کارروائی کرنے کی کوشش کی تو الٹا تمہارے خلاف کیس بنا دے گا۔"

"مجھے معلوم ہے بخوبی معلوم ہے۔ مگر یہ آپ کو ابھی پتہ چل جائے گا کہ میں آپ سے یہ بات کیوں پوچھ رہا تھا۔" علیم نے صفائی پیش کی۔ گردن گھما کر بھورے خان کو مخاطب کیا۔ "سن رہے ہو بھورے خان' چھ سات قتل اور وہ بھی صرف شکار کے سلسلے میں۔ یہ صرف ایک سال کا اسکور ہے۔"

"اور میں چوریاں جو کرتا ہوں' ڈاکے ڈالتا ہوں اور جانے کیا کیا کرتا ہوں۔ تم کو کیا پتہ میرے کتنے اور کیا کیا مال مسالہ ہے۔"

بھورے خان مرعوب نہ ہوا۔

"تم نے کبھی اللہ دینو کھوسو ڈاکو کا نام سنا ہے؟" علیم نے بھورے خان سے دریافت کیا۔

کیوں نہیں سنا' اماں اسے کون نہیں جانتا۔ وہ تو بڑا نامی گرامی ڈاکو ہے۔ اس سے تو پولیس والوں کی بھی ـــــــــــ" بھورے خان نے بھڑ سے گالی دی۔ "ایسا دھاکڑ ہے کہ پہلے سے اعلان کر کے ڈاکہ ڈالتا ہے۔" اس نے تامل کیا۔ "پتہ نہیں میرا یار ایکا ایکی کہاں غائب ہو گیا۔"

"مگر تم کو یہ نہیں معلوم کہ وہ سومرو کا پروردہ تھا۔ ہر واردات کے بعد سومرو صاحب کی حویلی ہی میں روپوش ہوتا تھا۔" علیم نے بھورے خان کو مطلع کیا۔ "وہ غائب وائب کہیں نہیں ہوا۔ ایک روز سومرو صاحب کی حکم عدولی کی۔ ایسے ناراض ہوئے کہ اسی وقت گولی سے اڑا دیا۔ لاش اس طرح ٹھکانے لگوائی کہ آج تک سراغ نہ ملا۔"

"اماں' تم کیا کہے رہے ہو؟ کھوسہ ڈاکو کو گولی سے اڑا دیا۔" بھورے خان نے حیران و پریشان ہو کر پہلے علیم کو دیکھا پھر داد محمد سومرو کو جو گلاس ہونٹوں سے لگائے وہسکی کی چسکی لگا رہا تھا۔

علیم نے بھورے خان کو ڈانٹا۔ "آئندہ ایسی بات زبان پر نہ لانا۔ تمہیں پتہ نہیں' سومرو اپنے علاقے کے بہت مشہور پتھارے دار ہیں۔ کتوں اور مرغوں کی طرح انہیں ڈاکو پالنے کا بھی شوق ہے۔ تم تو بہت معمولی قسم کے جرائم پیشہ ہو۔ فی الحال اپنی چونچ بند رکھو اور اطمینان سے شراب پیئو۔"

بھورے خان نے خاموشی سے اس کی بات سنی اور گلاس اٹھا کر وہسکی کا بڑا گھونٹ بھرا۔ نہ اس نے داد محمد سومرو کی جانب توجہ دی نہ علیم الدین سبزواری کو مڑ کر دیکھا۔

علیم نے داد محمد کو مخاطب کیا۔ ''مسٹر سومرو' آیئے اب آپ سے کچھ اور کام کی باتیں ہو جائیں۔''

''سائیں' آپ تو بہت دور بیٹھے ہوئے ہیں۔'' اس نے خمار آلود نظروں سے علیم کو دیکھا۔ ''میری آواز آپ سن رہے ہیں؟'' وہ چیخ چیخ کر بولنے لگا۔ ''اب تو آپ بالکل ٹھگنے نظر آ رہے ہیں۔ اتنے ذرا سے معلوم ہو رہے ہیں کہ مجھے دوربین لگا کر دیکھنا پڑے گا۔''

داد محمد سومرو' نشے میں مدہوش ہو کر بہکنے لگا تھا۔

علیم الدین سبزواری نے اس سرخوشی کے عالم میں اسے دیکھا تو مسکرا کر بولا۔ ''کچھ دیر بعد دیکھے گا تو میں مچھر بن کر اڑن چھو ہو جاؤں گا۔''

''کیا کہا؟ آپ مچھر بن کر اڑ جائیں گے۔'' داد محمد نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر علیم کو دیکھا۔ ''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

''ابھی آپ خود دیکھ لیجئے گا۔'' علیم نے اسے چھیڑا۔ ''اس طرح پھر سے اڑ جاؤں گا کہ آپ دیکھتے ہی رہ جائیں گے۔''

داد محمد سومرو' خوفزدہ ہو کر صوفے کے بازو سے چمٹ گیا۔ اب وہ نشے سے چور ہو چکا تھا۔ جسم بے قابو ہوتا جا رہا تھا۔ نظریں بھٹک رہی تھیں۔

بھورے خان کی بوتل خالی ہو چکی تھی مگر وہ ابھی سیر نہ ہوا تھا۔ مزید پینے کی خواہش رکھتا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور داد محمد کے برابر جا کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ داد محمد نے اس کی جانب کوئی توجہ نہ دی۔ وہ سہما ہوا بیٹھا رہا اور اپنی گول گول آنکھوں سے علیم الدین کو تکتا رہا۔

بھورے خاں نے پہلے اپنے گلاس میں وہسکی انڈیلی' پھر داد محمد کے گلاس میں ڈالی۔ جگ سے پانی ملایا۔ گلاس اٹھا کر منہ سے لگایا۔ گھونٹ بھر کر بولا۔ ''قسم اللہ کی' آج تو جوانی کا مزہ آ گیا۔ اصلی ولایتی ہے۔ جتنی پیو اتنا ہی زیادہ لطف آتا ہے۔'' اس نے خوب بڑا سا گھونٹ بھرا۔ نشے کی ترنگ میں گنگنانے لگا۔

یارو مجھے معاف کرو میں نشے میں ہوں

اس کی آواز بھونڈی اور کرخت تھی۔ وہ وہسکی کی چسکی لگا کر رہا تھا اور جھوم جھوم کر ایک ہی مصرعہ الاپ رہا تھا۔ علیم تو خاموش بیٹھا اسے نشے سے بہکتے ہوئے دیکھتا رہا' مگر داد محمد سومرو کو اس کا اس طرح بے سرے پن سے گنگنانا سخت ناگوار معلوم ہوا۔ اس نے آنکھیں پٹ پٹا کر بھورے خان کو دیکھا۔ ڈپٹ کر بولا۔

''بند کرا پنی یہ بکواس۔''

بھورے خان مطلق مرعوب نہ ہوا۔ مڑ کر سومرو کو دیکھا۔ بے تکلفی سے مسکرا کر گویا ہوا۔ "پیارے اتنا خفا کیوں ہو رہے ہو۔" اس نے دوسرا گلاس اٹھا کر داد محمد کی جانب بڑھایا۔ "لو ذرا سی لگا لو۔" اس نے دوسرا گلاس داد محمد کی نظروں کے سامنے ہولے ہولے ہلایا۔ "اماں، دیکھو تو کیسی سنہری پری کی طرح چھاچم جھلملا رہی ہے۔" بھورے خان جھوم جھوم گانے لگا۔

پی لے پی لے مورے راجہ

داد محمد سومرو کو اس کی بے تکلفی نہایت شاق گزری۔ اس نے جھنجلا کر ہاتھ مارا۔ گلاس چھلکا اور وہسکی کے چھینٹے صوفے پر ادھر ادھر بکھر گئے۔

بھورے خاں نے پھر بھی برا نہ مانا۔ ڈھٹائی سے ہنس کر بولا۔ "یار تو، تو بھتے سے اکھڑا جا رہا ہے۔ جان من! اتنا نخرا اچھا نہیں ہوتا۔ میری خاطر تھوڑی سی اور لگا لے۔"

داد محمد ایک دم بھڑک اٹھا۔ غصے سے دھاڑا۔ "تم دو ٹکے کے آدمی، تمہاری یہ جرات کہ تم ہمارے ساتھ بیٹھ کر شراب پیو۔ اٹھو، یہاں سے دور ہو جاؤ۔"

بھورے خاں گھبرا کر ہونق کی طرح اس کا چہرہ تکنے لگا۔ داد محمد نے اسے ڈانٹا۔ "تم ابھی تک یہاں بیٹھے ہو۔" وہ آنکھیں نکال کر اس کی جانب جھپٹا۔

بھورے خاں نے حیران و پریشان ہو کر ایک گلاس فوراً میز پر رکھا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے ہاتھ میں دبا ہوا گلاس ہونٹوں سے لگا کر تھوڑی سی وہسکی پی۔ خوشامد کرنے کے سے انداز میں گویا ہوا۔ "اماں اس قدر ناراض کیوں ہو رہے ہو؟ میں نے تم کو گالی تو نہیں دی۔ صرف تھوڑی سے لگانے ہی کو تو کہا تھا۔"

داد محمد سومرو بگڑ کر بولا۔ "تم الو کے پٹھے ہو۔"

بھورے خاں نے پھر بھی کسی خفگی کا اظہار نہ کیا۔ بے حیائی سے مسکراتا رہا۔

"سور کے بچے تم یہاں سے دور ہو جاؤ۔" داد محمد اور بھی زیادہ برہم ہو کر چیخا۔ "ایک لات ماروں گا یہاں سے وہاں تک لڑھکتے چلے جاؤ گے۔"

بھورے خاں ڈھیٹ بنا کر کھڑا رہا۔ اس کا گلاس اب ختم ہو چکا تھا۔ وہ جھکا اور بوتل کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ داد محمد نے جھٹ بوتل اٹھائی۔ قہر آلود نظروں سے گھور کر بولا۔ "یہ تمہارے باپ کا مال ہے۔ چور، حرامی، کتیا کا پلا۔"

بھورے خاں اچانک سنجیدہ ہوگیا۔ تیوری پر بل ڈال کر بولا۔ ''کیا کہا تم نے حرامی؟ یعنی میں حرامی ہوں۔ کتیا کا پلا ہوں۔ میری ماں کتیا تھی۔ تم نے میری مری ماں کو گالی دی ہے جو اتنی نیک تھی کہ سجدے میں اس کا دم نکلا تھا۔ ہائے میری اماں!'' وہ منہ بسور کر بھوں بھوں رونے لگا۔

علیم الدین سبزواری اطمینان سے بیٹھا آہستہ آہستہ سگریٹ کے کش لگاتا رہا اور دونوں کو نشے کے عالم میں بہکتے ہوئے دیکھتا رہا۔ عین اس وقت شیریں نے غسل خانے کا دروازہ کھولا۔ باہر نکلی۔ کھڑکی کے پردے سے جسم کو ڈھانپے ہوئے جھکی جھکی آگے بڑھی اور دبے دبے قدموں چلتی ہوئی داد محمد سومرو کے عقب میں پہنچی۔ آہستہ سے دروازہ کھولا اور کمرے کے اندر داخل ہو کر بند کر لیا۔

بھورے خاں منہ بسور بسور کر روتا رہا۔ داد محمد سومرو کو اس کا رونا نہایت گراں گزرا۔ ڈپٹ کر بولا۔ ''تم یہاں شور کیوں مچا رہے ہو؟ الو کے پٹھے' فوراً دفع ہو جاؤ۔''

بھورے خان نے رونا بند کر دیا۔ زبان سے ایک لفظ نہ نکلا۔ جھٹ اپنی گندی چیکٹ جانگیا میں اڑسا ہوا چاقو نکالا۔ اسے کھولا۔ چاقو کا تیز پھل' روشنی میں چاندی کے تار کی مانند جھلکنے لگا۔ چاقو دیکھ کر داد محمد سومرو گھبرا گیا۔ علیم بھی پریشان ہو گیا۔ معاملہ اب نازک صورت اختیار کرتا جا رہا تھا۔ بھورے خاں چاقو ہاتھ میں دبا کر داد محمد سومرو کی جانب بڑھا۔ علیم فوراً اپنی جگہ سے اٹھا۔ لپک کر بھورے خان کے قریب پہنچا اور جھپاک سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

بھورے خان نے مڑ کر علیم الدین سبزواری کی جانب دیکھا۔ اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی۔ بگڑ کر بولا۔ ''تم اس معاملے میں نہ بولو۔'' اس نے خونخوار نظروں سے داد محمد سومرو کو دیکھا۔ ''یہ سالا وڈیرا خود کو سمجھتا کیا ہے۔ اس نے میری ماں کو گالی دی ہے۔'' اس نے جھٹکا دے کر علیم کی گرفت سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ ''ایک ہی ہاتھ میں سالے کی انتڑیاں باہر نکال دوں گا۔''

وہ بپھر کر داد محمد پر جھپٹا' جو خوف سے آنکھیں پھاڑے' صوفے کی پشت سے چمٹا ہوا بیٹھا تھا۔ علیم نے ہمت سے کام لیا۔ بھورے خان کا بازو پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹا۔ نرم لہجے میں بولا۔ ''بھورے خان' میری بات تو سنو' اتنا غصہ کرنا اچھا نہیں ہوتا۔'' علیم اسے منانے لگا۔ ''آؤ میرے ساتھ اطمینان سے بیٹھ کر جتنی پینا چاہتے ہو پیو' کوئی مائی کا لال تم کو نہیں روک سکتا۔''

بھورے خان نشے سے جھوم رہا تھا۔ مگر اپنی جگہ سے نہ ہٹا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ ایک بار پھر بپھرا۔ ''اس سالے وڈیرے کو آسانی سے تو نہیں چھوڑوں گا۔ جنے کتنے ایسے طرم خاں دیکھے ہیں۔''

وہ چاقو سنبھال کر داد محمد کی جانب پلٹا۔ ''یہ بھی کیا یاد کرے گا کہ کوئی بھورے خان ملا تھا۔ تم کہتے ہو تو اسے جان سے نہیں ماروں

گا۔ مگر اس کا ایک کان تو ضرور کاٹوں گا۔ ساری ہیکڑی نکل جائے گی۔"

"غصہ تھوک دو۔" علیم نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "کان کاٹ کر کیا کرو گے؟"

"نہیں بڑے بھائی' یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔ اس کا ایک کان کاٹوں گا اور ابھی تمہارے سامنے کاٹوں گا۔ اسے لے جا کر اسپرٹ کی بوتل میں سنبھال کر رکھوں گا۔" بھورے خان اپنی ضد پر اڑا رہا۔ "جس سے اپنی چخ چخ جاتی ہے' اس سالے کا کان کاٹے بغیر نہیں چھوڑتا۔ تم کو جو بھی ایک کان کٹا ہوا ملے سمجھ لینا اس نے میرے ساتھ داؤں کیا تھا اور اس کا نتیجہ بھی بھگت لیا۔ دوسرے تو بدلہ لینے کے لیے ناک کاٹ لیتے ہیں' مگر میں نکٹے کے بجائے کن کٹا بنا دیتا ہوں۔"

"مگر یہ تو سوچو' اس کا انجام کیا ہوگا؟"

"ہوگا کیا' زیادہ سے زیادہ چھ مہینے کی سزا ہو جائے گی۔ پھانسی پر تو نہیں چڑھا دیا جاؤں گا۔" بھورے خاں نے نڈر ہو کر جواب دیا۔ "برسوں جیل کاٹی ہے' چھ مہینے کی اور کاٹ لوں گا۔ کیا فرق پڑتا ہے؟"

وہ ایک بار پھر داد محمد کی طرف چاقو اٹھا کر جھپٹا۔ علیم نے نہایت ہوشیاری سے اس کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف ہٹایا۔ داد محمد سومرو خوفزدہ ہو کر اور سکڑ گیا۔ وہ سخت ہراساں نظر آ رہا تھا۔ ادھر بھورے خان کا یہ عالم تھا کہ وہ کسی طور علیم کے قابو ہی میں نہ آ رہا تھا۔ نشے سے جھوم کر بار بار داد محمد پر جھپٹتا۔ علیم روکنے کی کوشش کرتا۔ بھورے خاں ایک بار بپھر کر داد محمد پر جھپٹا تو نشے کی جھونک میں خود کو سنبھال نہ سکا۔ لڑکھڑا کر دھڑام سے فرش پر گرا۔ کھلا ہوا چاقو ہنوز اس کے ہاتھ میں دبا تھا۔

داد محمد سومرو سے تھر تھرا رہا تھا۔ علیم الدین سبزواری بھی سہما ہوا تھا۔ اسے بھی خدشہ تھا کہ نشے کی دھن میں بھورے خاں کہیں چاقو سے اس پر وار نہ کر بیٹھے۔ مگر اس نے ہمت نہ ہاری۔ بھورے خاں کو سمجھا بجھا کر نرم کیا۔ میز پر رکھا ہوا وہ گلاس اٹھایا جس میں وسکی تھی۔ گلاس سنبھال کر بھورے خاں کے پاس آیا۔ بازو پکڑ کر اٹھایا اور گلاس اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ بھورے خاں نے گلاس منہ سے لگا کر بڑا سا گھونٹ بھرا اور جھومتا ہوا ایک بار پھر اپنی جگہ پر جا کر بیٹھ گیا۔

وہ چپ چاپ بیٹھا وسکی سے شغل کرتا رہا۔ اس کے چہرے پر بلا کی کرختگی چھائی تھی۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں بجو کی طرح چمک رہی تھیں۔ داد محمد سومرو ابھی تک سہما ہوا تھا۔ علیم الدین سبزواری بھی گم صم تھا۔ کمرے کے اندر خوفناک سناٹا چھایا تھا۔ ہر شخص خاموش تھا۔ کچھ نہ کچھ سوچ رہا تھا۔ باہر ہوا کے جھکڑ درختوں کی شاخوں سے الجھتے ہوئے شور مچا رہے تھے۔ بارش کا زور ابھی ٹوٹا نہیں تھا۔ موٹی موٹی بوندیں کھڑکیوں کے شیشوں پر جل ترنگ بجا رہی تھیں۔

بھورے خاں یکا یک اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے گلاس منہ سے لگایا اور غٹا غٹ پورا چڑھا گیا۔ پھر اس نے خالی گلاس پختہ فرش پر دے مارا۔ زور کا چھنا کا ہوا۔ شیشوں کے ٹکڑے دور دور تک بکھر گئے۔ کمرے میں سنسنی پھیل گئی۔ داد محمد سومرو کا چہرہ خوف سے سیاہ پڑ گیا۔ علیم الدین سبزواری نے سراسیمہ ہو کر سوچا۔ دیکھو اب کیا نئی آفت نازل ہوتی ہے۔ بھورے خان نشے میں دھت ہو رہا تھا اور اس کا پارہ بھی چڑھا ہوا تھا۔

مگر کوئی آفت نازل نہ ہوئی۔ بھورے خاں نے مڑ کر علیم کو دیکھا۔ مسکرا کر بولا۔ ''اچھا بڑے بھائی اب ہم چلے۔''

علیم نے کھڑکی کے باہر پھیلی ہوئی وحشت ناک تاریکی کو دیکھا' سوچا برسات کی اس طوفانی رات میں یہ کہاں جائے گا۔ اس نے بھورے خاں کو روکنے کی کوشش کی۔ ''ابھی تو بڑی زور کی بارش ہو رہی ہے۔ اتنے خراب موسم میں کہاں جاؤ گے؟''

داد محمد سومرو کو علیم کا رویہ نہایت شاق گزرا۔ وہ بھورے خان سے جلد سے جلد چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس نے جھنجھلا کر علیم کو تیکھی نظروں سے دیکھا۔ مگر زبان سے کچھ نہ کہا۔ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتا رہا۔

بھورے خاں نے بے نیازی سے کہا۔ ''اماں تم میری فکر نہ کرو' بھیگتا بھاگتا چلا ہی جاؤں گا۔''

''میں واپس کراچی جاؤں گا۔'' علیم نے اسے مطلع کیا۔ ''میرے پاس اپنی جیپ ہے۔''

''ادھر جانے کو تو اپنا بھی جی چاہتا ہے۔'' بھورے خاں نے نشے سے جھوم کر کہا۔ ''ٹھکانہ بھی اپنا لالو کھیت ہی میں ہے۔ لیکن تھانیدار میرے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گیا ہے۔ سالے نے ناک میں دم کر دیا ہے۔ اسی تو جان بچا کر ادھر آیا ہوں۔''

''کوئی سنگین واردات کی ہو گی۔'' علیم الدین نے مسکرا کر تبصرہ کیا۔

''اماں ایسی کوئی بات نہیں۔'' بھورے خاں نے بتایا۔ ''وہ تھانے میں بلا بلا کر کہتا ہے کہ جوئے کا اڈہ چلاؤ۔ جیتنے والوں سے تال وصول کرو اور اس کا آدھا حصہ تھانے میں پہنچاؤ۔ اور دوسروں کی مخبری بھی کرو۔'' اس نے منہ بگاڑ کر علیم کو دیکھا۔ ''بھیا خان! بات اصلی یہ ہے کہ میں نے کبھی یہ دھندا کیا نہیں۔ سیدھی سیدھی چار سو بیس ہوتی ہے۔ اپنا کام تو کھرا کھیل فرخ آبادی ہے۔ کون اس چکر میں پڑے۔ میں نے تو صاف انکار کر دیا۔ بس اسی بات پر وہ خفا ہو گیا۔ پہلے تو دھونس دھمکی دیتا رہا۔ پھر قتل کے ایک مقدمے میں مجھے پھانسنے کی کوشش کی۔''

علیم نے ایک بار پھر اسے روکنے کی کوشش کی۔ ''کراچی نہ جانا' راستے میں جہاں کہو گے چھوڑ دوں گا۔''

بھورے خاں نے علیم سبزواری کو مشتبہ نظروں سے دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر زہر خند ہویدا ہوا۔ ''اور جو تم مجھے لے جا کر تھانے

پہنچادو۔کیوں استاد' یہ ٹرکیں اور وہ بھی یاروں سے۔"

"ایسا کروں تو میرا ابھی ایک کان کاٹ کر اسپرٹ کی بوتل میں ڈال دینا۔"

"اماں' تم نے میری بات کا یقین بھی کرلیا۔بھئی حد ہوگئی۔میں تو اس سالے وڈیرے کو ڈرانے کے لیے کہہ رہا تھا۔" وہ ٹھٹھا مار کر ہنسا۔داد محمد سومرو کو دیکھا جو صوفے میں دھنسا ہوا تھا۔"اسپرٹ تو پینے کی چیز ہوتی ہے' جب نشے پانی کا کوئی سیتا نہیں ہوتا تو اسپرٹ ہی سے اپنا کام چلتا ہے۔میں اس سالے کا کٹا ہوا کان ڈال کر پوری بوتل خراب کروں گا۔" اس نے ایک خمار آلود نظر علیم پر ڈالی۔"اچھا بڑے بھائی' بہت ہوچکی یاری' میں تو اب چلا۔"

علیم نے مزید کچھ نہ کہا۔بھورے خاں آگے بڑھا۔داد محمد سومرو کے قریب پہنچا۔ہاتھ بڑھا کر اس کی ناک پکڑی۔اسے بے تکلفی سے ادھر ادھر ہلایا۔آنکھ مار کر بولا۔"عیش کرو پیارے عیش۔آنکھوں پر دوربین چڑھا کر جوبن کی بہار دیکھو۔اصلی جانی واکر پیو۔تمہاری قسمت میں تو عیش ہی کرنا لکھا ہے۔" داد محمد نے مطلق مزاحمت نہ کی۔دم سادھے بیٹھا رہا۔

بھورے خاں نے داد محمد سومرو کی ناک چھوڑ دی۔مڑا کھڑکی کی جانب لپکا۔زور سے "یا علی مدد" کا نعرہ لگایا۔زقند بھر کر کھڑکی کی چوکھٹ پر پہنچا اور چھلاوے کی مانند رات کے گھٹاٹوپ اندھیرے میں غائب ہوگیا۔

داد محمد سومرو سہمی ہوئی نظروں سے برابر کھڑکی کی سمت دیکھتا رہا۔الو کی طرح گول گول آنکھیں نکالے صوفے پر سکڑا سکڑا یا وہ بالکل کارٹون معلوم ہورہا تھا۔علیم الدین اسے دیکھتا رہا اور منہ بگاڑ بگاڑ کر زیر لب مسکراتا رہا۔

چند لمحے بعد جب داد محمد نے مڑنے کے لیے پہلو بدلنے کی کوشش کی تو علیم نے فوراً ٹوکا۔"مسٹر سومرو' بس ذرا دیر اور اسی طرح بیٹھے رہیے۔"

داد محمد سومرو نے حیران و پریشان ہوکر علیم کی طرف دیکھا' پوچھا۔"سائیں! تمہارے پاس کیمرہ تو نہیں ہے؟"

علیم نے خاموشی سے جیب کے اندر ہاتھ ڈالا۔ایک کاغذ نکالا اور اسے کھول کر داد محمد کے سامنے کرتے ہوئے بولا۔"فی الحال تو میرے پاس یہ چیک موجود ہے۔"

"کیسا چیک؟" داد محمد اس بات کا مفہوم بالکل نہ سمجھ سکا۔احمقوں کی طرح پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگا۔

"یہ وہ چیک ہے جو آپ نے اپنے بیان کے ساتھ "ندائے وطن" کو بھیجا تھا۔" علیم الدین سبزواری نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔

"آپ کو اس چیک کے بارے میں علم تو ہوگا؟"

"یاد آتا ہے یہ چیک بھجوایا تو گیا تھا۔ مگر میں اس کا کیا کروں گا؟"

"آپ تو اس کا کچھ نہیں کریں گے' البتہ میرا ارادہ ہے کہ بیان کے ساتھ اس کا عکس بھی اخبار میں شائع کر دیا جائے۔"

"کیوں؟" داد محمد نے پریشان ہو کر سوال کیا۔ "سائیں! آپ ایسا کیوں چاہتے ہیں؟"

"تا کہ لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ سیاسی رشوت کیا ہوتی ہے؟"

"آپ ایسا ہرگز نہیں کر سکتے۔" داد محمد سومرو حواس باختہ ہو گیا۔

"اس کا اندازہ آپ کو پرسوں کے ندائے وطن سے ہو جائے گا۔ اطمینان رکھئے' اسے صفحہ اول ہی پر شائع کیا جائے گا اور نہایت نمایاں طور پر شائع کیا جائے گا۔"

"آپ یہ سب کچھ کیوں کر رہے ہیں؟ کس لیے کر رہے ہیں؟" داد محمد سومرو اور زیادہ پریشان ہو گیا۔

اس کے چہرے سے وحشت برسنے لگی۔

"اس لیے کہ آپ نے میری اور میرے اخبار کی سخت توہین کی ہے۔"

"توہین! سائیں' تم کیسی بات کر رہے ہو؟" وہ ابھی تک گھبرایا ہوا تھا اور بے حد ہونق نظر آ رہا تھا۔

علیم الدین اس کا بگڑا ہوا حلیہ دیکھ کر لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اطمینان سے بیٹھا سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ چند لمحے اس نے تامل کیا پھر گویا ہوا۔ "مسٹر سومرو' آپ ندائے وطن کو اتنا معمولی اور پھٹیچر اخبار سمجھتے ہیں کہ صرف چار سو کی رقم کے عوض آپ کا پروجیکشن کرے گا' پبلسٹی کرے گا۔ کسی موقر اخبار کی اس سے زیادہ اور کیا توہین ہو سکتی ہے۔"

"سائیں' تو پھر ایسی بات کریں نا' آپ نے تو خوامخواہ پریشان کر دیا۔" داد محمد سومرو نے اطمینان کی سانس لی۔ مسکرایا۔ نرم لہجے میں بولا۔ "آپ ناراض نہ ہوں۔ آگے اور روپیہ بھی مل جائے گا۔"

"میں چاہتا ہوں کہ رقم کا تعین ابھی اور اسی وقت ہو جائے۔"

"آپ ہی بتا دیں مجھے تو کچھ اتا پتہ نہیں۔"

دونوں اب سودے بازی کے لیے خود کو ذہنی طور پر تیار کر چکے تھے۔ علیم الدین سبزواری نے مطالبہ کیا۔ "فی الحال بیس ہزار آپ کو دینا ہوں گے اور یہ پہلی قسط ہو گی۔ جب الیکشن کی حتمی تاریخ مقرر ہو جائے گی تو اتنے ہی روپے کی دوسری قسط ادا کرنا ہو گی۔" اس نے سگریٹ کا لمبا کش لگایا۔ "اس کے صلے میں "ندائے وطن" آپ کا ایسا زبردست پروپیگنڈا کرے گا کہ ہر طرف دھوم مچ جائے

گی۔"

"سائیں! یہ تو تم بہت مانگ رہے ہو۔"

"میرا خیال ہے کہ بیس ہزار کی رقم زیادہ نہیں۔"

"مسٹر یہ آپ کا خیال ہے۔" داد محمد نے سنجیدگی سے کہا۔ "میرے خیال میں تو یہ نہ صرف زیادہ بلکہ بہت زیادہ ہے۔ بیس ہزار روپے، بہت ہوتے ہیں۔"

"اتنی رقم تو آپ صرف ایک ریس میں ہار جاتے ہیں۔"

داد محمد کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ تیوری پر بل پڑ گئے۔ تیکھے لہجے میں بولا۔ "دیکھو سائیں! یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔" اس کے وجود میں چھپا ہوا جاگیردارانہ طمطراق اچانک بیدار ہو گیا۔ "معاف کرنا' میں ایسی باتیں سننے کا عادی نہیں ہوں۔"

علیم الدین کو فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ داد محمد سومرو اب مدہوش نہیں تھا۔ بھورے خاں نے چمکتا دمکتا چاقو دکھا کر اس کا نشہ اڑا دیا تھا۔ علیم نے سوچا۔ یہ تو بہت برا ہوا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ بنا بنایا کھیل بگڑ جائے۔ اس نے فوراً پینترا بدلا۔ صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔ "آپ خواہ مخواہ برا مان گئے۔ میرا مطلب وہ نہیں تھا جو آپ سمجھ رہے ہیں۔"

"آپ کا مطلب کچھ بھی ہو مگر آپ پر یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اس طرح کے معاملات میں طے نہیں کرتا۔" داد محمد سومرو کے لہجے سے ہنوز خفگی آشکارہ تھی۔ "ایسے ہی کاموں کے لیے میں نے پرائیویٹ سیکرٹری لگایا ہے۔ منیجر اس کے علاوہ ہے۔"

"لیکن چیک پر دستخط تو پرائیویٹ سیکرٹری کے نہیں' آپ کے ہیں۔" علیم نے اس دفعہ نیا انجھر پھینکا۔

تیر ٹھیک نشانے پر بیٹھا۔ داد محمد تلملا کر بولا۔ "میں پہلے ہی انکار کر رہا تھا مگر وہ بھڑوا سیکرٹری نہ مانا۔ میرے دستخط کرا کے چیک جاری کرا دیا۔" وہ غصے سے بڑبڑانے لگا۔ "میں اس حرام زادے ناریجو کو فوراً نکال دوں گا۔"

"ایسا نہ کیجئے گا' میں اس سے مل چکا ہوں۔ بہت ہوشیار اور کام کا آدمی ہے۔" علیم نے اسے رام کرنے کی کوشش کی۔ "چلیے جو ہو گیا اسے بھول جائیے۔ آپ کو بیس ہزار زیادہ معلوم ہوتے ہیں' اٹھارہ ہزار کر لیجیے۔ یہ تو زیادہ رقم نہیں ہے۔"

"نہیں سائیں! یہ بھی زیادہ ہے۔" داد محمد ایک بار پھر سودے بازی پر اتر آیا۔ "آپ بہت زیادہ مانگ رہے ہیں۔"

"آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے۔ پچھلے ہی مہینے مجھے خان آف قلات کے دربار میں باریابی کا موقع ملا۔ بڑی محبت سے ملے۔ عزت سے پیش آئے۔ ملکی سیاست کے بارے میں دیر تک باتیں کرتے رہے۔ رخصت ہوا تو ان کے سیکرٹری نے زادراہ کے علاوہ

ایک لفافے میں مبلغ چار ہزار روپے بھی دیئے۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ "یہ چار ہزار کس مد میں دیئے گئے ہیں۔ جواب ملا۔ یہاں کا یہ قدیم دستور ہے۔ خان کے دربار سے کوئی اخبار نویس خالی ہاتھ نہیں جاتا۔" علیم سنبھل سنبھل کر بولتا رہا۔ "ذرا غور کیجئے' نہ میں ان کا کوئی انٹرویو لیا نہ بیان اور چار سو نہیں چار ہزار روپے دے دیئے۔ کسی نے سچ کہا ہے بڑے آدمیوں کی بڑی بات ہوتی ہے۔"

"سائیں! بالکل ٹھیک کہا آپ نے۔ وہ بڑے آدمی ہیں۔ خان ہیں۔ چار ہزار کیا چالیس ہزار روپے بھی دیں تو کم ہے۔" داد محمد نے مسکرا کر اپنے ردعمل کا اظہار کیا۔ "مگر میں تو اتنا بڑا آدمی نہیں ہوں۔"

"کیوں کسر نفسی سے کام لے رہے ہیں۔" علیم نے اس کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کی۔ "آپ بھی بڑے آدمی ہیں۔ باغات اور شکارگاہ کے علاوہ کوئی بیس ہزار ایکڑ سے اوپر تو آپ کی بھی زرعی اراضی ہوگی۔ غلط کہہ رہا ہوں میں؟"

داد محمد سومرو کی بات نظر انداز کرتے ہوئے گویا ہوا۔ "سائیں' یہ بتائیں' آپ چاہتے کیا ہیں؟"

"میں چاہتا ہوں' اپنا یہ چیک اپنے پاس رکھیں۔" علیم الدین نے کھل کر بات کی۔ "چیک بک نکالیں اور اٹھارہ ہزار کا نیا چیک کاٹ دیں۔"

"میں آپ کو پندرہ ہزار دے سکتا ہوں۔ یہ روپے بھی آپ کو کل پرسوں ملیں گے۔ میرے پاس اس وقت چیک بک نہیں ہے۔" وہ صاف جھوٹ بول گیا۔

علیم الدین پرانا گھاگ تھا۔ اس نے داد محمد سومرو کو کنی کاٹنے کا موقع نہ دیا۔ اپنی جگہ سے اٹھا اور اس کے برابر جا کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ جیب سے فونٹین پین نکالا۔ اسے کھولا اور داد محمد کے ہاتھ میں دے دیا۔ چیک اس کے سامنے میز پر رکھ دیا۔ مسکرا کر کہا۔ "ایسا کیجئے' چیک پر درج چار سو کی رقم کو پندرہ ہزار بنا دیں۔"

"نہیں سائیں' یہ ٹھیک نہیں۔" داد محمد آمادہ نہ ہوا۔ چند لمحے خاموش بیٹھا سوچتا رہا۔ پھر اس نے بے چینی سے پلو بدلا۔ "میرے سوٹ کیس میں کچھ روپیہ پڑا ہے۔ پانچ ہزار ہوگا۔ وہ میں آپ کو ابھی دے دوں گا۔ دس ہزار کل میرا سیکرٹری آپ کے دفتر پہنچا دے گا۔ میں اسے فون پر کل صبح ہی ہدایت کر دوں گا۔" اس نے نظر بھر کر علیم کو دیکھا۔ "یہ ٹھیک رہے گا نا؟"

علیم تذبذب میں پڑ گیا۔ داد محمد نے اس کے جواب کا انتظار بھی نہ کیا۔ اٹھا اور ڈگمگاتے قدموں سے چلتا ہوا دائیں ہاتھ کے ایک دروازے کی جانب بڑھا۔ دروازہ کھولا اور اندر چلا گیا۔

علیم نے پیکٹ سے سگریٹ نکال کر سلگائی اور آہستہ آہستہ کش لگانے لگا۔ چند لمحے بعد اس نے چیک اٹھا کر دیکھا۔ اس پر ۴۰

جولائی ۱۹۵۸ء کی تاریخ درج تھی۔ تاریخ دیکھ کر وہ پریشان سا ہو گیا۔ اس کی بے چین نظریں بار بار اس دروازے کی سمت اٹھ جاتیں جسے کھول کر داد محمد اندر گیا تھا۔ کمرے میں گہرا سناٹا تھا۔ ہوا درختوں کی شاخوں میں پھڑ پھڑا رہی تھی۔ بادل رک رک کر گرج رہے تھے۔ بارش کا سلسلہ ہنوز جاری تھا۔

آخر کمرے کا دروازہ کھلا۔ داد محمد سومرو باہر آیا۔ مگر وہ پریشان اور جھنجھلایا ہوا نظر آ رہا تھا۔ علیم نے اسے پریشان دیکھا تو خود بھی پریشان ہو گیا۔ داد محمد اس کے قریب پہنچا اور نڈھال ہو کر صوفے پر نیم دراز ہو گیا۔ اس کے چہرے سے غم و غصہ صاف عیاں تھا۔

علیم نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ ''خیریت تو ہے؟''

''کدھر گیا وہ حرام زادہ چور؟'' داد محمد غصے سے پھٹ پڑا۔ ''کہتا تھا صرف تجوری کھولی تھی۔'' اس کے چہرے پر خشونت چھا گئی۔ ''سوٹ کیس سے سب نکال کر لے گیا۔ کچھ بھی نہیں چھوڑا۔'' وہ زور زور سے ہانپنے لگا۔ ذرا قرار آیا تو غصے سے تلملا کر بولا۔ ''لیکن میں بھی اسے نہیں چھوڑوں گا۔ جیل میں بند کراؤں گا۔ ہاتھ آ گیا تو گولی مار دوں گا۔'' صاف اڑا لے گیا۔ ایک ایک پیسہ لے گیا۔''

علیم اس کی باتیں سن کر چکرایا۔ اس کے سان گمان میں بھی نہ تھا کہ بھورے خاں اس قدر اونچا کلاکار ہے۔ پانچ ہزار سے اوپر کی رقم چرائی اور نہایت اطمینان سے بیٹھ کر وہسکی کی چسکی لگائی نہ جھجکا نہ گھبرایا بلکہ نہایت دھڑلے سے دھونس دھمکی بھی دیتا رہا۔

علیم نے دبی زبان سے اپنے شبہ کا اظہار کیا۔ ''مگر اس نے اتنی بڑی رقم رکھی کہاں؟''

''اپنی چڈی پھڈی میں حرام زادی نے چھپا رکھی ہوگی۔'' داد محمد نے جل کر جواب دیا۔

''ایک نمبر پکا چور تھا۔'' وہ گلہ کرنے لگا۔ ''سائیں تم نے بھی ذرا نہ سوچا۔ اس سے یاری دوستی شروع کر دی۔ بدمعاش میری آدھی سے زیادہ وہسکی کی بوتل بھی چڑھا گیا۔ تم نے روکنے کے بجائے کہا۔ پیو اور پیو۔''

''میں نے تو یہ سب کچھ آپ ہی کی خاطر کیا تھا۔'' علیم نے جھٹ صفائی پیش کی۔ ''آپ نے دیکھا نہیں' اس کے ہاتھ میں کھلا ہوا چاقو تھا۔ بار بار آپ پر حملہ کرنے کے لیے جھپٹتا تھا۔ غصے میں مجھ پر بھی وار کر سکتا تھا۔ مگر میں نے خطرے کی ذرا پروا نہ کی۔ اپنی جان پر کھیل کر بڑی مشکل سے تو اسے باز رکھا تھا۔ سب کچھ آپ کے سامنے ہی تو ہوا تھا۔''

داد محمد کچھ نہ بولا۔ اس نے خالی گلاس میں وہسکی ڈالی۔ جگ اٹھا کر پانی ملایا۔ گلاس منہ سے لگایا اور ایک ہی سانس میں نصف سے زیادہ خالی کر دیا۔ علیم خاموش بیٹھا رہا۔ داد محمد سومرو وہسکی سے شغل کرتا رہا اور علیم الدین سگریٹ کے کش لگاتا رہا۔ دونوں چپ تھے۔ کمرے میں سکوت طاری تھا۔

بادل ایک بار زور سے گرجے۔ بجلی بھی کڑکی۔ روشنی کی ایک تیز لکیر کھڑکی سے گزر کر کمرے میں اس طرح جھلملائی کہ دونوں کی آنکھیں چکا چوند ہو گئیں۔ داد محمد سومرو نے گھبرا کر کہا۔

"لگتا ہے' کہیں نزدیک ہی بجلی گری ہے۔"

"ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ روشنی بھی بہت تیز پھیلی تھی۔" علیم نے ہاں میں ہاں ملائی۔ گفتگو کا سلسلہ از سر نو شروع ہوا تو وہ فوراً حرف مطلب زبان پر لایا۔ "یہ بتایئے اس چیک کے بارے میں آپ نے کیا سوچا؟"

"اسے میرے پاس چھوڑ جائیں۔ میں ناریجو کو فون کر دوں گا۔ وہ آپ کو پندرہ ہزار روپے پہنچا دے گا۔" داد محمد نے علیم کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ "ٹھیک رہے گا نا؟"

علیم آمادہ نہ ہوا۔ صاف انکار کرنے کے بجائے مسکرا کر بولا۔ "میں تو کہتا ہوں آپ اسی چیک کو پندرہ ہزار کا کر دیجیے۔"

داد محمد سومرو گومگو کے عالم میں بیٹھا بے چینی سے سر کے بال کریدتا رہا۔ علیم الدین سبزواری نے اسے مزید غور کرنے کی مہلت نہ دی۔ فوراً چھاپہ مارا۔ ایک بار پھر قلم اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ چیک نکال کر سامنے رکھا۔ نرم لہجے میں بولا۔ "اجی' اب سوچنا کیا ہے۔"

داد محمد سومرو نے بددلی سے چیک پہ قلم چلایا۔ چار سو کے پندرہ بنائے' دستخط کئے اور قلم واپس کرتے ہوئے تیکھی نظروں سے علیم کو دیکھا۔

"سائیں' یہ تو سیدھی سیدھی بلیک میلنگ ہے۔"

داد محمد سومرو کے لہجے میں شکست خوردگی اور پسپائی سے زیادہ تحقیر کا پہلو نمایاں تھا۔ علیم اسے تلخ گھونٹ کی طرح پی گیا۔ اس نے خاموشی سے چیک اٹھایا' تہہ کیا اور حفاظت سے اندرونی جیب میں رکھ لیا۔ اطمینان کی سانس لی اور مسکرا کر جوابی حملہ کیا۔ "معاف کیجیے' اگر یہ بلیک میلنگ ہے تو آپ بھی اسمبلی کی رکنیت حاصل کرنے کے لیے اسی طرح حکومت کو بلیک میل کریں گے۔ لائسنس اور پرمٹ اپنے اور اپنے خاندان والوں کے نام جاری کرائیں گے۔ بینکوں سے بڑے بڑے قرضے حاصل کریں گے۔ زرعی اصلاحات ناکام بنانے کے لیے دباؤ ڈالیں گے۔ طرح طرح کی دوسری مراعات حاصل کرنے کی کوشش کریں گے اور وزیر مقرر ہو گئے تو پوری قوم کو بلیک میل کریں گے۔ آپ اسی مقصد کے لیے الیکشن لڑ رہے ہیں نا؟"

"سائیں' میرے بارے میں آپ نے بالکل غلط اندازہ لگایا۔" داد محمد سومرو نے تیوری پر بل ڈال کر کہا۔ "میں ملک اور قوم کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔"

''ملک اور قوم کی خدمت کے لیے تو میں بھی اخبار چلا رہا ہوں۔'' علیم نے مڑ کر کھڑکی جانب دیکھا اور فوراً گفتگو کا موضوع بدل دیا۔ ''بارش رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی ہے۔ ویسے برسات کی ایسی بھیگی بھیگی رات بسر کرنے کے لیے سمراج بڑی آئیڈیل جگہ ہے۔ ہر طرف ہریالی ہی ہریالی ہے۔ نہایت پرسکون' نہ شور نہ کسی قسم کا ہنگامہ۔ بڑا پر فضا مقام ہے۔ آپ کی خوش ذوقی قابل داد ہے۔'' علیم سنبھل سنبھل کر بولتا رہا۔ داد محمد کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے چاپلوسی بھی کرتا رہا۔

مگر داد محمد نے کسی ردعمل کا اظہار نہ کیا۔ وہ ہنوز روٹھا ہوا سا بیٹھا تھا۔ میز پر اس کا گلاس خالی پڑا تھا۔ نہ وہ پی رہا تھا نہ بول رہا تھا۔ علیم نے ہاتھ بڑھا کر بوتل اٹھائی۔ گلاس میں وہسکی ڈالی۔ ڈبل پیگ بنایا اور داد محمد کے ہونٹوں سے گلاس لگا کر بولا۔ ''سر! یہ جام آپ کی صحت اور الیکشن میں کامیابی کے لیے میری طرف سے۔ دیکھئے انکار کر کے میرا دل نہ توڑ دیجئے گا۔''

داد محمد سومرو نے علیم کا دل نہ توڑا۔ خاموشی سے وہسکی کا گھونٹ بھرا۔ علیم کے اصرار کرنے پر اس نے ایک گھونٹ اور بھرا۔ اس دفعہ بھی وہ چپ رہا۔ علیم نے گلاس میز پر رکھ دیا۔ اٹھا اور اپنی جگہ پر جا کر بیٹھ گیا۔

سومرو رک رک کر وہسکی کے گھونٹ بھرتا رہا۔ گلاس خالی ہو گیا تو اس نے دوبارہ پیگ تیار کیا۔ باہر مسلسل بارش ہوتی رہی۔ ہوا شور مچاتی رہی۔ علیم چپ چاپ بیٹھا سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔

داد محمد سومرو گلاس پر گلاس خالی کرتا رہا۔ اس کا چہرہ بجھا بجھا نظر آ رہا تھا۔ علیم نے اس کی کدورت نہ صرف شدت سے محسوس کی بلکہ اسے رفع کرنے کی غرض سے بات بھی چھیڑی۔ ''الیکشن جیتنے کے بعد آپ کا کیا پروگرام ہوگا؟''

داد محمد نے گردن اٹھا کر خمار آلود نظروں سے علیم کو دیکھا۔ بے زاری سے بولا۔ ''سائیں' فی الحال مجھے سخت نیند معلوم ہو رہی ہے۔'' نشے کی جھونک میں وہ ایک طرف جھک گیا۔ پھر اس نے سر اٹھایا۔ صوفے کی پشت سے ٹکایا اور آنکھیں بند کر لیں۔

علیم الدین خاموش بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔ مگر نہ اس نے جسم کو جنبش دی نہ آنکھ کھولی' بے خبر سوتا رہا۔ علیم اپنی جگہ سے اٹھا۔ آہستہ آہستہ چلتا ہوا داد محمد کے قریب آ گیا۔ غور سے دیکھا۔ وہ آنکھیں بند کئے آہستہ آہستہ خراٹے بھر رہا تھا۔ علیم نے بوتل اٹھائی۔ گلاس سنبھالا اور اپنی جگہ پر واپس آ گیا۔ اب اسے وہسکی سے شغل کرنے کا موقع ملا تھا۔ حالانکہ کئی بار پینے کی زبردست خواہش ہوئی مگر وہ ہر بار ٹال گیا' مبادا نشے کی جھونک میں معاملہ بگڑ جائے۔

اس نے گلاس میں وہسکی ڈالی۔ لیکن جگ میں پانی نہیں تھا۔ علیم نے جگ اٹھایا۔ ایک بار پھر داد محمد سومرو پر نظر ڈالی اور غسل خانے میں چلا گیا۔ غسل خانہ خالی تھا۔ شیریں جا چکی تھی۔ اس نے جگ میں پانی بھرا اور اپنی جگہ پر جا کر بیٹھ گیا۔

بوتل میں ابھی ایک چوتھائی سے زیادہ وہسکی موجود تھی۔ وہ پیگ بنا بنا کر وہسکی کی چسکی لگاتا رہا۔ بارش کا زور کسی قدر ٹوٹ گیا تھا۔ اب ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ بھیگی ہوا کے جھونکے کھڑکی کی راہ سے کمرے کے اندر آ رہے تھے۔ علیم شراب سے شغل کرتا رہا اور خوشگوار موسم سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ کمرے میں خاموشی تھی۔ داد محمد سومرو آنکھیں بند کئے گہری نیند سو رہا تھا۔ رات ڈھلتی جا رہی تھی۔ بوتل بھی ختم ہو رہی تھی۔

علیم الدین سبزواری نے آخری پیگ ختم کیا۔ سگریٹ سلگائی اور ہولے ہولے کش لگانے لگا مگر وہ پوری سگریٹ پی نہ سکا۔ نیند بار بار شبخون مارتی۔ اس کی بوجھل آنکھیں بند ہو جاتیں۔ آخر اس نے سگریٹ بجھا دی۔ لیکن وہ سونا نہ چاہتا تھا۔ سمراج سے باہر بھی نہ جا سکتا تھا۔ برسات کی تاریک رات میں سفر بھی نہ کر سکتا تھا۔ اسے رات کے ختم ہونے کا انتظار تھا۔

نیند کا ایک بار ایسا زبردست جھونکا آیا کہ اس کی آنکھیں بند ہو کر کھل نہ سکیں۔ وہ جھوم کر ایک طرف لڑھک گیا۔ اب وہ بے خبر سو رہا تھا۔

علیم الدین کی آنکھ کھلی تو رات ختم ہو رہی تھی۔ کھڑکی کے باہر صبح کاذب کی ہلکی ہلکی کافوری روشنی اندھیرے سے پھوٹ رہی تھی۔ بارش رک چکی تھی مگر ہوا ہنوز بپھری ہوئی تھی۔ علیم نے آنکھیں ملتے ہوئے داد محمد سومرو کی جانب دیکھا۔ وہ صوفے سے لڑھک کر فرش پر آ گیا تھا۔ اس کی ایک ٹانگ پر صوفے کے بازو سے اٹکی ہوئی تھی۔ اسے کچھ خبر نہ تھی کہ کس حال میں ہے اور کس طرح بے غل و غش پڑا ہے۔ کمرے پر گہرا سکوت طاری تھا۔

علیم اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اب اس کے لیے سمراج میں مزید ٹھہرنا کسی طور مناسب نہ تھا۔ وہ جس مقصد سے آیا تھا' پورا ہو چکا تھا۔ پندرہ ہزار کا چیک اس کی جیب میں موجود تھا۔ اسے جلد سے جلد اپنے اکاؤنٹ میں جمع کرا کے کیش کرانا تھا۔ اپنے اخبار کے عملے کو کچھ نہ کچھ دے کر مطمئن کرنا تھا جسے پچھے دو ماہ سے تنخواہ نہیں ملی تھی اور جس نے اب ''تنگ آمد بجنگ آمد'' کے مصداق ہڑتال کرنے کا نوٹس دے دیا تھا۔

وہ سیدھا غسل خانے میں گیا۔ منہ دھویا۔ کنگھا موجود تھا' اسے اٹھا کر بال سنوارے۔ لباس کی شکنیں درست کیں۔ وہ باہر جانے کے لیے مڑا تو دہلیز کے قریب چھوٹا سا ایک جھمکا نظر آیا۔ علیم نے جھک کر اسے اٹھا لیا۔ معاً اسے شیریں یاد آ گئی جس کے برہنہ جسم کے پیچ و خم داد محمد سومرو دوربین آنکھوں پر چڑھا کر کیف و مستی کے عالم میں دیکھ رہا تھا۔ مسکرا رہا تھا۔ وہسکی کے نشے سے جھوم رہا تھا۔

غسل خانے سے نکل کر وہ اس کمرے کے دروازے کی جانب بڑھا جس میں اس نے شیریں کو داخل ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔

جھمکا اس کے ہاتھ میں دبا ہوا تھا۔ وہ اسے واپس شیریں کو دینا چاہتا تھا۔ قریب پہنچ کر علیم الدین سبزواری نے آہستہ سے دروازہ کھولا۔ مگر دہلیز پر ٹھٹک کر رہ گیا۔ شیریں کی پیٹھ دروازے کی جانب تھی۔ اب وہ پورا لباس پہنے ہوئے تھی۔ علیم کی آمد کی اسے مطلق خبر نہ ہوئی۔ وہ گردن جھکائے نہایت انہماک سے سو سو روپے کی نوٹ گن رہی تھی۔

علیم حیرت سے آنکھیں پھاڑے اسے دیکھتا رہا' پھر آہستہ سے کھنکارا۔ شیریں نے پلٹ کر علیم کو دیکھا۔ اس کے چہرے سے خوف اور پریشانی عیاں تھی۔ گھبرا کر بولی۔

''ارے تم!۔۔۔۔۔۔۔ تم یہاں کیسے آ گئے؟''

علیم نے جھمکا آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ جھمکا دینے آیا تھا جو تمہارے کان سے نکل کر گر گیا تھا۔'' وہ زیر لب مسکرایا۔ ''تمہارا ہی ہے نا؟''

شیریں کا ہاتھ فوراً کان پر گیا جو خالی تھا۔ ''ہاں میرا ہی ہے۔'' اس نے جھمکا لینے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔ ''یہ تم کو کہاں ملا؟''

''غسل خانے میں۔'' علیم بدستور مسکراتا رہا۔ ''میں نے ہی تم کو غسل خانے میں جانے کے لیے کہا تھا۔ یاد ہے نا؟''

شیریں نے کچھ نہ کہا۔ جھمکا اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اور جلدی جلدی نوٹوں کو اپنی ٹانگوں کے نیچے چھپانے کی کوشش کرنے لگی۔ علیم نے دروازہ بند کیا۔ آگے بڑھا۔ شیریں کے قریب پہنچا۔ اس نے مشتبہ نظروں سے شیریں کو دیکھا۔

''یہ روپے تم نے سومرو صاحب کے سوٹ کیس سے نکالے ہیں نا؟''

''نہیں' نہیں میں نے کسی کے نوٹ ووٹ نہیں نکالے۔'' اس نے جلدی جلدی انکار میں گردن ہلائی اور ٹانگیں پھیلا کر نوٹوں کو پوری طرح چھپانے کی کوشش کرنے لگی۔

''میں تو یہ سمجھا تھا کہ بھورے خاں نے سوٹ کیس پر ہاتھ صاف کر دیا۔ مگر اب معلوم ہوا۔ تم تو اس سے بھی اونچی کلاکار ہو۔ ایسی ہاتھ کی صفائی دکھائی کہ کانوں کان خبر نہ ہوئی۔'' علیم کھل کر مسکرایا۔ ''بھئی تمہاری کاریگری کے تو ہم بھی قائل ہو گئے۔ بھورے خاں تو شاہجہانپور کا ہے' معلوم ہوتا ہے تم بنارس کی رہنے والی ہو۔''

''تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔'' وہ تنک کر بولی۔

علیم اس کی برہمی سے ذرا مرعوب نہ ہوا۔ آنکھ مار کر شوخی سے بولا۔ ''کتنے ہیں؟''

''کتنے بھی ہیں' تم سے مطلب؟''

''مجھ سے کوئی مطلب نہیں مگر وہ وڈیرا جو باہر موجود ہے اس سے تو ہے۔'' اس دفعہ علیم نے اسے دھمکی دی۔

شیریں اس کی دھمکی سے پریشان ہوگئی۔ اس کا سارا طنطنہ ہوا ہوگیا۔ نظریں جھکا کر دبی زبان سے پوچھا۔ ''وہ ابھی تک سو رہا ہے یا جاگ گیا؟''

''فی الحال تو سو رہا ہے۔'' علیم نے اسے مزید خوفزدہ کرنے کی کوشش کی۔ ''مگر اسے جگانے میں کتنی دیر لگے گی۔''

''نہیں نہیں ایسا نہ کرنا۔'' وہ بدحواس ہو کر بولی۔ ''اسے جگانے کی ہرگز کوشش نہ کرنا۔''

اس نے پسپائی اختیار کی تو علیم الدین بھی نرم پڑ گیا۔ ''مگر تم نے یہ اچھا نہیں کیا۔''

''تم نے تو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے' اس نے مجھے کس طرح ستایا۔ کیسی کیسی واہیات حرکتیں کیں۔'' وہ پریشان ہو کر گڑگڑانے لگی۔ ''اللہ کے لیے اسے کچھ نہ بتانا۔ وہ ساری رقم چھین لے گا اور میرے پانچ سو روپے بھی نہیں دے گا' گالیاں دے گا' مار پیٹ کرے گا۔ تم کو کیا خبر۔ وہ کتنا سنگدل اور حرام زادہ ہے۔'' شیریں نے اسے نظر بھر کر دیکھا۔ ''اس نے جو کہا میں نے ویسا ہی کیا۔ تم چاہتے ہو میں اس سے اتنی قیمت بھی وصول نہ کروں۔''

شیریں کے رویے میں عاجزی کے ساتھ ساتھ رقت بھی تھی۔ اس کی باتیں سن کر وہ بہت متاثر ہوا۔ اس نے اپنے دل میں شیریں کے لیے ہمدردی کے جذبات محسوس کیے۔ وہ گومگو کے عالم میں خاموش کھڑا رہا۔ شیریں نے پانچ سو روپے کے نوٹ نکالے اور علیم کی طرف بڑھا کر بولی۔ ''لو یہ روپے رکھ لو۔'' اس نے روپے علیم کے ہاتھ میں دے دیئے۔

علیم روپے ہاتھ میں لیے ہکا بکا کھڑا رہا۔

''اگر تم نہیں بتاؤ گے تو اسے مجھ پر ذرا بھی شک نہ ہوگا۔'' شیریں نے نرم لہجے میں اسے باور کرانے کی کوشش کی۔ ''اسے اسی طرح سونے دو۔ اب تم جاؤ۔ میں نے تمہارا حصہ دے دیا۔ دس فیصدی سے اتنا ہی کمیشن بنتا ہے۔''

علیم ایک دم بھڑک اٹھا۔ تیکھے لہجے میں بولا۔ ''میں ایک عزت دار اخبار نویس ہوں۔ تم نے مجھے کوئی دلال یا بھڑوا سمجھا ہے؟ میں رنڈیوں کی کمائی اور چوری کے مال میں حصہ نہیں بٹاتا۔'' اس نے جھنجھلا کر سارے روپے شیریں کے منہ پر پھینک دیئے۔

''ارے' ارے' تم اتنے خفا کیوں ہوگئے؟'' وہ حیران و پریشان ہو کر بولی۔ ''اس میں ناراض ہونے کی کیا بات ہے؟''

علیم نے کوئی جواب نہ دیا۔ غصے سے پیچ و تاب کھاتا ہوا مڑا۔ آگے بڑھا۔ دروازہ کھولا اور کمرے سے نکل گیا۔ داد محمد سومرو ابھی تک اسی حالت میں بے سدھ پڑا تھا۔ علیم نے اس پر ایک سرسری سی نظر ڈالی۔ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا زینے پر پہنچا۔ سیڑھیاں طے

کیں۔ نیچے اترا۔ ہر طرف گہری خاموشی چھائی تھی۔ مگر بھی کہیں نظر نہ آیا۔ حویلی کے دوسرے نوکروں کی طرح وہ بھی ابھی تک سو رہا تھا۔

علیم نے صدر دروازہ کھولا اور سرلاج سے باہر چلا گیا۔



کیمیا گر

ہلکی سی آہٹ ہوئی۔دیوار پر پرچھائیں لہرائی۔میری آنکھ کھل گئی۔

یہ احمد تھا جو چوروں کی طرح دبے دبے قدموں چلتا ہوا کمرے میں داخل ہوا تھا اور میرے سرہانے کھڑا سردی سے کپکپا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں دونوں جوتے لٹک رہے تھے۔اندھیرے میں اس کی آنکھیں جنگلی بلی کی مانند چمک رہی تھیں۔

جب پہر رات گزر جاتی اور سنسان گلیوں میں آوارہ کتے بھونکنے لگتے تو دروازے کے باہر احمد کے قدموں کی آہٹ ابھرتی۔ مجھے اب تک یہ معلوم نہ ہوسکا کہ وہ کس طرح دروازے کی چٹخنی کھول کر گھر کے اندر داخل ہوتا تھا۔میں صرف اس قدر جانتا ہوں کہ وہ آدھی رات سے پہلے کبھی نہیں لوٹا۔یہ اس کا روزانہ کا معمول تھا۔

مگر اس روز خلاف معمول وہ جلد ہی واپس آ گیا تھا۔ذرا دیر دم سادھے خاموش کھڑا رہا' پھر اس نے بہت آہستہ سے فرش جوتے رکھے۔کوٹ اتار کر کھونٹی پر لٹکایا اور اندھیرے میں اسٹول تلاش کرنے لگا۔لیکن اسٹول نہ ملا۔لہٰذا اس نے ایک ہاتھ دروازے پر رکھا اور دیوار پر پیر لٹکا کر مچان پر چڑھنے لگا۔میں خاموش لیٹا یہ سارا تماشا دیکھتا رہا۔سامنے دیوار کے سہارے لٹکا ہوا وہ پر کٹے کبوتر کی طرح اچھل اچھل کر مچان کے اوپر پہنچنے کی کوشش کرنے لگا۔

میں زیادہ دیر اس پریشانی کے عالم میں اسے نہ دیکھ سکا۔آخر مجھے بولنا ہی پڑا۔''احمد روشنی کرلو۔''

وہ اندھیرے میں دم بخود کھڑا رہا۔

جب کوئی جواب نہ ملا تو میں ہاتھ بڑھا کر بجلی کا سوئچ دبا دیا۔کمرے میں روشنی پھیل گئی اور اس تیز روشنی میں وہ مچان کو دونوں ہاتھوں سے تھامے چمگادڑ کی مانند لٹکا ہوا نظر آ رہا تھا۔

اس نے مجھے دیکھا' کھسیانا ہو کر بولا' بھائی جان! آپ ابھی تک جاگ رہے ہیں؟''

''اسٹول لے لو مچان بہت اونچی ہے۔''میں نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے مشورہ دیا۔وہ بلندی سے اتر کر نیچے آ گیا اور سٹول لینے کے بجائے آہستہ آہستہ چلتا ہوا میرے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔چند لمحے خاموشی رہی' پھر اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

''میں نے ایک جگہ مکان دیکھا ہے۔بغیر پگڑی کے مل جائے گا۔''

مجھے پتہ ہے کہ وہ کہیں مکان وکان دیکھنے نہیں گیا بلکہ اب تک ماسٹر رحمت علی کے کمرے میں بیٹھا ''انعامی معمہ'' حل کر رہا ہوگا۔ میں اس کی بات سے ذرا متاثر نہ ہوا۔ کسی قدر بیزاری سے بولا ''اچھا' صبح اس سلسلے میں بات کرنا۔ اب رات خاصی ہو چکی ہے۔ جا کر سو جاؤ۔''

وہ اصرار کرنے لگا۔ ''سچ کہہ رہا ہوں بھائی جان' یہ مکان تو مل ہی جائے گا۔''

''جاؤ آرام کرو۔ خواہ مخواہ نیند حرام نہ کرو۔'' میں نے بے رخی سے جواب دیا۔ مگر وہ باز نہ آیا' کہنے لگا۔ ''آپ میری بات تو سن لیجئے۔'' اس دفعہ اس کے لہجے میں ٹٹ پونجیے دکانداروں کی سی خوشامد تھی۔ ''نہ پگڑی کا جھنجھٹ' نہ سال دو سال کا کرایہ دینے کی شرط۔ صرف مہینہ بھر کا کرایہ پیشگی دینا ہوگا۔ آپ میرے کہنے سے ایک بار چل کر مکان تو دیکھ لیجئے۔'' وہ گڑگڑانے لگا۔

مجھے لامحالہ دلچسپی کا اظہار کرنا پڑا۔ ہم دونوں دیر تک مکان کے بارے میں بات کرتے رہے' پھر وہ مچان پر جا کر لیٹ گیا۔ میں نے بجلی بجھائی اور کروٹ بدل کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔

دوسرے روز یہ بات گھر بھر میں سب کو معلوم ہو چکی تھی۔

شام کو دفتر سے واپسی کے بعد ہم دونوں بھائی مکان کا معاملہ طے کرنے چل دیے۔ وہاں پہنچ کر دیکھا' علاقہ خاصا ویران اور اجاڑ تھا۔ شہر سے دور بھی تھا۔ سرشام ہی سناٹا پڑ گیا۔ ہو کا عالم تھا۔ درمیان سے پختہ سڑک گزرتی تھی۔ دونوں جانب دور تک پھیلا ہوا بنجر اور ناہموار میدان تھا۔ کہیں کہیں سڑک کے کنارے پرانی وضع کے بنگلے تھے۔ ان ہی میں وہ بنگلہ بھی تھا۔ کھپریل کی آگے کو جھکی ہوئی چھت تھی۔ دیواریں پتھر کی بنی ہوئی تھیں۔ چاردیواری قد آدم تھی' مگر بوسیدہ اور شکستہ تھی۔

جس شخص سے معاملہ طے کرنا تھا وہ پھاٹک پر ہی مل گیا۔ ادھیڑ آدمی تھا۔ بظاہر چوکیدار لگتا تھا۔ بڑے تپاک سے ملا۔ ہم دونوں کو بنگلے کے اندر لے گیا۔ کل پانچ کمرے تھے۔ ایک کمرے کے دروازے پر تالا لگا تھا۔ بقیہ چار کمرے اس نے دکھائے۔ بہت پسند آئے۔ کمرے کشادہ اور صاف ستھرے تھے۔ ان کے علاوہ طویل برآمدہ تھا۔ راہداریاں تھیں۔ عقبی حصے میں باورچی خانہ تھا جس کی چھت پر دھواں باہر نکلنے کے لیے چمنی تھی۔ ہوا کی آمدورفت کے لیے دو کھڑکیاں بھی تھیں۔ بنگلے کا احاطہ بہت وسیع تھا۔ جگہ جگہ گھنے اور سایہ دار درخت تھے۔

ہم دونوں بھائی' گھوم پھر کر' اچھی طرح بنگلا دیکھ چکے تھے تو اس شخص نے خود ہی معاملہ کی بات چھیڑی۔ کہنے لگا ''بنگلہ تو آپ نے دیکھ ہی لیا۔ مگر آپ کو صرف دو کمرے رہنے کے لیے مل سکتے ہیں۔''

''کرایہ کیا ہوگا؟'' میں نے ہچکچاتے ہوئے دریافت کیا۔

''سو روپے مہینہ سے ایک پیسہ کم نہ ہوگا۔'' اس نے بڑے کھرتل لہجے میں کہا۔ ''نہ پگڑی کا چکر نہ لمبا چوڑا ایڈوانس۔ جی چاہے تو کل ہی سامان لے کر آجایئے۔''

اس وضاحت کے بعد بھی میری تسلی نہ ہوئی۔ کرید کر پوچھا۔ ''کوئی اور شرط ہو تو وہ بھی بتا دیجئے۔ بعد میں بکھیڑا پیدا نہ ہو۔''

''بس ایک مہینے کا کرایہ پیشگی دینا ہوگا۔ اس کے علاوہ اور کوئی شرط ورط نہیں۔''

ہر چند کہ علاقہ اجاڑ اور ویران تھا لیکن ایسے شاندار بنگلے میں صرف سو روپے ماہوار کرائے پر بغیر پگڑی کے رہائش مل جانا معجزہ ہی ہو سکتا تھا۔ شاید اللہ میاں کو ہماری پریشان حالی پر رحم آ گیا تھا۔

میں نے دبی زبان سے پوچھا۔ ''اس بنگلے میں آپ کے علاوہ اور کوئی نہیں رہتا؟''

''جی نہیں' میں اکیلا ہی رہتا ہوں۔ تنہائی میں بڑا دل گھبراتا ہے۔'' وہ بے تکلفی سے مسکرایا۔ ''آپ لوگ یہاں آ جائیں گے تو ذرا چہل پہل ہو جائے گی۔''

مجھے اس کی باتوں پر یقین نہ آیا۔ ایک بار پھر اس کی وضع قطع کا جائزہ لیا۔ موٹا سوتی کرتا' بے ترتیب گھنی داڑھی' سر منڈا ہوا' پیروں میں بوسیدہ جوتا' بھلا اس حلیے کا شخص اس بنگلے کا کس طرح اہل ہو سکتا ہے۔ ضرور کچھ نہ کچھ گڑبڑ ہے۔ صاف بات پوچھنے کی گنجائش نہ تھی۔

میں نے گھما پھرا کر دریافت کیا۔ ''یہ بنگلہ آپ نے خریدا ہے یا الاٹ ہوا ہے؟''

اس نے ہنس کر جواب دیا۔ ''نہیں صاحب! میں تو ملازم ہوں' بنگلہ تو ہمارے سیٹھ صاحب کا ہے۔''

اب سوال یہ پیدا ہوا ہے کہ جس کا بنگلہ ہے وہ اس میں رہتا کیوں نہیں؟ لہٰذا پوچھنا پڑا۔ ''کیا وہ کہیں باہر گئے ہیں؟''

''ان کی نہ پوچھئے۔'' وہ بے تکلفی سے بولا۔ ''کبھی کبھار ایک آدھ روز کے لیے یہاں آ کر ٹھہرتے ہیں۔ ورنہ ان کی اپنی کوٹھی تو باتھ آئی لینڈ میں ہے۔''

''ہمارے یہاں رہنے پر انہیں کوئی اعتراض تو نہ ہوگا؟''

وہ جلدی سے بولا۔ ''توبہ کریں جی' ان باتوں میں کیا رکھا ہے۔ اول تو انہیں پتہ ہی نہ چلے گا اور جو کبھی پوچھ بیٹھے تو کہہ دوں گا کہ میرے رشتہ دار ہیں۔ یہ ٹھیک رہے گا نا؟'' وہ بندر کی طرح کھیسیں نکال کر ہنسنے لگا۔

صورت حال اب بالکل واضح ہوگئی تھی۔ دراصل وہ بنگلے کے دو کمرے کرائے پر اٹھا کر اپنی آمدنی میں سو روپے کا اضافہ کرنا چاہتا تھا۔ مجھے کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ اعتراض تو اس کے ساتھ رشتہ داری جوڑنے پر بھی نہ تھا۔ یہاں تو آم کھانے سے غرض تھی پیڑ گننے نہیں آئے تھے۔

غرض کہ تمام ضرور معاملات اسی وقت طے ہوگئے۔ اب صرف ایک ماہ کا پیشگی کرایہ دے کر سامان لانا رہ گیا تھا۔

باتیں کرتے کرتے' رات کا ایک پہر گزر گیا۔ ہر طرف اندھیرا پھیل گیا۔ سناٹا گہرا ہوگیا تھا اور اس گہرے سناٹے میں' پتھر کی دیواروں والا' قدیم وضع کا بنگلہ بڑا ہیبت ناک لگ رہا تھا۔ سرما کی تیز ہوا کی سرسراہٹیں' صاف سنائی دے رہی تھیں۔ باہر درختوں کے نیچے خشک پتے رک رک کر کھڑکھڑا رہے تھے۔ ناگاہ بنگلے کے پھاٹک پر ایک کار آ کر رکی۔ رات کے سناٹے میں زور زور سے ہارن بجنے لگا۔

وہ شخص گھبرا کر بولا "سیٹھ صاحب آ گئے۔" اور فوراً کمرے سے باہر چلا گیا۔

ذرا دیر بعد احاطے میں درختوں کے نیچے خشک پتوں پر چاپ سنائی دی اور رفتہ رفتہ قریب آ تی گئی۔ پھر اس کمرے کا تالا کھلنے کی آواز ابھری جو بند تھا۔

چند منٹ بعد وہ شخص واپس آیا۔ مگر گھبرایا ہوا نظر آ رہا تھا۔ آتے ہی بولا "میں ذرا دیر کے لیے ایک کام سے جا رہا ہوں۔ آپ دونوں...." اس نے جملہ پورا بھی نہ کیا تھا کہ کسی نے بھاری بھرکم آواز میں پکارا۔ "شبدارا!!!" اس نے ہماری جانب پلٹ کر بھی نہ دیکھا' تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا چلا گیا۔

ہم دونوں خاموش بیٹھے اس کا انتظار کرتے رہے۔ سناٹا گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ تاریکی بڑھ گئی تھی۔ ہوا کے جھونکے تیز ہوجاتے تو خشک پتے کھڑکھڑاتے۔ پراسرار آہٹیں ابھرتیں۔

نکڑ والے کمرے سے ہلکی ہلکی سرگوشیوں کی آواز رک رک کر ابھرتی۔ کبھی کبھی ہلکا سا قہقہہ بھی بلند ہوتا۔

جب دیر تک شبدارا واپس نہ آیا تو میں نے اکتا کر سوچا' ذرا دیکھو تو اس کمرے میں کیا ہو رہا ہے۔ شاید شبدارا بھی وہاں موجود ہو۔ نہ جانے کہاں جا کر بیٹھ گیا۔ ایسا گیا کہ پلٹ کر خبر ہی نہ لی۔ سردی بڑھ گئی تھی اور ابھی ہم دونوں کو کئی میل جانا تھا۔ سنسان راستہ' رات کا وقت' اب زیادہ دیر وہاں ٹھہرنا کسی طور مناسب نہ تھا۔ اسی ادھیڑ بن میں ڈوبا' آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا کمرے کی جانب بڑھا۔

وہ کمرہ مشرقی رخ پر تھا۔ درمیان میں دو کمرے اور پڑتے تھے۔ میں نے پہلا کمرہ عبور کیا۔ دوسرے میں پہنچا۔ بیچ کے بند

دروازے سے‘ جو دونوں کمروں میں آمد و رفت کے لیے تھا‘ روشنی کی باریک شعاع پھوٹ رہی تھی۔ میں ہولے ہولے چلتا ہوا دروازے کے قریب پہنچا۔ جھری سے ایک آنکھ لگا کر اس کمرے میں نظر دوڑائی۔ کمرہ وکٹورین طرز کے نفیس اور قیمتی فرنیچر سے آراستہ تھا۔ کھڑکیوں پر شوخ رنگ کے ریشمی پردے لہرا رہے تھے۔ فرش پر دبیز قالین بچھا تھا۔ ایک گوشے میں جدید وضع کی مسہری تھی۔ مسہری کا سرہانا اونچا اور محراب نما تھا۔ اس پر خوبصورت نقش و نگار تھے۔ قریب ہی صوفہ سیٹ تھا۔ اس پر پستہ قد کا ایک بھاری بھرکم آدمی بیٹھا تھا۔ وہ قیمتی سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ ناک نقشہ بھدا تھا۔ مگر آنکھیں بڑی بڑی اور روشن تھیں۔ داڑھی مونچھ بالکل صاف تھی۔ سر گنجا اور بجلی کی ہلکی ہلکی سرخ روشنی میں تام چینی کے پیالے کی طرح چمک رہا تھا۔

سامنے میز پر وہسکی کی بوتل اور دو گلاس رکھے تھے۔ وہ شخص گردن جھکائے ایک گلاس میں وہسکی ڈالنے میں مشغول تھا۔ اس کے عین مقابل صوفے کی پشت سے سر ٹکائے ایک نوجوان عورت خوب بنی سنوری بڑے ٹھسے سے بیٹھی تھی۔ رنگ چمپئی تھا۔ آنکھوں میں دنبالہ کا جل تھا۔ بال سیاہ اور چمکدار تھے۔ گردن لمبی تھی۔ سرخ روشنی میں اس کا چہرہ شعلے کی مانند دہک رہا تھا۔

عورت نے اپنی لمبی گردن کو خم دے کر اس قدر آہستہ سے کچھ کہا کہ میں سن نہ سکا۔ وہ ٹانگ پر ٹانگ رکھے ایسے اشتعال انگیز ڈھب سے بیٹھی تھی کہ ساڑھی سرک کر بے ترتیب ہوگئی تھی اور ایک ٹانگ دور تک برہنہ ہوگئی تھی۔ گنجے سر والے مرد نے نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا‘ مسکرایا اور خالص رنڈی بازوں کے انداز میں آنکھ مار کر ایسا بیہودہ اور بازاری جملہ کہا کہ مجھے اپنے بدن میں جھرجھری سی محسوس ہوئی۔

اسی وقت کسی نے میری گردن کے پاس گہری سانس بھری۔ میں گھبرا کر مڑا۔ دیکھا احمد میری پشت پر کھڑا ہے۔ نہ جانے کب وہاں پہنچا تھا۔ ہماری نظریں ملیں تو فوراً گردن جھک گئیں۔ دونوں ہی سخت شرمندہ ہوئے۔

چند لمحے پشیمانی کے عالم میں ہم دونوں گم صم کھڑے رہے۔ بات کرنے کی گنجائش نہ تھی اور وہاں ٹھہرنا بھی مناسب نہ تھا۔ لہٰذا میں نے قدم اٹھایا اور آہستہ آہستہ دوسرے کمرے کی جانب چلا۔ احمد سر جھکائے میرے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ میں رکا نہیں۔ کمروں سے گزر کر برآمدے میں آ گیا۔

جب میں بنگلے سے باہر نکلنے لگا تو احمد نے ٹوکا۔ دبی زبان سے بولا۔ ”بھائی جان شبدار کے واپس آنے تک تو ٹھہر جائیے۔“

میں نے جل کر کہا۔ ”تم کو اگر اس سے بات کرنا ہے تو ٹھہر جاؤ۔ میں یہاں ایک لمحہ رکنا نہیں چاہتا۔ سخت واہیات جگہ ہے۔ لاحول ولاقوۃ!“

احمد نے مزید کچھ نہ کہا۔ ہم دونوں باہر آ گئے۔ درختوں کے نیچے سے گزرتے ہوئے احاطہ طے کیا۔ پھاٹک پر پہنچے۔ دیکھا' گہرے نیلے رنگ کی ایک لمبی چوڑی کار پھاٹک کے نزدیک ہی کھڑی ہے۔ کوئی اندر بیٹھا اطمینان سے سگریٹ پی رہا ہے۔ شاید ڈرائیور تھا۔ ہم کار کے قریب سے گزرے تو اس نے گردن باہر نکالی۔ جھک کر دیکھا مگر کوئی بات نہ کی۔

تمام راستے ہم دونوں خاموش رہے۔ نہ احمد نے کوئی بات چھیڑی اور نہ مارے ندامت کے مجھے بولنے کی ہمت ہوئی۔ گھر واپس پہنچ کر دیکھا۔ سب سو چکے تھے۔ بچوں نے میدان صاف پایا تو میرے بستر پر قبضہ کر لیا۔ بڑی مشکل سے ایک ایک کو گہری نیند سے بیدار کیا۔ دو تو مرغی کے چوزوں کی طرح حسب معمول پلنگ کے نیچے گھس گئے۔ بقیہ ایک قطار میں سامنے فرش پر لیٹ گئے۔ بیوی کا بستر کپڑوں کے ٹرنکوں پر لگا تھا۔ احمد مچان پر چلا گیا اور میں تھکا ہارا اپنے بستر پر دراز ہو گیا۔ جاڑوں میں ہماری راتیں اسی طور پر بسر ہوتی تھیں۔

مجھے دیر تک نیند نہ آئی۔ بستر پر پڑا سوچتا رہا کہ خواہ مخواہ احمد کے بھرے میں آ گیا۔ اس طرح کہیں مکان ملتا ہے۔ پتہ نہیں میری عقل کو کیا ہو گیا تھا۔ یہ بھی نہ سوچا کہ جس مکان میں رہتا ہوں چند برس پہلے اسے ہزار روپے دے کر پگڑی پر لیا تھا۔ اب اس کے پندرہ سول رہے تھے یعنی مکانوں کی قلت کم ہونے کی بجائے اور بڑھ گئی تھی۔

اس مکان کا حال بھی سن لیجئے' جس میں ان دنوں میری رہائش تھی۔ کسی زمانے میں یہ ایک وکٹوریہ والے کے پاس تھا۔ وہ اسے اپنی وکٹوریہ کے گھوڑے کے لیے بطور اصطبل استعمال کرتا تھا۔ اس میں آمدورفت کے لیے صرف ایک دروازہ تھا۔ کھڑکی کوئی نہ تھی۔ البتہ پچھلی دیوار میں ایک روشن دان ضرور تھا۔ اس سے ہوا اور روشنی تو کیا آتی' صرف یہ اندازہ ہو جاتا کہ دن ہے یا رات' ورنہ کمرے کے اندر دن رات برابر تھے۔ چوبیس گھنٹے بجلی کا ایک بلب روشن رہتا تھا۔ شروع شروع میں اس اصطبل سے نکل بھاگنے کی میں نے بہت کوشش کی' مگر جب کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی اور قسمت نے بھی یاوری نہ کی تو تھک ہار کر بیٹھ گیا۔ قناعت کرنے کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا۔

پچھلے سال احمد بھی کراچی آ گیا اور میرے ساتھ ہی رہنے لگا۔ ان دنوں وہ دفتر سے واپسی پر سیدھا گھر آتا اور کھانا کھا کر سر شام ہی پڑ کر سو جاتا۔ مگر میرے ایسے آدمی کے لیے جو شادی شدہ بھی ہو اور جس کے پاس رہنے کے لیے ایک ہی کمرہ ہو' احمد کچھ ہی عرصہ بھی مسئلہ بن گیا سوچتے سوچتے آخر کار میں نے اس مسئلے سے نمٹنے کی صورت نکال ہی لی۔ ایک روز دفتر سے لوٹا تو ایڈوانس بکنگ کرا

کے سینما کے سیکنڈ شو کا ایک ٹکٹ لیتا آیا۔ احمد کو ٹکٹ دے کر یہ بہانا تراشا کہ ایک ملنے والے دے گئے تھے۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں' تم جا کر فلم دیکھ آؤ۔ نسخہ کارگر ثابت ہوا۔ احمد خوشی خوشی سینما چلا گیا۔ بعد میں اکثر میں سینما کے ٹکٹ لاتا رہا اور وہ ٹھاٹھ سے فلم دیکھتا رہا۔

لیکن جس شخص کی تنخواہ مبلغ دو سو چوالیس روپے ماہانہ ہو اور جس کے دامن سے ایک نیک بخت اور چار عدد چنا پوئی لپٹے ہوں' زیادہ عرصہ ایسی عیاشی کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ لہٰذا میں نے سوچا کوئی ایسا طریقہ نکالا جائے جو کم خرچ اور بالانشین ہو۔ لیکن اس کی نوبت نہ آئی۔ ایک روز احمد خود ہی مسئلے کی اصل نوعیت سمجھ گیا۔ اسی روز سے اس نے مکان تلاش کرنے کے لیے بھاگ دوڑ شروع کر دی۔ کئی بار ناکامی کا منہ دیکھنے کے باوجود ابھی تک ناامید نہ ہوا تھا۔

وہ معمول کے مطابق رات گئے واپس آتا۔ چوروں کی طرح آہستہ سے دروازے کی چٹخنی کھولتا۔ اندر داخل ہوتا اور چپ چاپ مچان پر جا کر سو جاتا۔ انہی دنوں چھوٹے بچے کو کالی کھانسی ہو گئی۔ وہ اکثر سوتے سوتے جاگ اٹھتا اور کھانستے کھانستے رونا شروع کر دیتا۔ اس کے رونے سے دوسرے بچے بھی اٹھ کر بیٹھ جاتے۔ پھر سب مل کر ایک ساتھ روتے۔ رات کے سناٹے میں ان کی ملی جلی آوازیں اس غار نما کمرے میں گیدڑوں کے شور کی مانند بھیانک معلوم ہوتیں۔

ایک رات جب سب بچے اونچی نیچی آوازوں کے ساتھ کورس کے انداز میں رو رہے تھے کہ احمد بھی آ گیا۔ خلاف توقع وہ اس وقت بہت ہشاش بشاش نظر آ رہا تھا۔ اس نے لاپرواہی سے کوٹ اتار کر ایک طرف ڈالا۔ میرے قریب آیا۔ مسکرا کر گویا ہوا۔

''بھائی جان! آج آپ کو ایک زبردست خوشخبری سناؤں۔''

میں بچوں کی چیخ و پکار سے پہلے ہی بھنایا ہوا تھا۔ اس کی مسکراہٹ اور زندہ دلی بہت شاک گزری۔ جھنجھلا کر بیزاری سے بولا

''خواہ مخواہ پریشان مت کرو' جاؤ جا کر سو جاؤ۔''

اس کی مسکراہٹ کافور ہو گئی۔ گھگیا کر بولا۔ ''آپ میری بات تو سن لیجیے۔''

''مکان کی بات کے علاوہ کچھ اور کہنا چاہتے ہو تو کہہ سکتے ہو۔''

''بات تو مجھ مکان ہی کے بارے میں کرنی ہے۔''

میں جل کر بولا ''تب تو تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔''

مگر وہ باز نہ آیا۔ ''بس ایک بار میری بات اور مان لیجیے۔ اس دفعہ مکان نہ ملے تو آپ کبھی میری بات پر اعتبار نہ کیجیے گا۔''

ایک بار پھر میں اس کی باتوں میں آ گیا۔ کچھ دیر اس نے مکان کے بارے میں باتیں کیں اور مجھے مطمئن کرنے کی کوشش کرتا رہا پھر وہ مچان پر چلا گیا۔ میں خاموش لیٹا روشندان تکتا رہا جس سے چاندنی چھن چھن کر اندر آ رہی تھی اور کمرے کی نڈھال تاریکی میں زندگی کی ہلچل پیدا کر رہی تھی۔ میں چاندنی دیکھتے دیکھتے سو گیا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ یہ اتوار کی ایک سرد اور غبار آلود شام تھی۔ کوئٹہ کی تیز برفانی ہوا چل رہی تھی۔ آفتاب غروب ہوتے ہی بازاروں کی رونق اجڑنے لگی تھی۔ سڑکوں پر آمد و رفت کم ہو گئی تھی۔ ہم دونوں بھائی جب اس دو منزلہ کوٹھی کے احاطے میں داخل ہوئے تو بجلی کے کھمبوں پر بلب روشن ہو چکے تھے۔ دریچوں کے شیشوں سے شعاعیں پھوٹ رہی تھیں۔

اس دفعہ ایک ایسے شخص سے ملاقات ہوئی جو کسی سرکاری محکمے میں بڑا افسر رہ چکا تھا۔ اس کے دو بیٹے تھے اور دونوں ہی لندن میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ سب سے بڑی بیٹی تھی۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ پنڈی میں رہتی تھی۔ سال سوا سال بعد میکے آتی تھی، مگر پچھلے دو سال سے وہ بھی نہیں آئی تھی۔ آٹھ کمروں کی اس عالیشان کوٹھی میں صرف وہ تھا اور اس کی بیوی۔ اپنے میں یہ تفصیلات اس نے ہی بیان کی تھیں۔

وہ بڑی خندہ پیشانی سے پیش آیا۔ احمد سے اس کی ملاقات پہلے ہی ہو چکی تھی۔ مجھ سے مل کر اس نے خوشنودی کا اظہار کیا۔ ذرا دیر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں پھر اس نے خود ہی مکان کا ذکر چھیڑا۔

''سرکاری ملازمت چھوڑنے کے بعد میں نے ایکسپورٹ امپورٹ کا کام شروع کر دیا ہے۔ ٹیکسٹائل مل لگانے کا لائسنس بھی مل چکا ہے۔ فارن ایکسچینج کے لیے قرضہ بھی منظور ہو گیا ہے۔ تمام دن کاروبار کے سلسلے میں گھر سے باہر رہتا ہوں۔ صبح نکلتا ہوں اکثر رات گئے واپس آتا ہوں۔ میری بیگم اتنی بڑی کوٹھی میں تمام دن اکیلی رہتی ہے۔ ان کا دل تنہائی سے بہت گھبراتا ہے۔ چاہتا ہوں کوئی یہاں آ کر ٹھہر جائے تو ان کا دل بہل جائے گا۔''

وہ عمر کے اعتبار سے ادھیڑ تھا۔ سر کے بال اڑے ہوئے تھے۔ جسم بھاری بھرکم تھا مگر چہرے پر خوشحالی کی رونق تھی۔ لہجہ نرم اور شگفتہ تھا۔

اس کی پرکشش شخصیت سے میں خاصا متاثر ہوا۔ ساتھ رہنے پر رضامندی کا اظہار کیا تو وہ خوش ہو کر بولا۔ ''تو پھر سوچنا کیا ہے جب جی چاہے سامان لے کر آ جایئے۔ اوپر کی منزل بالکل خالی ہے۔ آپ اطمینان سے یہاں آ کر رہیں۔'' اس نے ہاتھ سے احمد کی جانب اشارہ کیا۔ ''آپ کے یہ چھوٹے بھائی میرے پاس آئے تھے۔ مکان کے سلسلے میں اپنی پریشانی بتاتے تھے۔ ان کی باتیں

سن کر دل تڑپ اٹھا۔ سوچا' کیسا ستم ہے؟ میں اتنی بڑی کوٹھی میں رہتا ہوں جس کے بیشتر کمروں کا میرے لیے کوئی مصرف نہیں اور ایک آپ ہیں کہ رات بسر کرنا بھی مسئلہ ہے۔ ایسی جگہ رہتے ہیں جہاں نہ روشنی ہے نہ ہوا۔ مجھے تو حیرت ہے کہ اتنا وقت آپ نے کس طرح بسر کیا۔''

نہ پوچھئے' کس مشکل میں وقت گزرتا ہے۔'' میں نے دل گرفتہ ہو کر کہا۔ ''کیا کیا جائے' مجبوری کا نام صبر ہے۔''

وہ اس قدر مہربان ہوا کہ کرایہ لینے پر بھی آمادہ نہ ہوا۔ میں نے اصرار کیا لیکن وہ کسی طور رضامند نہ ہوا۔ بار بار اظہار ہمدردی کرتا تھا۔ تسلی دیتا تھا۔ دلجوئی کی باتیں کرتا تھا۔ آدمی نہیں فرشتہ تھا۔ ایسی رقت طاری ہوئی کہ ایک بار تو جی چاہا کہ جھک کر اس کے پیر پکڑ لوں اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگوں۔

اس نے میرے چہرے کے تاثرات سے غالباً دلی کیفیت کا اندازہ لگا لیا تھا۔ مسکرا کر گویا ہوا۔ ''اب آپ اپنی پریشانی بھول جائیے۔ یہ بتائیے کب سامان لانے کا ارادہ ہے؟ میرا خیال ہے اوپر کی منزل کے تین کمرے آپ کے کنبے کے لیے کافی ہوں گے۔''

''جی ہاں' بالکل کافی ہوں گے۔'' اس دفعہ احمد بولا۔ اس کی آواز میں ہلکی ہلکی تھرتھراہٹ تھی۔ خوشی اور وارفتگی سے اسکی حالت بھی مجھ سے مختلف نہ تھی۔ مگر میں اپنے امڈتے ہوئے جذبات کا برملا اظہار نہ کر سکا۔ احمد نے کر دیا۔ ''آپ کا شکریہ کس طرح ادا کروں۔ میرے پاس اس کے لیے الفاظ نہیں ہیں۔ یوں سمجھ لیجئے.....''

''میاں صاحبزادے! یہ تکلفات چھوڑو۔ کام کی بات کرو۔'' وہ احمد کی بات کاٹ کر سرپرستانہ انداز میں بولا۔ ''میں تو اوپر کی پوری ہی منزل دے دیتا مگر ایک کمرہ میں اسٹڈی کے طور پر استعمال کرتا ہوں۔ خاص طور پر گرمی کے موسم میں رات کا بڑا حصہ اسی میں گزارتا ہوں۔ سبب اس کا یہ ہے کہ بہت ہوادار ہے۔ ویسٹ اوپن ہے۔'' وہ مسکرایا۔ ''یوں سمجھئے' گھر پر وہ میرا دفتر ہے۔''

میں نے ہچکچاتے ہوئے دریافت کیا۔ ''ہماری وجہ سے آپ ڈسٹرب تو نہیں ہوں گے؟''

''بالکل نہیں ہوں گا۔'' وہ بے تکلفی سے ہنسنے لگا۔ ''سوال یہ ہے کہ کہیں آپ کی پرائیویسی ڈسٹرب نہ ہو۔ ویسے میں عام طور پر اسے گرمی کے دنوں میں ہی استعمال کرتا ہوں۔ ابھی تو موسم سرما ہے۔''

''آپ آج کل بھی اسے استعمال کریں اور شوق سے استعمال کریں۔ ہم کو مطلق تکلیف نہ ہو گی۔'' احمد نے نہایت مستعدی سے اسے یقین دلایا۔

وہ بدستور ہنستا رہا۔ میں بھی مسکرانے لگا۔ احمد کے ہونٹوں پر بھی خوشی تبسم بن کر بار بار ہویدا ہو رہی تھی۔ غرض کہ سارے مراحل

نہایت خوش اسلوبی سے طے ہو گئے۔ وہ جلد ہی اس قدر گھل مل گیا گویا ہم ایک دوسرے کو سالہا سال سے جانتے ہیں۔

ذرا دیر بعد وہ اٹھ کر اندر چلا گیا۔ واپس آیا تو بیوی اس کے ہمراہ تھی۔ وہ دبلی پتلی سرو قد عورت تھی۔ کھلتا ہوا رنگ' پروقار چہرہ' سر کے بالوں میں جگہ جگہ سفید جھلک رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بڑی بڑی تھیں مگر ویران اور بجھی بجھی۔ انہیں دیکھ کر میں نے یہی محسوس کیا تھا۔ وہ چپ چاپ ایک صوفے پر بیٹھ گئی اور تمام وقت خاموش بیٹھی رہی۔ کبھی کبھار کسی بات پر زیر لب مسکراتی۔ نہایت بردبار اور کم سخن عورت تھی۔

نو بجے کا عمل ہوگا کہ ہم نے واپس جانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ لیکن وہ مصر ہو گیا کہ کھا کر جانا ہوگا۔ مجبوراً رات کا کھانا بھی وہیں کھایا۔ کافی کی ایک ایک پیالی بھی پی۔ اس نے گرم جوشی سے ہم دونوں کو رخصت کیا اور جلد سے جلد سامان لانے پر اصرار کیا۔

ہم دونوں کوٹھی سے باہر نکلے تو سناٹا گہرا ہو چکا تھا۔ سردی بڑھ گئی تھی۔ مگر احمد اپنی کامیابی پر خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ اس خود غرض اور نفسا نفسی کے زمانے میں ابھی کچھ ایسے نیک اور دردمند لوگ موجود ہیں جو کسی کو دکھ درد میں دیکھ کر تڑپ اٹھتے ہیں۔ ایسے بھلے اور خدا ترس انسان نہ ہوتے تو کب کی قیامت آ چکی ہوتی۔

سردی سے ہم دونوں ہی تھر تھرا رہے تھے اور سکڑے سکڑائے تیز تیز قدم اٹھاتے آگے بڑھ رہے تھے۔ مگر کوٹھی سے تھوڑی ہی دور گئے ہوں گے کہ پیچھے سے کسی نے آواز دی۔ ٹھٹھک کر ہم جہاں تھے وہیں رہ گئے۔ پلٹ کر دیکھا' ایک شخص اندھیرے سے نکل کر ہماری طرف آ رہا ہے۔ وہ بوڑھا اور کمزور تھا۔ لباس ملگجا اور ڈھیلا ڈھالا تھا۔ وضع قطع سے کسی کوٹھی کا ملازم نظر آتا تھا۔

قریب آیا تو میں نے حیرت سے پوچھا۔ ''کیا بات ہے بڑے میاں؟''

اس نے چبھتی ہوئی نظروں سے ہم دونوں کو اوپر سے نیچے تک دیکھا اور عجب بے تکی بات کہی۔ ''دیکھنے میں تو آپ دونوں ہی شریف اور بھلے مانس لگتے ہیں۔''

میں تو خاموش رہا مگر احمد سے ضبط نہ ہوا' تیکھے لہجے میں بولا ''تمہارے خیال میں ہم چور یا اٹھائی گیرے ہیں۔ تم کہنا کیا چاہتے ہو؟''

''ارے ارے' آپ تو برا مان گئے۔'' گھبرا کر اس نے معذرت کی۔ ''بخدا میرا ہرگز یہ مطلب نہیں۔''

''پھر کیا مطلب ہے؟'' میں نے اسے مشتبہ نظروں سے دیکھا۔

''میں تو آپ کو یہ بتانا چاہتا تھا کہ اس شخص کے چکر میں نہ پڑیئے گا۔'' اس نے دو منزلہ کوٹھی کی طرف مڑ کر نظر ڈالی۔ ''ایک نمبر

بدمعاش ہے۔"

میں حیران و پریشان ہو کر اس کا منہ تکنے لگا۔ وہ بغلوں میں ہاتھ دبائے سردی سے کپکپا رہا تھا۔ ہر طرف ہو کا عالم طاری تھا۔ دھندلی روشنی میں وہ سکڑا سمٹا عجیب اول جلول نظر آ رہا تھا۔ مجھے اس کی بات پر مطلق یقین نہ آیا۔ مگر زبان سے کچھ نہ کہا۔ احمد بھی خاموش رہا۔

ہم دونوں کو گم صم اور حیرت زدہ پا کر وہ گویا ہوا۔ "ارے صاحب! آپ اس کے کرتوت نہیں جانتے۔ میں تو پچھلے کئی سال سے اس کے پاس ملازم ہوں۔ مجھ سے زیادہ اس حرامی کو کون جانے گا۔ آپ کا تو ابھی اس سے سابقہ بھی نہیں پڑا۔"

میں تذبذب میں مبتلا ہو گیا۔ ہچکچاتے ہوئے دریافت کیا۔ "بڑے میاں! آخر معاملہ کیا ہے؟ صاف صاف بات کرو۔"

"بھئی اپنی سمجھ میں تو آیا نہیں' تم ایسی باتیں کیوں کہہ رہے ہو؟" احمد نے بھی اپنے شک وشبے کا اظہار کیا۔

"میں تو آپ کو خبردار کر رہا ہوں۔ آگے آپ کی مرضی۔" بوڑھے کے لہجے میں تلخی تھی۔ "صاف صاف سننا چاہتے ہیں تو وہ بھی سن لیجئے۔ یہ سالا ہمدرد بن کر پریشان اور ضرورت مند لوگوں کو اپنی کوٹھی پر بلا کر ٹھہراتا ہے۔ شروع شروع میں بڑی آؤ بھگت کرتا ہے۔ ایسی محبت اور شفقت جتاتا ہے کہ میں آپ سے کیا بتاؤں۔" اس نے قدرے توقف کیا۔ "بعد میں عورتوں پر طرح طرح سے ڈورے ڈالتا ہے۔ ان کی عزت خراب کرتا ہے۔"

میں تو دم بخود رہ گیا مگر احمد سے خاموش نہ رہا گیا۔ بگڑ کر بولا' "ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟"

"تو پھر ایسا کیجئے' چند روز رہ کر دیکھ لیجئے۔ خود ہی پتہ چل جائے گا۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔" اس نے تیکھے لہجے میں کہا۔

میں نے کرید کر پوچھا۔ "مگر اس کی تو بیوی بھی موجود ہے۔ اسے ان باتوں کی خبر نہیں۔"

"کیوں نہیں' خبر ہے۔ سب خبر ہے۔" بوڑھے نے بتایا۔ "لیکن وہ بیچاری کیا کر سکتی ہے۔ کچھ کہتی ہے تو اسے ہنٹر سے سڑاک سڑاک مارتا ہے۔ بڑا ترس آتا ہے اس پر۔ بہت صابر شاکر عورت ہے۔"

"بیٹی کے پاس پنڈی کیوں نہیں چلی جاتی؟"

"میں نے سمجھایا' بیٹی نے بھی زور دیا۔ مگر وہ ہمیشہ یہی کہتی ہے کہ "اب تو اس کے گھر سے جنازہ ہی نکلے گا۔ جیتے جی تو یہاں سے کہیں نہیں جاؤں گی۔" بوڑھے نے میرے دریافت کرنے پر کہا۔ "بیٹی سے ماں کی حالت دیکھی نہ گئی۔ باپ سے لڑ جھگڑ کر ایسی گئی کہ اب تک اس گھر میں قدم نہیں رکھا۔ لیکن اسے کسی کی پرواہ نہیں۔ روزانہ رات کو دبا کے شراب پیتا ہے اور پھر نشے میں ڈاؤن ہو کر

اودھم مچاتا ہے۔"

میں اس کی باتوں میں دلچسپی لیتے ہوئے دریافت کیا۔"ویسے تو بڑا بھلامانس اور نیک شخص نظر آتا ہے۔"

بوڑھا کہنے لگا۔"نہ پوچھیے' کتنا زبردست ایکٹر ہے۔ایسی ایکٹنگ کرتا ہے میں آپ سے کیا بتاؤں۔تب ہی تو لوگ دھوکا کھا جاتے ہیں اور اس کے چکر میں پھنس جاتے ہیں۔میرا کہا مانیے تو بھول کر بھی ادھر کا رخ نہ کیجیے۔چند روز تو بڑا مہربان رہے گا۔اس کے بعد اپنے ڈھب پر لانے کی کوشش کرے گا۔پھر بے آبرو کر کے سامان کوٹھی سے باہر پھنکوادے گا۔میں ایک مدت سے یہ تماشا دیکھ رہا ہوں۔"

میں حیرت سے آنکھیں پھاڑے بوڑھے کی باتیں سنتا رہا۔احمد بھی سر جھکائے خاموش کھڑا رہا۔

بوڑھا کہتا رہا۔"آپ کو میری باتوں کا یقین نہ ہو تو میرے ساتھ چل کر پڑوس کے ان ڈاکٹر صاحب سے پوچھ لیں۔"اس نے ایک کوٹھی کی جانب ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔"ابھی تو جاگ رہے ہوں گے۔وہ آپ کو بتائیں گے۔کس طرح ہر چار پانچ مہینے بعد اس کوٹھی میں کوئی نہ کوئی آ کر ٹھہرتا ہے اور پھر آدھی رات کو اس پر گالیاں پڑتی ہیں۔کیسے کیسے ذلیل کیا جاتا ہے اور نوکروں سے سامان پھنکوایا جاتا ہے۔"اس نے اپنی سفید داڑھی پر ہاتھ پھیرا۔"میں تو خدا کے غضب سے ڈرتا ہوں۔تب ہی تو اس جاڑے پالے میں آپ دونوں کو خبردار کرنے نکل آیا۔اسے نہ تو کسی کا ڈر ہے نہ خوف۔کوڑھی ہو کر مرے گا۔بدن میں کیڑے پڑیں گے۔"اس نے میری طرف نظر بھر کر دیکھا۔"صاحب! میرا کام آپ کو آگاہ کرنا تھا' وہ میں نے کر دیا۔آگے جیسے آپ کی مرضی۔"

میں نے بجھے ہوئے لہجے میں اسے یقین دلایا۔"نہیں' بڑے میاں تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔"مگر وہ اصرار کرنے لگا"یہ رہی سامنے ڈاکٹر صاحب کی کوٹھی۔ابھی آپ کو سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔صاحب میں تو بال بچے دار آدمی ہوں۔جیسی اپنی عزت ویسی دوسرے کی۔یہ سالا تو کسی سور کا نطفہ ہے۔نہ جانے اس کا کیا حشر ہو گا۔دل سے بددعا نکلتی ہے۔"

ہم دونوں نے بوڑھے کا شکریہ ادا کیا۔توبہ کی کہ بھولے سے بھی کبھی ادھر کا رخ نہ کریں گے۔

خیال تھا کہ اس عبرتناک واقعے کے بعد احمد نے مکان تلاش کرنے کا ارادہ دل سے نکال دیا ہو گا مگر وہ دھن کا پکا تھا۔مکان کی ٹوہ میں لگا رہا۔دن بھر دفتر میں کام کرتا۔رات گئے تک معمے حل کرتا اور جب واپس ہوتا تو گلی کوچے ویران ہوتے۔کتے اسے دیکھ کر زور زور سے بھونکتے۔

رات کے ایسے ہی سنسان لمحوں میں ایک بار پھر وہ میرے سر ہو گیا۔ میں نے ٹالنا چاہا۔ خفگی کا بھی اظہار کیا مگر وہ اپنی بات پر اڑا رہا۔ عاجزی سے بولا "یہ مکان دفتر کے ایک ساتھی نے بتایا ہے۔ اس کے ایک جاننے والے کا ہے۔ کہتا ہے بڑے معقول آدمی ہیں۔ کسی گڑبڑ کا امکان نہیں۔"

"تو پھر جا کر خود ہی معاملہ طے کر لو۔" میں نے بیزاری سے کہا۔ "میرے وہاں جانے کی ایسی کون سی ضرورت ہے۔"

"جی نہیں آپ کا چلنا ضروری ہے۔"

میں نے تیوری پر بل ڈال کر کہا۔ "میرا وہاں جانا کیوں ضروری ہے؟"

"میرا خیال ہے آپ کی موجودگی بہت ضروری ہے۔" اس نے دبی زبان سے بتایا۔ "کچھ ایسی ہی بات ہے۔"

میں نے لاکھ انکار کیا لیکن وہ خوشامد پر اتر آیا۔ گڑگڑانے لگا۔ آخر مجھے اس دفعہ بھی ہتھیار ڈالنا پڑے۔ اس کے ہمراہ چلنے کی حامی بھرنا پڑی۔

رات گزری۔ صبح ہوئی۔ ہم دونوں اپنے اپنے دفتر گئے۔ واپسی پر شام کو مکان کے لیے جانے کا پروگرام بنا۔ گھر سے نکلتے ہی ایک کانا مل گیا۔ کسی کا پتہ پوچھ رہا تھا۔ مجھ سے اس کی مڈبھیڑ بھی ہو گئی۔ میں مزاج کا کس قدر وہمی ہوں۔ دل میں شک پڑ گیا۔ جس قدر آگے بڑھتا گیا شک قوی ہوتا گیا۔ ستم بالائے ستم یہ کہ ایک بلی بھی راستہ کاٹ گئی۔ میں فوراً ٹھٹکا۔ آگے جانے کا ارادہ ترک کیا اور احمد کے ساتھ ہی واپس آ گیا۔ گھر میں داخل ہو کر ایک گلاس پانی پیا۔ ذرا دیر ٹھہر کر پھر باہر نکلا۔ احمد ہمراہ تھا۔ تمام راستہ خیریت سے کٹا۔ کوئی بدشگونی نہ ہوئی۔ منزل مقصود پر پہنچا۔ وہاں انتظار ہو رہا تھا۔ احمد کے رفیق کار سے بھی ملاقات ہوئی۔ سن تو اس کا زیادہ نہ تھا۔ مگر تھا بڑا زیرک' اور معاملہ فہم۔ نام البتہ بڑا بے تکا تھا۔ دل بند خان۔

فلیٹ ایک چار منزلہ عمارت کی دوسری منزل پر تھا۔ تین کمرے تھے۔ دو خاصے بڑے تھے۔ ایک قدرے چھوٹا تھا۔ ان صاحب سے بھی نیاز حاصل ہوا جن کا فلیٹ تھا۔ ادھیڑ تھے اور بردبار بھی۔ کسی غیر ملکی فرم میں ملازم تھے۔ گھر کی حالت دیکھ کر اندازہ ہوا کہ اپنی ہی طرح پریشان حال ہیں۔ فرق صرف اس قدر تھا کہ وہ ٹائم کیپر تھے اور میں ریکارڈ کیپر تھا۔

فلیٹ دیکھ لیا' پسند بھی آ گیا۔ اب تشویش یہ لاحق ہوئی کہ وہ اچھے بھلے رہتے بستے ہمارے لیے فلیٹ کیوں خالی کرنے لگے اور وہ بھی بغیر پگڑی کے۔ ان سے رسمی سی مختصر بات چیت ہوئی۔ نہ وہ کھلے نہ میں نے کرید کر حقیقت حال معلوم کرنے کی کوشش کی۔ لیکن ذہن میں الجھن برقرار رہی۔ واپسی پر دلبند خان ہمارے ساتھ تھا۔ اس نے میری الجھن کو تاڑ لیا۔

کہنے لگا۔ ''کہیے فلیٹ پسند آیا؟''

میں نے جواب دیا۔ ''فلیٹ تو اچھا ہے مگر مل جائے تب بات ہے۔''

''بالکل مل جائے گا' لیکن ایک شرط ہے۔''

حیرت زدہ ہو کر دریافت کیا۔ ''وہ کیا؟''

دلبند خان مسکرا کر بولا۔ ''احمد کی شادی کر دیجئے اور فلیٹ لے لیجئے۔''

بات پلے نہ پڑی۔ تجسس کے عالم میں پوچھا۔ ''بھئی احمد کی شادی سے فلیٹ کا کیا تعلق؟''

وہ بدستور مسکراتا رہا۔ ''بہت بڑا تعلق ہے۔''

احمد نظریں جھکائے خاموش چلتا رہا۔ میں بھونچکا ہو کر دلبند خان کا منہ تکنے لگا۔ اس دفعہ اس نے سنجیدگی سے کہا۔ ''فلیٹ جہیز میں ملے گا۔''

میں بات کی تہہ تک پوری طرح نہ پہنچ سکا۔ مزید وضاحت چاہی تو دلبند خان نے صاف گوئی سے کام لیا۔ سیدھی سیدھی معاملے کی بات کی۔ ''دیکھئے بات دراصل یہ ہے کہ امجد علی صاحب کی ایک سیانی لڑکی ہے۔ بے چارے مہاجر ہیں۔ دلی سے لٹ لٹا کر آئے ہیں۔ جہیز وہیز تو ان کے پاس ہے نہیں' شربت کے پیالے پر نکاح ہوگا۔ البتہ وہ یہ فلیٹ دے دیں گے۔''

اچھا تو یہ بات تھی جس کی وجہ سے احمد مجھے امجد علی کے گھر لانے پر اس قدر مصر تھا۔ مطلب یہ ہوا کہ وہ تو رضامند تھا۔ یہ اس کی سعادت مندی تھی کہ میری مرضی معلوم کرنا چاہتا تھا۔ گویا یہ مسئلہ اس نے مجھ پر چھوڑ دیا تھا۔ اب مجھے یہ طے کرنا ہے کہ رشتہ منظور کر لیا جائے یا نہیں۔

دلبند خان سے رخصت ہو کر گھر آیا۔ بیوی کو پوری بات بتائی۔ رات گئے تک باقاعدہ کانفرنس ہوئی۔ دوسرے روز بھی یہی ذکر چلا۔ کئی روز تک اس کا سلسلہ چلتا رہا۔ آخر یہ طے ہوا کہ بیوی آئندہ جمعہ کو پڑوس میں رہنے والی استانی رفیعہ بیگم کے ہمراہ پہلے لڑکی دیکھ آئے اس کے بعد شادی بیاہ کی بات چھیڑی جائے۔

خدا خدا کر کے جمعہ کا دن آیا۔ سہ پہر کو میری بیوی اور رفیعہ بیگم بن سنور کے گھر سے نکلیں۔ رکشا میں بیٹھ کر امجد علی کے فلیٹ پر پہنچیں۔ احمد نے رہنمائی کی۔ وہ دوسرے رکشا میں سوار تھا۔ بھاوج کو رفیعہ بیگم کے ساتھ فلیٹ کے دروازے پر چھوڑ کر کہیں چلا گیا۔

مجھے بیوی کی واپسی کا بے چینی سے انتظار تھا۔ ہر آہٹ پر چونک کر دروازے کی سمت دیکھتا۔ چراغ جلے واپسی ہوئی۔ دیکھا

بیوی کا منہ لٹکا ہوا ہے۔ فوراً ماتھا ٹھنکا کہ بات نہیں بنی۔ دھڑکتے دل سے پوچھا۔ ''خیریت تو ہے' اس قدر پریشان کیوں نظر آ رہی ہو؟''

تڑ سے جواب دیا۔ ''مجھے تو رشتہ بالکل پسند نہیں۔''

''بات کیا ہوئی؟ صاف صاف بتاؤ۔''

''صاف صاف بات یہ ہے کہ لڑکی صورت شکل کی اچھی نہیں۔ رنگ کالا ہے۔ سن بھی زیادہ ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ لوگ بھی اچھے نہیں۔ مجھے تو کوئی نیچ قوم کے معلوم ہوتے ہیں۔ گھر کے رکھ رکھاؤ اور بات چیت سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے۔''

احمد بھی اس وقت موجود تھا۔ بھاوج کی باتیں سن کر اس کا چہرہ مضمحل ہو گیا۔ چپ چاپ اٹھ کر باہر چلا گیا۔ میں نے بھی بیوی سے مزید بات چیت نہ کی۔ جب کوئی بھی بات ڈھنگ کی نہ ہو تو پھر سوچ بچار کرنا فضول تھا۔

بات کے آگے بڑھنے کا کوئی امکان نہ رہا تھا۔ کم از کم ہم میاں بیوی نے تو اس رشتے کو مسترد ہی کر دیا تھا۔ لیکن تیسرے یا چوتھے روز دفتر سے واپسی پر احمد نے دبی زبان سے ایک ایسی بات کہی جس سے صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ امجد علی کی بیٹی سے شادی کرنے پر ابھی تک آمادہ ہے۔ اس نے گھما پھرا کر بات کی۔

پوچھا۔ ''بھائی جان! آپ نے فلیٹ کے بارے میں کیا سوچا؟''

''اس روز تم نے اپنی بھابی کی باتیں تو سن ہی لی تھیں۔'' میں نے بے نیازی سے کہا۔ ''اس کے بعد کچھ سوچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

''وہ بھابی کی رائے تھی۔ میری مرضی آپ پوچھیں تو میں یہی کہوں گا کہ اگر فلیٹ ملتا ہے تو ساری باتیں میرے نزدیک ٹھیک ہی ہیں۔'' اس نے کھل کر اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا۔

اس وقت تو میں ٹال گیا لیکن وہ باز نہ آیا۔ اشارے کنارے میں اصرار کرتا رہا۔ آخر جب میں نے دیکھا کہ وہ اس رشتے پر تلا ہی ہوا ہے تو دل میں کہا۔ خواہ مخواہ رخنہ کیوں ڈالا جائے۔ لڑکی بدشکل ہے' کالی کلوٹی ہے' جیسی بھی ہے زندگی تو اس کے ساتھ احمد ہی کو بسر کرنا ہے۔ یہی سوچ کر بیوی کو استانی رقیہ بیگم کے ساتھ دوبارہ امجد علی کے گھر بھیجا کہ رشتے کی بات پکی کر لی جائے۔ دونوں وہاں پہنچیں مگر تاخیر سے پہنچیں۔ کوئی اور امیدوار اس دوران وہاں پہنچ گیا تھا۔ وہ فلیٹ کے لیے احمد سے زیادہ حاجت مند تھا۔ چند ہی روز قبل امجد علی کی بیٹی کے ساتھ اس کی منگنی ہو چکی تھی۔

سردی ختم ہو رہی تھی۔ گرمی کی آمد آمد تھی۔ جس کے تصور ہی سے وحشت ہوتی تھی۔ جاڑے کی راتیں تو کسی نہ کسی طور کٹ ہی جاتی تھیں۔ لیکن گرمی میں اس غار نما کمرے کے اندر حبس سے دم گھٹتا تھا۔ شام ہوتے ہی گھٹن بڑھتی' سانس لینا دوبھر ہو جاتا۔ پھر بھی پہر رات اس قید خانے میں بسر کرنا ہی پڑتی۔ جب رات کا سناٹا بڑھ جاتا اور گلی میں آمدورفت کم ہو جاتی تو باہر دروازے کے ساتھ بستر لگائے جاتے۔ یہ ایک اونچی عمارت کے پچھواڑے تھوڑا سا کھلا ہوا حصہ تھا۔ پتھر کا فرش تھا۔ تمام دن چلچلاتی دھوپ میں تپتا تھا۔ بچے دن ڈھلتے ہی چھڑکاؤ کرتے۔ جلتی زمین کی تپش کم کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

لیکن اس جگہ بھی ہمارے لیے چین نہ تھا۔ اوپر فلیٹوں میں رہنے والے اکثر کوڑا کرکٹ کھڑکیوں سے نیچے پھینکتے۔ پان کی پیک تھوکتے اور چوتھی منزل پر رہنے والے وکیل صاحب تو باقاعدہ پیشاب بھی اسی طرف کرتے تھے۔ یہ ان کا معمول تھا۔ کئی بار احتجاج کیا۔ خاصا ہنگامہ بھی برپا ہوا۔ مگر وکیل صاحب کے پروگرام میں فرق نہ آیا۔ وہ عام طور پر ایک اور دو بجے کے درمیانی عرصے میں یہ شغل فرماتے تھے۔ اس پرآشوب وقت کے لیے ہم میاں بیوی میں سے باری باری کسی ایک کی ڈیوٹی مقرر ہوتی۔ ادھر وکیل صاحب شروع ہوئے ادھر بیوی جھٹ مجھے جگاتی۔ ہم دونوں جلدی جلدی بچوں کو جھنجھوڑے۔ "اٹھو بارش ہو رہی ہے۔" بے چارے نیند سے آنکھیں ملتے اپنا اپنا بستر گھسیٹ کر بھاگتے۔ پہلے پہل تو ہم میاں بیوی وکیل صاحب کو کوستے بھی رہے۔ پھر کوسنا اور بددعائیں دینا بھی بند ہو گیا اور پھر ایسا وقت بھی آیا کہ سویرے اٹھ کر ہم کو پتہ چلتا کہ رات کو وکیل صاحب کا پروگرام ہوا تھا اور معمول کے مطابق ہوا تھا۔

گرمی کا موسم جس قدر قریب آ رہا تھا احمد نے مکان کے لیے اسی قدر شدت کے ساتھ دوڑ دھوپ تیز کر دی تھی۔ اسی چکر میں ایک بار خواہ مخواہ گالیاں بھی سنا پڑیں اور پٹتے پٹتے بال بال بچے۔ خاصا دلچسپ اور ہوشربا حادثہ تھا۔ ہوا یہ کہ مجھے حسب معمول اصرار کر کے ایک صاحب کے پاس لے گئے جو بقول اس کے بڑے خدا ترس اور نیک دل بزرگ تھے۔ دنیا تج کر عاقبت سنوارنے کی فکر میں تھے۔ ساری زندگی مکہ معظمہ میں یادالٰہی میں بسر کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔

ملاقات ہوئی۔ تو بہت شفقت اور محبت سے پیش آئے۔ اصرار کر کے چائے پلائی' دیر تک زمانے کی بے راہروی کا رونا روتے رہے۔ بڑھتی ہوئی نفسا نفسی اور خود غرضی پر کڑھتے رہے' اخلاق زبوں حالی پر خاصا لمبا لیکچر دیا۔ کبھی لہجہ ترش ہو جاتا کبھی شیریں۔ دیر تک جب وہ اپنی نصیحتوں سے فیض یاب کر چکے تو احمد نے دبی زبان سے مدعا بیان کیا۔

پوچھا ''کب تک مکہ مکرمہ جانے کا قصد ہے؟''

ٹھنڈی سانس بھر کر بولے ''دیکھو کب بلاوا آتا ہے؟'' آواز میں رقت تھی۔ آنکھیں پرنم تھیں۔ ''یہاں تو رخت سفر باندھے بیٹھے ہیں۔'' ان کی یہ کیفیت دیکھی تو میں بھی بڑا متاثر ہوا۔ چہرہ بھی ان کا نورانی تھا۔ دودھ کی مانند سفید داڑھی۔ اجلی رنگت' آنکھوں میں سرمہ۔ اس وقت کچھ زیادہ ہی نور برس رہا تھا۔ کم از کم میں نے تو یہی محسوس کیا۔

احمد نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ''فی الحال تو آپ سکھر جائیں گے۔ اسی روز یہی فرما رہے تھے۔''

کہنے لگے۔ ''بھئی وہاں جانا تو ضروری ہے۔ چاہتا ہوں حرم شریف کے لیے روانگی سے پہلے عزیز و اقارب سے مل لو۔ سب وہیں ہیں۔'' ایک بار انہوں نے بیقرار ہو کر ٹھنڈی سانس بھری۔

''میاں زندگی کا کیا اعتبار۔ آج مرے کل دوسرا دن۔ ویسے یہ دنیا اب رہنے کی جگہ بھی نہیں رہی' یہ جائے عبرت ہے۔ گناہوں سے بھری ہے۔ اس سے جس قدر چھٹکارا مل جائے اتنا ہی اچھا ہے۔ پہلے ہی گناہوں کے بوجھ سے لدا ہوں۔ جب تک سانس کی آمد ورفت کا سلسلہ جاری ہے اس بوجھ میں اضافہ ہی ہونے کا خوف دامن گیر رہتا ہے۔''

وہ پھر پٹری سے اتر گئے۔ ایک بار پھر ان پر وعظ فرمانے کا دورہ پڑا۔

احمد نے فوراً انہیں ٹوکا۔ حرف مطلب زبان پر لایا۔ ''اجازت ہو تو تھوڑا سا سامان یہاں پہنچا دیا جائے۔ یاد ہے نا' کل آپ ہی نے اس خواہش کا اظہار فرمایا تھا۔''

مگر انہوں نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں۔ بت بنے سامنے کی دیوار تکتے رہے۔ شامت اعمال میں بول اٹھا۔ ''بہر حال یہ تو طے ہے کہ اپنا یہ فلیٹ آپ ہم ہی کو دے کر مکہ مکرمہ جائیں گے۔''

بیٹھے بٹھائے دفعتاً نہ جانے انہیں کیا ہوا۔ قہر آلود نظروں سے مجھے دیکھا۔ ایک دم جلال میں ایسے آئے کہ چہرے کا نور کافور ہو گیا۔ جھنجلاہٹ طاری ہو گئی۔ آنکھیں سرخ پڑ گئیں۔ نہایت بے رخی سے بولے۔ ''میں اپنا فلیٹ آپ کو کیوں دینے لگا۔ آپ میرے کون سے سگے سوتھرے لگتے ہیں؟'' ان کا لہجہ دم بہ دم تلخ ہوتا گیا۔ ''اسی شہر میں میرے دو حقیقی بھانجے موجود ہیں۔ نالائق ہوئے تو کیا ہوا ہیں تو میری بہن کی اولاد۔''

میں دم بخود رہ گیا۔ عالم یہ تھا کہ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔ احمد نے پریشان ہو کر میری طرف دیکھا۔ خود کو سنبھالا۔ یاد دہانی کی غرض سے اپنی بات پر زور دے کر بولا۔ ''قبلہ! کل ہی شام کا تو ذکر ہے۔ آپ نے خود ہی فرمایا تھا۔ بار بار یقین دلاتے تھے' تسلی و تشفی

دیتے تھے۔"

انہوں نے اس کی پوری بات بھی نہ سنی تھی۔ غصے سے لال پیلے ہو کر دھاڑے۔" آپ سخت احمق اور غبی معلوم ہوتے ہیں جو اس طرح آنکھ بند کر کے میری بات مان لی۔" ان کے ہونٹوں پر زہر خندا ابھرا۔" بھئی حد ہو گئی۔ اللہ نے آپ کو عقل دی ہے۔ اتنا تو سوچا ہوتا کہ کراچی میں کوئی اس طرح پھوکٹ میں کسی کو اپنا فلیٹ دیتا ہے۔ میں نے اسے پانچ ہزار نقد دے کر پگڑی پر لیا تھا۔ کیا سمجھے؟"

احمد ٹپٹایا۔ حیران و پریشان ہو کر بولا۔" آپ نے خود ہی کامل صاحب سے کہہ کر بلوایا تھا۔ میری پریشانی سن کر دیر تک اظہار ہمدردی کیا تھا۔ خود ہی فلیٹ دینے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ بلکہ میں نے تو پگڑی کے بارے میں پوچھا بھی تھا۔ آپ نے سختی سے منع کر دیا کہ ایسی بات زبان پر نہ لاؤں۔" اس نے جلدی جلدی اپنی صفائی پیش کی۔ لہجے میں عاجزی پیدا کی۔ چند لمحے وہ خاموش بیٹھا رہا' پھر دبی زبان سے گلہ کیا۔" سمجھ میں نہیں آتا۔ آپ اچانک اس قدر بدگمان کیوں ہو گئے۔ اگر کوئی گستاخی ہو گئی ہو تو درگزر کریں۔" وہ گڑگڑا کر معذرت کرنے لگا۔

لیکن اس بندہ خدا پر مطلق اثر نہ ہوا۔ جھنجھلا کر بولے۔" کون کامل؟ وہ چرب زبان لفنگا۔" وہ اور بپھر گئے۔" تم دونوں بھی مجھے لچے لفنگے معلوم ہوتے ہو۔ دھوکا دے کر میرا فلیٹ ہتھیانا چاہتے ہو۔" ان پر سخت ہذیانی کیفیت طاری ہو گئی۔ آنکھوں سے چنگاریاں اڑنے لگیں۔ منہ سے کف جاری ہو گیا۔" تم مجھے الو کا پٹھا سمجھتے ہو۔ میں تمہارا سر توڑ دوں گا۔" انہوں نے جھٹ چائے کی پیالی اٹھائی۔ احمد کے سر کا نشانہ باندھا اور پیالی پھینک کر ماری۔ مگر وہ چوکنا ہو چکا تھا۔ سر جھکا کر ان کا نشانہ صاف بچا گیا۔

پیالی دیوار سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گئی۔ کمرے میں زور کا چھناکا ہوا۔ میرا دل بے اختیار دھڑکنے لگا۔ یا الٰہی یہ کیا مصیبت نازل ہوئی۔ خوشی خوشی فلیٹ لینے گئے تھے۔ لینے کے دینے پڑ گئے۔ ہوش ٹھکانے نہ رہے۔

قبل اس کے کہ وہ دوسری پیالی اٹھائیں اور احمد کا سر کا دوبارہ نشانہ باندھیں وہ اٹھ کر تیزی سے دروازے کی جانب لپکا۔ میں اپنی پشاوری چپل اتارے اطمینان سے بیٹھا چائے پی رہا تھا' احمد کو بھاگتے دیکھا تو چپل چھوڑ کر اسے پیچھے بھاگا۔ اس وقت تک وہ دوسری پیالی اٹھا چکے تھے۔ میں دروازے سے باہر نکل ہی رہا تھا کہ کمر پر بھد سے پیالی لگی اور فرش پر گر کر چکنا چور ہو گئی۔ میں نے نہ چوٹ کی طرف دھیان دیا نہ پلٹ کر دیکھا۔ چھپاک سے باہر نکلا۔

آگے آگے احمد اور اس کے پیچھے میں۔ دونوں دھڑ دھڑ کرتے' قلانچیں بھرتے تیزی سے زینے کی سیڑھیاں طے کر رہے تھے اور ہماری پشت پر ان بزرگوار کی ڈانٹ پھٹکار ابھر رہی تھی۔

"اُبے ذرا ٹھہر جاؤ۔ میں ابھی تم کو فلیٹ دیتا ہوں۔ الو کے پٹھے' حرام زادے۔ تمہاری تو....."

دور تک ان کی گالیوں کی آواز سنائی دیتی رہی۔ خدا معلوم وہ شخص پاگل خبطی تھا یا واقعی میری بات سے مشتعل ہو گیا تھا۔ بہرصورت اس روز دونوں بال بال بچ گئے۔ ورنہ آنکھ ناک ضرور پھوٹتی گھر کی بجائے ہسپتال جانا پڑتا۔ بڑے بے ڈھب اور جنونی سے پالا پڑا تھا۔

واپس گھر پہنچ کر میں احمد پر خوب برسا۔ مفت خدا کی ذلت اٹھانی پڑی اور نئی چپل سے بھی ہاتھ دھونا پڑے۔ احمد سے صاف صاف کہہ دیا کہ آئندہ مکان کے سلسلے میں بھول کر بھی بات نہ کرے۔ کچھ تو میری خفگی اور کچھ اس آفت ناگہانی کی پشیمانی' وہ اس قدر بددل ہوا کہ واقعی اس نے مکان کا تذکرہ کرنا بالکل چھوڑ دیا۔

کچھ ہی عرصے بعد احمد میں طرح طرح کی تبدیلیاں نظر آنے لگیں۔ اب وہ بے حد لاپرواہ ہو گیا تھا۔ اکثر گھر میں کھانا بھی نہ کھاتا۔ ہر وقت اس کے چہرے پر گہرا سکوت طاری رہتا۔ کبھی چھیڑ کر بات کرنے کی کوشش بھی کی تو ہوں ہاں کر کے چپ ہو جاتا۔ ایک انوکھی بات یہ پیدا ہو گئی تھی کہ پیسے پیسے پر جان دینے لگا تھا۔ پہلے اپنی تنخواہ کے دو سو روپے ہر ماہ لا کر مجھے دیتا تھا۔ اب اس نے یہ سلسلہ یک لخت بند کر دیا تھا۔ حالانکہ اس کی آمدنی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ اس کی صورت یہ تھی کہ سویرے ہی سویرے ایک ٹیوشن کے لیے نکل جاتا۔ دن بھر دفتر میں ڈیوٹی دیتا۔ شام کو کسی فرم میں کام کرتا۔ ماسٹر رحمت علی کے بیان کے مطابق رات کو سٹہ بھی کھیلتا تھا۔

وہ روزانہ بہت تڑکے گھر سے باہر جاتا اور آدھی رات کے بعد لوٹتا۔ صرف اتوار کو گھڑی دو گھڑی کے لیے نظر آتا۔ اس کی صحت بھی برابر گرتی جا رہی تھی۔ چہرہ مرجھا کر زرد پڑ گیا تھا۔ آنکھیں اندر دھنس گئی تھیں ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ جواریوں اور سٹے بازوں کی صحبت میں رہ کر چرس پینے لگا تھا یا قمار بازی میں بے تحاشا ہار رہا تھا۔

میرا شک اس روز اور قوی ہو گیا جب سینما کے سیکنڈ شو سے واپسی پر ایک ایرانی چائے خانے میں اسے چند ایسے افراد کے ساتھ بیٹھے ہوئے دیکھا جو وضع قطع سے اوباش اور بدقماش نظر آتے تھے۔ وہ ہنس ہنس کر ان سے خالص بازاری لہجے میں باتیں کر رہا تھا۔ سگریٹ کے لمبے لمبے کش لگا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ سٹے کے بھاؤ کے بارے میں ایک ایک سے پوچھ رہا تھا اور اس شغل میں اس قدر ڈوبا ہوا تھا کہ اسے یہ بھی خبر نہ ہوئی کہ میں اس کے نزدیک ہی کھڑا ہوں۔

اس سے بات کرنا مناسب نہ معلوم ہوا۔ خاموشی سے پلٹا۔ گھر واپس آ کر سوچا کہ مجھے احمد کی جانب سے اس طرح غافل نہیں رہنا چاہیے۔ ورنہ وہ بالکل تباہ ہو جائے گا۔ ادھر دو سو روپے ماہانہ کی یافت ختم ہو جانے کے باعث میری بیوی بھی احمد سے سخت برگشتہ

تھی۔ بات بات پر طعنے دیتی تھی' مجھے اشتعال دلاتی تھی۔

میں سخت ذہنی کشمکش میں مبتلا تھا۔ سوچ رہا تھا کہ احمد کے بارے میں کیا رویہ اختیار کیا جائے۔ انہی دنوں ایک شام کو دفتر سے لوٹا تو کیا دیکھتا ہوں کہ بیوی بیٹھی زاروقطار رو رہی ہے۔ معلوم ہوا کہ احمد خلاف معمول دفتر سے جلدی واپس آ گیا تھا۔ کسی بات پر بھاوج سے تکرار ہوئی۔ بیوی کے بیان کے مطابق اس نے نہ صرف برا بھلا کہا بلکہ آنکھیں نکال کر مارنے کے لیے کھڑا ہو گیا۔ میں نے خاموشی سے ہر بات سنی اور اسی وقت طے کیا کہ رات کو واپسی پر احمد سے صاف صاف کہہ دوں گا کہ وہ اپنے رہنے کا کہیں اور بندوبست کر لے۔ اب وہ میرے لیے ناقابل برداشت بن گیا تھا۔

برسات کی اندھیری رات تھی۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ ہوا بند تھی۔ سخت حبس اور گھٹن تھی۔ میں نے بستر نکال کر گھر کے باہر لگایا ہی تھا کہ اچانک بوندیں پڑنے لگیں۔ مجبوراً اندر واپس آ گیا۔ اندر حبس اور گرمی سے یہ عالم تھا کہ جسم ابلا جا رہا تھا۔ لاکھ کوشش کی لیکن نیند نہ آنا تھی' نہ آئی۔ بے چینی میں خاصی رات گزر گئی۔ آدھی رات کو کسی نے دروازے پر دستک دی۔ گھبرا کر اٹھ بیٹھا کہ رات گئے کون آیا۔ دروازہ کھولا تو احمد سامنے کھڑا تھا۔ اس کے ہمراہ ایک عورت تھی۔

احمد نے کوئی بات نہیں کی۔ وہ خاموشی سے اندر داخل ہوا۔ عورت بھی اس کے ساتھ ساتھ اندر گئی۔ احمد نے سوئچ دبا کر بلب روشن کیا۔ عورت کو اسٹول پر بٹھایا اور خود کونے میں رکھا ہوا اپنا ٹرنک کھولنے لگا۔ عورت سیاہ برقع پہنے ہوئے تھی مگر چہرے سے نقاب اٹھی ہوئی تھی۔ رنگ تو اس کا گندمی تھا لیکن ناک نقشہ سبک تھا۔ آنکھیں بھی خوبصورت تھیں۔ اس میں عجب سی تیز چمک تھی۔ عمر یہی کوئی ستائیس اٹھائیس کے لگ بھگ تھی۔ میری بیوی بھی اٹھ کر بستر پر بیٹھ چکی تھی۔ میری طرح وہ بھی اس برقع پوش عورت کو حیرت زدہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

اس نے کوئی بات نہ کی۔ قریب رکھا ہوا پنکھا اٹھا لیا۔ خاموش بیٹھی پنکھا جھلتی رہی۔ کبھی کبھی نظریں گھما کر احمد کی جانب دیکھ لیتی جو ٹرنک پر جھکا ہوا تھا۔ اس کی پشت ہماری طرف تھی' نہ معلوم وہ کیا کر رہا تھا۔

عورت بے نیازی سے بیٹھی پنکھا جھلتی رہی۔ ذرا ہی دیر بعد احمد پلٹا۔ آہستہ آہستہ چلتا ہوا قریب آیا۔ ہاتھ میں دبا ہوا ریشمی رومال کھول کر عورت کے سامنے کیا۔ میں ششدر رہ گیا۔ دیکھا رومال میں بہت سے نوٹ رکھے ہیں۔

عورت نے رومال اٹھا کر دریافت کیا۔ ''کتنے ہیں؟''

احمد نے سر جھکا کر آہستہ سے کہا۔ ''سولہ سو بائیس ہیں۔'' اس کی آواز میں ہلکی ہلکی کپکپاہٹ تھی۔ عورت نے کچھ نہ کہا۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔

میری سمجھ میں مطلق نہ آیا کہ یہ کیا ڈرامہ رچایا جا رہا ہے۔ بیوی بھی حیران و پریشان سکتے کے عالم میں بیٹھی تھی۔ آخر احمد نے اس پراسرار خاموشی کو توڑا۔ عاجزی سے بولا۔ ''میرے پاس کل اتنی ہی رقم ہے۔ مجھے معلوم ہے' آپ کا فلیٹ چار ہزار سے کم پگڑی پر نہ جائے گا۔ لیکن میں بہت غریب آدمی ہوں۔ خدا بہتر جانتا ہے' میں بہت غریب ہوں۔'' یہ کہتے کہتے اس کی آواز بھرا گئی۔ وہ بے اختیار رو پڑا۔ آنسوؤں کے قطروں سے اس کی پلکیں بھیگ گئیں۔

''ارے یہ آپ کو کیا ہو گیا'' وہ مسکرا کر بولی۔ ''مرد ہو کر زنانیوں کی طرح ٹسوے بہانے بیٹھ گئے۔ میں نے جی فلیٹ آپ کو دیا اور یہ روپے بھی اپنے پاس ہی رکھیں۔''

اس نے رومال نوٹوں کے ساتھ احمد کے ہاتھ میں تھما دیا۔ میں نے غور کیا۔ احمد کا چہرہ اس وقت خاصا ڈراؤنا نظر آ رہا تھا۔ رخساروں کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں۔ چہرہ مٹیالا پڑ گیا تھا۔ آنکھیں ویران تھیں۔ اس نے رومال کی جانب دیکھا اور بڑی بھونڈی آواز میں روتے ہوئے بولا۔ ''نہیں' میں یہ روپے واپس نہیں لوں گا۔'' وہ سسکیاں بھرنے لگا۔

وہ بڑی دبنگ عورت تھی۔ کہنے لگی۔ ''میں نے یہ روپے نہیں لینے۔ اگر لوں تو میرے کفن میں لگیں۔''

احمد کے لیے مزید اصرار کرنے کی گنجائش نہ رہی۔ کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ چند لمحے بعد وہ میری جانب مخاطب ہوئی۔ ''میرا نام بختاور ہی جی۔ ہوں تو کنجری' پر دل چھوٹا نہیں رکھتی۔ اللہ میرے دھندے میں برکت دے' بہت کمائی کرلوں گی۔ پروا نہ کریں جی۔''

میں گم صم بیٹھا رہا' احمد بھی چپ رہا۔ اس کے ایک ہاتھ میں سولہ سو بائیس روپے رومال میں لپٹے ہوئے دبے تھے۔ بختاور نے برقع اتار کر ایک طرف رکھ دیا۔ وہ پھول دار ریشمی قمیض اور لٹھے کی اجلی شلوار پہنے ہوئے تھی۔ جسم سڈول تھا۔ قد نکلتا ہوا تھا۔ کولہے قدری بھاری تھے۔ لباس سے ہلکی ہلکی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ وہ بھرپور جوان اور طرح دار عورت تھی۔

حبس سے دم گھٹتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ سخت گرمی تھی۔ بختاور گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی اور زور زور سے پنکھا جھلتے ہوئے بولی۔ ''یہاں تو جی سخت گرمی ہے۔ میرا کہا مانیں تو کچھ سامان لے کر ابھی میرے ساتھ چلیں۔ اس جگہ تو رات کاٹنی عذاب ہو جائے گی۔''

''ہمیں تو اس دوزخ میں رہتے ہوئے سال ہو گئے۔'' یہ میری بیوی کی آواز تھی۔ وہ دل گرفتہ ہو کر اپنا دکھ بیان کر رہی تھی اس کی

بات سن کر بختاور اور بھی زیادہ متاثر ہوئی۔ کہنے لگی۔ ’’بھین جی! میں نے آپ کو اس کھولی میں اب نہیں رہنے دینا۔‘‘

بختاور نے اصرار کر کے احمد سے وکٹوریہ منگوائی۔ بار بار انکار کے باوجود اس نے میری بیوی اور اس کے ساتھ بچوں کو وکٹوریہ میں سوار کرا دیا۔ کچھ ضروری سامان اس میں رکھا۔ گھر کے دروازے پر قفل ڈالا گیا۔ بختاور نے برقع اوڑھا۔ وکٹوریہ میں جا کر بیٹھی۔ مجھے اور احمد کو بھی بٹھایا۔ وکٹوریہ آگے بڑھی۔ بوندا باندی رک چکی تھی۔ سڑک گیلی تھی۔ وکٹوریہ میں جتا ہوا گھوڑا سنبھل سنبھل کر چل رہا تھا۔ آسمان پر کالے کالے بادل چھائے تھے۔ رات گرم اور اندھیری تھی۔

راستے بھر میں اور احمد خاموش رہے۔ بیوی بھی گم صم بیٹھی تھی۔ بچے نیند سے جھول رہے تھے۔ بختاور نے پرس کھولا۔ سگریٹ کا پیکٹ نکالا۔ ایک سگریٹ سلگائی اور ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر ٹھاٹھ سے سگریٹ کے کش لگاتی رہی پھر اس نے خود ہی بتایا کہ اب وہ حیدر آباد جا کر دھندا شروع کرے گی۔ کراچی میں چوری چھپے عصمت فروشی کرتی تھی۔ پولیس سے زیادہ پاس پڑوس والے پریشان کرتے تھے۔ بات بات پر گالیاں دیتے تھے۔ آوازے کستے تھے۔ رات کو گھر میں پتھر پھینکتے تھے۔ اسے سب سے زیادہ شکوہ آس پاس کے فلیٹوں میں رہنے والی عورتوں سے تھا۔ وہ اسے دیکھ کر جھٹ منہ چھپا لیتیں۔ منہ بگاڑ کر نفرت سے تھوکتیں۔ صلواتیں سناتیں۔

بات کہتے کہتے وہ ایک بار بڑے جوش سے بولی۔ ’’میں تو جی تنگ کرنے والوں میں سے ایک ایک کو ٹھیک کر دیتی۔‘‘ اس نے پھٹ سے گالی دی اور ان کی ماؤں کے ساتھ ایسا خطرناک رشتہ جوڑا کہ میں ہکا بکا رہ گیا۔ خوف دامن گیر ہوا کہ میری بیوی کو ہسٹریا کا دورہ نہ پڑ جائے۔ اللہ بڑی مردمار عورت تھی۔ بے دھڑک ہر بات کہہ دیتی۔ ذرا نہ جھجکتی۔

آخر وکٹوریہ اس بلڈنگ کے سامنے جا کر رکی جس میں اس کی رہائش تھی۔ وکٹوریہ کا کرایہ بھی اس نے ضد کر کے اپنے پاس سے دیا۔ آگے آگے وہ چلی۔ پیچھے پیچھے ہم سب زینے کی سیڑھیاں طے کرتے ہوئے اوپر پہنچے۔ اس نے بڑھ کر اپنے فلیٹ کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک بوڑھی عورت نے دروازہ کھولا۔

پوچھا۔ ’’کون ہے؟‘‘

’’میں ہوں بختاور۔ ساتھ میں مہمان بھی ہیں۔‘‘ وہ دندناتی ہوئی اندر داخل ہو گئی مگر فوراً ہی پلٹی باہر آئی۔ میری بیوی کو مخاطب کیا۔

’’بھین جی ذرا دم لینا۔‘‘ اس نے مڑ کر بوڑھی عورت سے کہا۔

’’بے بے اندر سے ایک کوٹھا تولا کر دینا۔‘‘

ہم لوگ دروازے پر چپ چاپ کھڑے رہے۔ ذرا دیر بعد بوڑھی عورت نہ جانے کہاں سے ڈھونڈ کر لائی۔ بختاور نے کوٹھا

ہاتھ میں لیا۔دہلیز کے سامنے فرش پر کوئلے سے پانچ آڑھی ترچھی لکیریں کھینچیں۔پیر سے جوتی اتاری۔پھٹا پھٹ سات بار لکیروں پر ماری۔میری بیوی کی جانب مڑی۔مسکرا کر بولی۔"بھین جی' پہلے آپ نے اندر جانا ہے۔"

وہ اندر چلی گئی۔اس کے بعد ہم سب داخل ہوئے۔پتہ نہیں کیا ٹوٹکا تھا۔یہ بات تو کوئی طوائف ہی بتا سکتی ہے۔میں نے اس سلسلے میں نہ بختاور سے کرید کر پوچھا اور نہ ہی اس نے کوئی وضاحت کی۔اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔وہ خوش نظر آ رہی تھی۔اندر جا کر دیکھا۔فلیٹ میں تین کمرے تھے۔نہایت صاف ستھرے اور ہوادار تھے۔بیٹھتے ہی کھلی کھڑکی سے ایسا جھونکا آیا کہ روح میں تازگی آ گئی۔

دوسرے ہی روز بختاور نے حیدرآباد کے لیے اپنا سامان باندھا۔جو کچھ ساتھ لے جا سکتی تھی لے گئی' جو بچ گیا چھوڑ گئی۔میرے بار بار اصرار کرنے پر بھی نہ لے گئی۔شام ہونے سے پہلے پہلے ریل گاڑی میں سوار ہو کر کراچی سے چلی گئی۔اس کے رخصت ہوتے ہی احمد گھوڑوں کے سابق اصطبل سے سارا سامان اٹھوا کر فلیٹ میں لے آیا۔رات گئے تک سامان قرینے سے لگانے میں مصروف رہا۔وہ بہت خوش وخرم نظر آ رہا تھا۔اس کی بجھی بجھی آنکھوں میں چراغ جھلملا رہے تھے۔چہرے پر رونق آ گئی تھی۔

میں تو اول شب لمبی تان کر سو گیا۔سویرے آنکھ کھلی تو گھر میں ہنگامہ برپا تھا۔بچے چہک رہے تھے۔بیوی بات بات پر ہنس رہی تھی۔احمد فجر کی اذان کے وقت اٹھ بیٹھا تھا اور سامان اٹھا اٹھا کر ادھر ادھر جما رہا تھا۔ایک کمرہ اس نے اپنے لیے مخصوص کر لیا تھا۔اس کے لیے نیا فرنیچر خرید کرلانے کے لیے بھاوج سے صلاح مشورے کر رہا تھا۔

بیوی نے اس روز نہایت اہتمام سے کھانا پکایا تھا۔نہ میں دفتر گیا اور نہ ہی احمد۔سویرے سویرے سب نے غسل کیا۔اجلا لباس پہنا۔سب ہی مسرور تھے۔سب کے چہرے کھل اٹھے تھے۔کھانا بھی سب نے ساتھ بیٹھ کر نہایت رغبت سے کھایا۔یہ فلیٹ میں پہلا دن تھا۔خوشی اور مسرت کا امڈتا ہوا سیلاب دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ہماری زندگی میں ایک نیا سورج طلوع ہوا ہے۔

فلیٹ میں منتقل ہوتے ہی احمد یکسر بدل گیا۔اب اس نے رات گئے تک گھر سے باہر رہنے کی عادت ترک کر دی تھی۔شام کو دفتر سے سیدھا گھر آتا۔چائے پیتا اور کوئی کتاب یا رسالہ اٹھا کر پڑھنے بیٹھ جاتا۔بچوں کے ساتھ مل کر کھیلتا۔انہیں ہنساتا' خود بھی ہنستا' قہقہے لگاتا۔بھاوج کے ساتھ بیٹھ کر لمبی چوڑی باتیں کرتا۔سینما دیکھنے یا سیر سپاٹے پر پروگرام بناتا۔دن اسی طرح ہنسی خوشی گزرتے رہے۔

کچھ ہی عرصے بعد کا ذکر ہے۔پہر رات گزر چکی تھی۔ہلکی ہلکی نرم ہوا چل رہی تھی۔سڑکوں پر آمد و رفت کم ہو گئی تھی۔دور سمندر

کے کنارے روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ ایک جہاز بار بار بھونپو بجا کر روانگی کا اعلان کر رہا تھا۔ رات کے سناٹے میں دور سے ابھرتی ہوئی یہ آواز' جھلملاتی روشنیاں' نرم نرم جھونکے' بڑی خوشگوار اور سہانی فضا تھی۔ میں بالکنی میں لیٹا چاروں طرف بکھری ہوئی خوبصورتی اور دلکشی سے خوابوں کے جزیرے آباد کر رہا تھا۔ اچانک ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی ہولے ہولے دروازہ کھٹکھٹا رہا ہو۔

احمد بے خبر سو رہا تھا۔ لہٰذا مجھے اٹھنا پڑا' جا کر دروازہ کھولا۔ اندھیرے میں ایک شخص خاموش کھڑا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ''فرمایئے کس سے ملنا ہے؟''

وہ تو خاموش رہا۔ البتہ اس کی پشت پر سے آواز ابھری۔ ''سیٹھ کو اندر جانے دو۔ اپنے ہی آدمی ہیں۔'' اس کی بات سن کر میں ششدر رہ گیا۔ مجھے خاموش پا کر وہ سامنے آ گیا۔ میلا کچیلا لباس' الجھے ہوئے بال' کالا کلوٹا چہرہ۔ میں اس کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ پان کی جگالی کرتے ہوئے وہ آنکھ مار کر بے تکلفی سے مسکرایا۔ ''کوئی گڑبڑ والا معاملہ نہیں ہے۔ تم نے مجھے پہچانا نہیں۔ اماں حریاں کیوں ہو رہیے ہو' میں کلن رکشے والا ہوں۔ کشٹمر لے کر آیا ہوں۔'' اب ساری بات میری سمجھ میں آ گئی تھی۔ غصہ تو بہت آیا مگر اس کے اظہار کا موقع نہ تھا۔ کلن کا بھی قصور نہ تھا۔ اسے پتہ نہ تھا کہ بختاور فلیٹ خالی کر کے حیدرآباد جا چکی ہے۔ میں نے نرمی سے کام لیا۔ صورت حال سے آگاہ کیا۔ پہلے تو اسے یقین نہ آیا۔ الجھنے کی کوشش کی۔ لیکن جب میں نے سختی سے منع کیا تو وہ دھیما پڑ گیا۔ بڑی مشکل سے دونوں ٹلے۔

میں واپس آیا' بیوی جاگ رہی تھی۔ اسے بھی کچھ نہ بتایا۔ خاموشی سے بستر پر لیٹ گیا۔ نیند کا غلبہ بڑھا ہی تھا کہ دروازے پر پھر دستک سنائی دی۔ آنکھیں ملتا ہوا اٹھا۔ دروازہ کھولا تو شراب کا ایسا بھبکا آیا کہ میں چکرا گیا۔ سامنے ایک تنومند آدمی کھڑا تھا۔ جھوم کر بولا۔

''یہ دروازہ آج اتنی دیر میں کیوں کھلا۔ کوئی ایڈوانس بکنگ کرا رکھی ہے؟''

میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اس نے آگے بڑھ کر میرا کندھا تھپتھپایا۔ مسکرا کر کہا۔ ''یار راستہ تو چھوڑ۔ خاما خا دروازہ روکے کھڑا ہے۔ وہ اپنی بلوجان کدھر ہے؟ اس کے لیے سات میل چل کر آیا ہوں۔'' وہ نہایت بدتمیزی سے بات کر رہا تھا۔ میں نے ضبط سے کام لیا۔ سمجھانے بجھانے کی کوشش کی۔ مگر وہ نشے میں دھت تھا۔ اس کی سمجھ میں خاک نہ آیا۔ کہنے لگا۔ ''جانے تو نے کیا انٹ شنٹ لگا رکھی ہے۔ ہم کوئی آج ادھر نئے آئے ہیں جو تو اس طرح اپن کو ٹرکھا دینا چاہتا ہے۔'' اس نے زنانے کی گالی دی۔ ''کہاں چھپی بیٹھی ہے وہ حرامزادی۔ اسے باہر لا۔'' میں نے پاس پڑوس والوں کے ڈر سے بات بڑھانے کی کوشش نہ کی۔ غصے کو دبایا۔ نرمی سے

سمجھایا۔ مگر اس کے پلے کچھ نہ پڑا۔

وہ اور مشتعل ہو گیا۔ زور زور سے چنگھاڑنے لگا۔

شور سن کر احمد بھی دروازے پر آ گیا۔ میں نے ابھی تک اپنے ابلتے ہوئے جذبات کو قابو میں رکھا تھا۔ اسے بار بار منع کر رہا تھا کہ آہستہ بولے۔ لیکن میرے نرم رویے سے وہ شیر ہو گیا۔ نشے میں بہکنے لگا۔ زور زور سے بولتا۔ گندی گندی گالیاں بکتا۔ احمد کچی نیند سے بیدار ہوا تھا۔ کچھ دیر تو ہکا بکا کھڑا رہا اور صورت حال سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ مگر گالیاں سن کر اس سے ضبط نہ ہو سکا۔ جھپٹ کر شرابی کا گریبان پکڑا' جھنجھوڑا اور اس قدر زور سے دھکا دیا کہ وہ دیوار سے ٹکرا کر وہیں ڈھے گیا۔ تھا بھی خوب موٹا تازہ۔

وہ فرش پر چاروں شانے چت لیٹا تھا اور زخمی بھینسے کی طرح ڈکرا رہا تھا۔

چیخ پکار سے بلڈنگ کے دوسرے فلیٹوں میں رہنے والے بھی جاگ گئے۔ گھبرائی ہوئی ملی جلی آوازیں ابھرنے لگیں۔ دروازے کھلے اور آن کی آن میں میرے دروازے کے سامنے بھیڑ لگ گئی۔

پڑوسیوں کو حقیقت سے آگاہ کرنے یا صفائی پیش کرنے کی نوبت نہ آئی۔ وہ پہلے ہی واقف تھے۔ اکثر رات گئے اس فلیٹ کے سامنے ایسے واقعات دیکھ چکے تھے۔ انہوں نے فرش پر پڑے ہوئے شرابی کو اٹھایا۔ لعنت ملامت کی۔ دو چار ہاتھ بھی لگائے اور اسے دھکے دیتے ہوئے نیچے لے گئے۔ احمد بھی ان کے ساتھ ساتھ تھا۔ خدا خدا کر کے ہنگامہ ختم ہوا اور میں سر جھکائے خاموشی سے گھر کے اندر آ گیا۔

اب اکثر میرے دروازے پر ایسے ہنگامے ہوتے۔ ان سے نمٹنے کے لیے مجھے اور احمد کو آدھی رات کو جاگنا پڑتا۔ ویسے جب بھی ہنگامہ برپا ہوتا تو پڑوسی فوراً ہماری مدد کو پہنچ جاتے۔ مگر پیٹھ پیچھے طرح طرح کی باتیں بناتے۔ میری بیوی ان باتوں کو سن کر سخت پریشان ہوتی۔ وہ سہمی سہمی رہتی۔ اس کا چہرہ مرجھا گیا تھا۔ میری صحت بھی گرنے لگی تھی۔ رات گئے ذرا آنکھ لگتی۔ اچانک دروازے پر دستک سنائی دیتی۔ میں نیند سے بوجھل آنکھیں ملتا بار بار اٹھتا۔ اچانک دروازے پر دستک سنائی دیتی۔ میں نیند سے بوجھل آنکھیں ملتا بار بار اٹھتا۔ پہلے گرمی اور حبس کے مارے نیند نہ آتی تھی۔ اب ان قسم قسم کے اوباشوں اور رنڈی بازوں نے میری نیند حرام کر دی تھی۔

آئے دن کی اس مصیبت سے نجات حاصل کرنے کا ایک ہی راستہ نظر آیا اور وہ یہ تھا کہ اس فلیٹ کو پگڑی پر کسی کو دے دوں اور پگڑی کی رقم سے کوئی دوسرا فلیٹ لے لوں۔ اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے میں سنجیدگی سے غور کرنے لگا۔

ایک روز صبح اٹھ کر اخبار دیکھا۔ معلوم ہوا کہ ملک میں مارشل لاء لگ گیا ہے۔ جنرل ایوب خان چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بن گئے تھے۔ شہر میں ہر طرف فوج گشت کرتی نظر آتی تھی۔ جگہ جگہ فوجی عدالتیں قائم تھیں۔ آئے دن نت نئے آرڈی نینس اور مارشل لاء کے ضابطے نافذ کئے جاتے۔ چوری چکاری' منافع خوری' چور بازاری' ذخیرہ اندوزی' رشوت خوری غرض کہ ہر طرح کی دھوکہ دھڑی اور بدعنوانی کے لیے سخت سے سخت سزائیں دی جاتیں۔ قید بامشقت کے ساتھ ساتھ جرمانہ ہوتا اور کوڑے بھی لگائے جاتے۔

اس ہنگامہ دارو گیر میں پگڑی پر فلیٹ دینے کا صاف مطلب یہ ہوتا کہ فلیٹ بھی ہاتھ سے جاتا اور جیل کی ہوا بھی کھانا پڑتی۔ لہٰذا میں نے فلیٹ بدلنے کا خیال دل سے بالکل نکال دیا۔

ویسے اب فلیٹ چھوڑنے کی چنداں ضرورت بھی نہ تھی۔ گلی کوچوں' نالیوں اور جوہڑوں کے ساتھ ساتھ معاشرے میں ہر طرف بکھری ہوئی غلاظت اور گندگی صاف کرنے کی مہم زور و شور سے جاری تھی۔ یہ دور بھی عجیب دور تھا۔ پولیس سوتے سوتے جاگ اٹھی تھی۔ دکانوں پر' گوداموں پر' قمار بازی کے اڈوں پر' قحبہ خانوں پر چھاپے پڑتے۔ پکڑ دھکڑ ہوتی۔ مقدمے چلتے' سزائیں ہوتیں۔ اس عالم میں بختاور کے گاہکوں اور دلالوں نے بھی میرے فلیٹ کی جانب رخ کرنے سے توبہ کر لی تھی۔ رات گئے میرے دروازے پر ہونے والے ہنگامے ختم ہو چکے تھے۔ میں اب بے کھٹکے سوتا اور خوب گہری نیند سوتا۔

چند مہینے بھی سکون سے نہ گزرے تھے کہ ایک رات دروازے پر دستک ابھری۔ آنکھ کھل گئی۔ مگر خاموش لیٹا رہا۔ دستک رک رک کر ابھرتی رہی۔ ناچار اٹھا۔ دروازے پر پہنچا۔ اسے کھولا۔ سامنے ایک شخص مشتبہ انداز میں کھڑا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی سرگوشی کے انداز میں بولا۔

''میں شیدا ہوں جی۔ سرگودھا چلا گیا تھا۔ اب واپس آ گیا ہوں۔ بختاور مجھے اچھی طرح جانتی ہے۔''

میں نے اسے بتایا۔ ''بختاور اب یہاں نہیں رہتی۔''

''میں نے سب پتہ ہے جی'' وہ اپنے گندے دانت نکال کر مسکرایا۔ ''ڈرنے شرنے کی کوئی گل بات نہیں' سب ٹھیک ٹھاک ہے۔''

اس بار میں نے اسے ڈانٹا۔ ''فوراً یہاں سے چلے جاؤ۔ ورنہ پولیس کے حوالے کر دوں گا۔''

وہ ڈھٹائی سے مسکرایا۔ ''پولیس کی فکر نہ کریں جی۔ ادھر سب اپنے ہی بندے لگے ہیں۔''

میں نے درشت لہجے میں ایک بار پھر اسے آگاہ کیا۔ ’’دیکھو میں تم کو پہلے بتا چکا ہوں۔ بختاور یہ فلیٹ چھوڑ کر حیدرآباد چلی گئی۔ سن لیا تم نے؟‘‘

’’سن لیا‘ بالکل سن لیا۔‘‘ وہ اسی طرح جما کھڑا رہا۔ ’’بہت اونچا گاہک ہے جی۔ رات بھر کے سو روپے دے گا۔‘‘ اس نے بدمعاشی سے ایک آنکھ دبائی۔ میری پشت کی جانب اشارہ کیا۔ ’’بختاور نہیں ہے تو کیا ہوا‘ یہ بھی چل سکتی ہے۔‘‘

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ بیوی دروازے کا ایک پٹ کھولے کھڑی تھی۔ مجھ پر سکتہ طاری ہو گیا۔ اوسان خطا ہو گئے۔ سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ شیدے کی آواز ابھری۔ ’’میں جی اسے لے کر ابھی آیا۔‘‘

وہ مڑا اور تیزی سے سیڑھیاں طے کرتا ہوا اندھیرے میں اوجھل ہو گیا۔

واپس گھر کے اندر آیا تو صدمے اور نفرت سے برا حال تھا۔ بیوی سے نظریں بھی نہ ملا سکا۔ وہ بھی خاموش رہی۔ میں نے اس کی جانب مطلق توجہ نہ دی۔ چپ چاپ جا کر بستر پر لیٹ گیا۔ غم و غصے سے پیچ و تاب کھاتا رہا۔ کان دروازے پر لگے تھے۔ مجھے شیدے کا انتظار تھا۔

چند ہی منٹ پر دروازے پر آہٹ ہوئی۔ میں تڑپ کر اٹھا۔ باورچی خانے میں گیا۔ سبزی کاٹنے کی چھری اٹھائی اور دروازے کی جانب بڑھا۔ غصے اور جھنجلاہٹ سے سارا بدن کپکپا رہا تھا۔ میرے سر پر خون سوار تھا۔ اسی غیظ و غضب کے عالم میں دروازہ کھولا۔ سامنے شیدا نہیں بختاور کھڑی تھی۔ بختاور اس وقت بھی سیاہ برقع اوڑھے ہوئے تھی۔ میں ہکا بکا کھڑا اس کا چہرہ تک رہا تھا۔

مجھے خاموش پا کر اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ’’کیا میں اب اندر نہیں جا سکتی؟‘‘

میں فوراً چونکا۔ مسکرایا اور نرم لہجے میں بولا۔ ’’تم کو اندر آنے سے کون روک سکتا ہے۔ آؤ‘ اندر آ جاؤ۔‘‘

بختاور سے اور کہتا بھی کیا۔ ظاہر ہے اسے گھر میں داخل ہونے سے کیسے منع کر سکتا تھا۔

وہ اندر چلی گئی۔ برقع اتار کر ایک طرف رکھا۔ ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ میری بیوی کو دیکھا۔ اس کی طرف بڑھی۔ بختاور کو دیکھتے ہی وہ بھی اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ حیرت سے آنکھیں پھاڑے اس کا چہرہ تک رہی تھی۔ بختاور ہنستی مسکراتی اس کے قریب پہنچی اور بے تکلفی سے بستر پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

’’میں جی حیدرآباد سے واپس آ گئی ہوں۔ ادھر اپنا دھندا چلا نہیں۔‘‘

غصہ تو میرا پہلے ہی ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ چھری کو میں نے بختاور کی آنکھ بچا کر تکیے کے نیچے رکھ دیا تھا۔ مگر اس کی بات سن کر میں

پریشان ہوگیا۔اس نے بیٹھتے ہی جو بات کہی تھی اس کا سیدھا سادا مطلب یہ تھا کہ وہ اپنا فلیٹ لینے آئی ہے۔میری بیوی نے بھی غالباً یہی اندازہ لگایا تھا۔

ہم دونوں خاموش بیٹھے رہے' لیکن بختاور زیادہ دیر خاموش نہ رہی' کہنے لگی۔''آپ دونوں چپ کر کے کیوں بیٹھے ہیں؟ لگتا ہے آپ کو میرا یہاں آنا برا معلوم ہوا۔''

''بختاور! تم ایسی بات کیوں کر رہی ہو؟ تمہارا گھر ہے جب جی چاہے آؤ۔'' میں نے اس کی بدگمانی رفع کرنے کی کوشش کی۔''تم ٹھہری کہاں ہو؟''

''ابھی تو جی ہوٹل میں ہوں' پر جلد ہی ٹھہرنے کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا۔''

''تب تو تمہیں اپنے فلیٹ کی ضرورت پڑے گی!'' بیوی نے مری ہوئی آواز میں کہا۔

میں نے بھی دل پر پتھر رکھ کر بختاور کو یقین دلا دیا۔''تم جب کہو گی ہم فلیٹ خالی کر دیں گے۔''

''آپ دونوں کیسی باتیں کر رہے ہیں جی؟'' اس کے چہرے پر مسکراہٹ غائب ہوگئی۔''آپ نے مجھے اتنا گرا ہوا کیوں سمجھا؟'' اس کے لہجے سے تلخی صاف جھلک رہی تھی۔اس نے قدرے توقف کیا۔ٹھنڈی سانس بھری۔دل گرفتہ ہو کر بولی۔''میں کنجری ہوں ناں' تب ہی آپ نے میرے بارے میں ایسا سوچا۔''

''ارے ارے' تم تو بہت برا مان گئیں۔'' میں نے اسے منانے کے لیے بے تکلفی سے کہا۔

''برا منانے کی جی بات ہی ہے۔'' وہ بدستور ناراض تھی۔

اس بار بیوی نے اس کی خفگی دور کرنے کی کوشش کی۔''اچھا' اب تم غصہ تھوک دو۔میں تمہارے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں۔'' وہ پلنگ سے نیچے اتری۔بختاور منع کرتی رہی مگر وہ نہ مانی۔باورچی خانے میں چلی گئی۔

بختاور میری طرف متوجہ ہوئی۔صفائی پیش کرنے کے انداز میں بولی۔''میں تو آپ لوگوں کی خیر خیریت معلوم کرنے آئی تھی۔ میں نے اب اس فلیٹ سے کیا لینا۔یہ تو آپ کا ہے۔میں نے تو اسے واپس لینے اور خالی کرانے کے بارے میں سوچا بھی نہیں۔''

معاً مجھے شیدا یاد آ گیا۔دل کی بات فوراً زبان پر آ گئی۔''تم چاہو یا نہ چاہو' یہ فلیٹ تو مجھے چھوڑنا ہی پڑے گا۔''

''کیوں جی' آپ ایسا کیوں سوچ رہے ہیں؟'' اس کے انداز میں تجسس تھا۔

میں نے اس دفعہ صاف گوئی سے کام لیا۔''شیدے کو تو تم جانتی ہی ہو گی۔تمہارے آنے سے کچھ ہی دیر پہلے وہ یہاں آیا تھا۔

دوبارہ آنے کو کہہ گیا تھا۔" میں نے تکیے کے نیچے سے ہاتھ ڈال کر چھری کو ٹٹولا۔ "اگر وہ آیا تو میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" میں ایک دم بھڑک اٹھا۔

"میں نے سب پتہ ہے۔ آپ ناراض نہ ہوں۔" اس نے میرا غیظ و غضب ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔ "آپ فکر نہ کریں جی، وہ اب یہاں کبھی نہیں آئے گا۔" اس نے میرے چہرے کی جانب دیکھا جس پر چھایا ہوا غصہ رفتہ رفتہ پگھل رہا تھا۔ "شیدا مجھے باہر ہی مل گیا تھا۔ میرے ساتھ اس کی بات ہوئی تھی۔ اب وہ بھول کر بھی ادھر کا رخ نہیں کرے گا۔"

میں نے اپنی پریشانی بتائی۔ "یہ پہلا موقع نہیں، تمہارے جانے کے بعد ہر رات کوئی نہ کوئی آ جاتا۔ وہ ہنگامہ برپا ہوتا کہ میں تم سے کیا بتاؤں۔ مجھے ڈر ہے کہ پھر وہ سلسلہ شروع نہ ہو جائے۔"

"نہیں جی، اب میرا کوئی ولا یا ادھر نہیں آئے گا۔" اس نے مجھے یقین دلایا۔ "میں سب کو سختی سے منع کر دوں گی۔ آپ آرام سے رہیں، بالکل فکر نہ کریں۔"

بیوی چائے لے آئی۔ بختاور نے چائے پی۔ برقع اوڑھا۔ جانے کی اجازت چاہی۔ میں اسے رخصت کرنے دروازے تک گیا۔ چاہا کہ اس ہمراہ نیچے جاؤں مگر اس نے منع کر دیا۔ باہر کلن اپنے رکشا میں بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ خاموشی سے چلی گئی۔

وہ دوبارہ آئی اور اکثر آتی رہی۔ جب بھی آتی بچوں کے لیے مٹھائی یا پھل ضرور لاتی، کبھی خالی ہاتھ نہ آئی۔ اس میں ایک نئی تبدیلی یہ محسوس کی کہ اب وہ میرے سامنے سگریٹ ہرگز نہ پیتی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی دوپٹے کا پلو کھینچ کر سر ڈھک لیتی۔ کم بولتی اور جب بولتی تو بازاری لہجہ اختیار نہ کرتی۔ کئی مہینے اس کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری رہا۔ پھر ایسی غائب ہوئی کہ عرصہ دراز تک نظر نہ آئی۔ میں نے سوچا، کراچی چھوڑ کر پھر کہیں چلی گئی۔

مگر اس نے جیسا کہا تھا ویسا ہی ہوا۔ اس کا کوئی یار آشنا یا بھڑوا کبھی میرے دروازے پر نہ آیا۔ رہائش کا مسئلہ حل ہو چکا تھا۔ فلیٹ میں آرام سے گزر بسر ہو رہی تھی۔ البتہ احمد کے رویہ میں ایک نئی تبدیلی دیکھنے میں آئی۔ وہ رات کو دیر سے لوٹتا اور کبھی کبھار رات بھی نہ آتا۔ پھر ایسا ہوا کہ وہ کئی کئی روز گھر سے غائب رہنے لگا۔ لیکن جب آتا تو کوئی نہ کوئی عذر پیش کرتا۔ معذرت کرتا۔

اب اسکا رنگ روپ بھی نکھر گیا تھا۔ خوشحالی اس کے بشرے سے ٹپکتی تھی۔ لباس بھی عمدہ پہنتا۔ جیب بھی اس کی خالی نہ رہتی۔ بچوں کو کبھی روپے سے کم نہ دیتا۔ ان کے لیے کھلونے اور کپڑے خرید کر لاتا۔ میرے لیے اور اپنی بھاوج کے لیے بھی آئے دن کچھ نہ کچھ خرید کر لاتا۔ خود بھی ہشاش بشاش رہتا اور گھر والوں کو بھی خوش رکھنے کی کوشش کرتا۔

ایک بار وہ ہفتے بھر تک گھر نہ آیا۔ پہلے ہی میرے ذہن میں طرح طرح کے وسوسے اور شبہات کلبلا رہے تھے اس طویل غیر حاضری نے مجھے سخت تشویش میں مبتلا کر دیا۔ ان دنوں میں کھویا کھویا رہتا۔ احمد کے بارے میں مسلسل سوچتا رہتا۔

بیوی نے مجھے مضمحل اور چپ چاپ دیکھا تو ایک رات کرید کر پوچھا۔ ”آپ آج کل بہت پریشان نظر آ رہے ہیں۔“

”پریشانی کی بات ہی ہے۔“ میں نے صاف گوئی سے بتایا۔ ”احمد ہفتہ بھر سے گھر نہیں آیا اور یہ پہلا موقع نہیں۔ ایک مدت سے اس نے یہ وطیرہ اختیار کر رکھا ہے۔ کئی روز غائب رہتا ہے۔ اس نے تو حد کر دی۔ نہ جانے کہاں رہتا ہے؟“

”مجھے معلوم ہے وہ کہاں رہتا ہے۔“

میں نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا۔ ”کہاں رہتا ہے وہ؟“

اس نے دبی زبان سے کہا۔ ”وہ بختاور کے ساتھ رہتا ہے۔ اس وقت بھی وہیں ہوگا۔“

مجھے یقین نہ آیا۔ اپنے شبہ کا برملا اظہار کیا۔ ”تم کو کیسے معلوم ہوا کہ وہ بختاور کے ساتھ رہتا ہے۔“

”یہ بات مجھے معلوم تو بہت دن سے ہے مگر اس ڈر سے کہنے کی ہمت نہیں ہوئی کہ آپ ناراض ہوں گے۔“ اس نے صفائی پیش کی۔ ”آپ کو تو یہ بھی خبر نہ ہوگی کہ احمد نے چھپ کر بختاور سے نکاح کر لیا ہے۔ ویسے بختاور سے آشنائی تو پہلے سے تھی۔“

میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ تڑپ کر بولا۔ ”تم سچ کہہ رہی ہو؟“

”اب تو بات پرانی ہوگئی۔ خود بختاور نے مجھے بتائی تھی۔“ اس نے وضاحت کی۔ ”ہوا یہ کہ پچھلے مہینے بختاور آپ کی غیر موجودگی میں آئی تھی۔ مجھے سب کچھ بتا گئی۔ یقین نہ ہو تو تصدیق کر کے دیکھ لیں۔“

میں دم بخود رہ گیا۔ اس وقت تو خاموش رہا۔ دوسرے روز دفتر سے چھٹی لی۔ احمد کے دوست دلبند خان سے ملا۔ پہلے تو اس نے ٹال مٹول سے کام لیا۔ احمد کے بارے میں کچھ بتانے سے اجتناب برتا۔ صاف ٹرخانے کی کوشش کی۔ مگر جب کرید کر پوچھا تو وہ کھلا۔ سب کچھ اگل دیا۔ بیوی کی بات درست نکلی۔ احمد نے واقعی بختاور سے نکاح کر لیا تھا جس میں دلبند خان گواہ کی حیثیت سے شریک ہوا تھا۔ احمد اب بختاور ہی کے ساتھ رہتا تھا۔

یہ بھی عقدہ کھلا کہ بختاور نے عصمت فروشی کا دھندا ختم نہیں کیا تھا بلکہ اعلیٰ پیمانے پر اور زیادہ سلیقے سے جاری تھا۔ اب وہ ہاؤسنگ سوسائٹی کی ایک شاندار کوٹھی میں رہتی تھی۔ جہاں شراب کا دور چلتا تھا۔ قمار بازی بھی ہوتی تھی۔ اس کے یار آشنا بدل گئے تھے۔ رکشاؤں کے بجائے چمکتی دمکتی کاروں میں آتے تھے۔ ان میں بڑے بڑے تاجر اور صنعت کار بھی شامل تھے اور بڑے افسر بھی۔

بختاور اپنے کاروبار کی روز افزوں ترقی سے بہت خوش تھی۔ احمد بھی خوش و خرم تھا۔ بختاور کے کاروبار کو نہایت منظم طریقے سے چلا رہا تھا۔ جس نسخۂ کیمیا کی سالہا سال سے تلاش تھی اب احمد کے ہاتھ آ گیا تھا۔ بختاور اس کے لیے واقعی بخت آور ثابت ہوئی تھی۔

ان حالات کا علم ہوا تو میری عزتِ نفس کو ایسا دھچکا لگا کہ تڑپ کر رہ گیا۔ سوچا کہ احمد میرے پاس آیا تو اسے کھڑے کھڑے نکال دوں گا۔ صاف صاف کہہ دوں گا کہ آئندہ میرے گھر میں قدم نہ رکھے۔ مگر اس کی نوبت ہی نہ آئی۔ احمد نے خود ہی آنا جانا ترک کر دیا۔ میں دل ہی دل میں کڑھتا اور پیچ و تاب کھاتا رہا۔

جنوری کا مہینہ تھا۔ صبح سے آسمان پر ابر چھایا تھا۔ ہوا بھی بپھری ہوئی تھی۔ سردی پہلے ہی کم نہ تھی۔ دن ڈھلے بوندا باندی شروع ہوگئی تو سردی میں اور شدت پیدا ہوگئی۔ شام کو دفتر سے لوٹا تو سردی سے کپکپا رہا تھا۔ بدن پر صرف ایک اونی سویٹر تھا اور وہ بھی اتنا بوسیدہ تھا کہ اس میں جگہ جگہ سوراخ ہو گئے تھے۔ یہ پھٹا پرانا سویٹر کڑاکے کی اس سردی میں بھلا کیا کام دیتا۔ جب سے سردی شروع ہوئی تھی برابر سوچتا رہا کہ ''لنڈے'' سے ایک سیکنڈ ہینڈ کوٹ خرید لاؤں۔ مگر تنخواہ اتنی قلیل تھی کہ گزر بسر ہی مشکل سے ہوتی تھی۔ پرانا کوٹ خریدنے کی بھی توفیق نہ ہوئی۔

سردی سے سکڑ سکڑا یا گھر میں داخل ہوا۔ دیکھا احمد ٹھاٹھ سے بیٹھا سگریٹ کے کش لگا رہا ہے۔ سگریٹ تو وہ ایک عرصہ سے پی رہا تھا مگر چھپ کر پیتا تھا۔ مجھے دیکھتا تو جھٹ سگریٹ مٹھی میں چھپا لیتا۔ فوراً کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر ادھر ادھر کھسک جاتا تھا۔ میری نظروں سے اوجھل ہو جاتا تھا۔ لیکن اس وقت بغیر کسی جھجک کے سگریٹ پیتا رہا۔ ذرا بھی میرا لحاظ نہ کیا۔

میں پہلے ہی اس کی حرکتوں سے نالاں تھا۔ اس ڈھٹائی پر تن بدن میں آگ ہی تو لگ گئی' لیکن ضبط سے کام لیا۔ بے رخی سے اسے نظر انداز کرتے ہوئے اپنے کمرے کی جانب بڑھنا چاہا تو اس نے ٹوکا۔

''بھائی جان! آپ کہاں چلے؟'' میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ بادل نخواستہ ذرا ہٹ کر ایک طرف بیٹھ گیا۔

لیکن وہ خاموش نہ رہا۔ اس نے اپنی چمکتی دمکتی ٹائی کی گرہ کو درست کرتے ہوئے بے تکلفی سے مسکرا کر کہا۔ ''یہ آپ نے اپنا کیا حال بنا رکھا ہے؟ کس غضب کی سردی پڑ رہی ہے اور آپ نے یہ نہ جانے کب کا پرانا سویٹر پہن رکھا ہے۔''

میں تڑپ کر رہ گیا۔ جی چاہا کہ اس سے کہوں کہ میں کسی بختاور کی بھڑوائی نہیں کھاتا کہ سوٹ بوٹ پہن کر اکڑا اکڑا پھروں۔ حق حلال کی کمائی میں تو پرانا دھرانا سویٹر ہی پہن کر جاڑا کاٹا جا سکتا ہے۔ میں نے اسے قہر آلود نظروں سے دیکھا۔ لیکن وہ ذرا مرعوب نہ

ہوا۔ بدستور مسکراتا رہا۔ اٹھا اور میرے قریب آ کر بیٹھ گیا۔

میں منہ پھلائے بیٹھا رہا۔ اس نے کوٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ پرس نکالا۔ اسے کھولا اور ہزار روپے نکال کر میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''بھائی جان! لیجئے یہ روپے رکھ لیجئے۔'' میں نے روپے نہ لیے۔ ان کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ بیوی بھی موجود تھی۔ وہ بھی خاموش بیٹھی رہی۔ احمد نے نرم لہجے میں اصرار کیا۔ ''غصہ تھوک دیجئے۔'' اس نے نوٹ ایک بار پھر میری طرف بڑھائے۔

اس دفعہ میں نے جھنجھلا کر اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ تیکھے لہجے میں بولا۔ مجھے روپے دوپے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ان کو اپنے ہی پاس رکھو۔ ان روپوں کو لے کر مجھے اپنی عاقبت خراب نہیں کرنا۔''

''اجی چھوڑیئے بھائی! ان باتوں میں کیا رکھا ہے۔'' وہ ڈھیٹ بن کر مسکراتا رہا۔ ''وقت دیکھئے اور اپنے حالات دیکھئے۔ آپ کو اپنی فکر نہیں مگر بھابی اور بچوں کو تو دیکھئے۔ نہ پہننے کو ہے نہ پیٹ بھر کھانے کو۔ اس طرح کب تک ایک ایک چیز کو ترستے رہیں گے۔ ان کی خستہ حالی دیکھ کر میرا تو دل تڑپ اٹھا''

''تمہاری اس ہمدردی کا بہت بہت شکریہ۔'' میں نے بیزاری سے کہا۔ ''یہ روپے اب تم اپنی جیب میں رکھ لو اور کان کھول کر سن لو کہ میں ان کو ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گا۔''

مگر اس کے رویے سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ یہ رقم دینے کا تہیہ کر کے آیا تھا۔ میری طرف سے مایوس ہو کر وہ اپنی بھاوج کی جانب متوجہ ہوا۔ اٹھ کر اس کے پاس گیا۔ روپے اس کی طرف بڑھائے۔

''بھائی جان تو اپنی ضد پر اڑے ہوئے ہیں۔ لیجئے بھابی! آپ ان کو رکھ لیجئے۔''

بیوی نے بھی روپے نہ لیے۔ لیکن احمد نے ہمت نہ ہاری۔ روپے اپنی بھابی کی گود میں ڈالے۔ مڑا اور دروازے کی جانب بڑھا۔ میں نے ٹوکا۔ ''ٹھہر جاؤ احمد! میری بات تو سنو'' مگر اس نے میری ایک نہ سنی۔

اس کے جانے کے بعد کمرے میں گہری خاموشی چھا گئی۔ نہ میں نے کچھ کہا نہ بیوی نے۔ دونوں گم صم بیٹھے تھے۔ کچھ دیر بعد بیوی نے سکوت توڑا' پوچھا۔ ''ان روپوں کا کیا کروں؟'' اس نے نوٹوں کی طرف اشارہ کیا۔

''فی الحال تو ان کو حفاظت سے رکھ دو۔ احمد جب آئے تو واپس کر دینا بلکہ اس کے آنے کا کیوں انتظار کیا جائے۔ میں دلبند خان کو پہنچا دوں گا کہ احمد کو دے دے۔'' میں نے اکتا کر کہا۔ ''اب تم مجھے ایک پیالی چائے بنا کر پلا دو۔''

اس نے نوٹ سنبھالے اور اٹھ کر چلی گئی۔

میں دلبند خان کے بارے میں روز ارادہ کرتا۔ لیکن دفتر کی مصروفیت میں ایسا الجھا رہا کہ جانے کی نوبت ہی نہ آئی۔

کئی دن گزر گئے۔ اسی اثنا میں چھوٹی بچی بیمار پڑ گئی۔ بیوی گھریلو علاج معالجہ کرتی رہی مگر افاقہ نہ ہوا۔ اسے ڈبل نمونیہ ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر کے پاس لے جانا چاہا تو دوا دارو کے لیے کچھ نہ تھا۔ بیوی سے کہا کہ پاس پڑوس سے کچھ روپے قرض لے لو۔

''پہلے ہی سب سے اتنا قرض ادھار لے رکھا ہے کہ اب تک ادا نہ کیا جا سکا۔ اب کس منہ سے کس کے پاس جاؤں اور جاؤں گی بھی تو خالی ہاتھ لوٹنا پڑے گا۔''

میں زور دیے پر وہ چلی گئی مگر جیسا اس نے کہا تھا وہی ہوا۔ کہیں سے کچھ نہ ملا۔

میں سر جھکائے دل گرفتہ بیٹھا تھا۔ بیوی نے مجھے اس عالم میں دیکھا تو ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ''احمد جو روپے دے گیا تھا وہ رکھے ہیں' اس میں سو روپے کہیے تو لے آؤں؟''

''نہیں ان کو ہاتھ نہ لگانا۔'' میں نے اس کی حوصلہ افزائی نہ کی۔ ''کل صبح دفتر جاتے وقت یاد دلا دینا۔ میں یہ روپے دلبند خان کو ضرور پہنچا دوں گا۔''

''مگر میں نے تو کچھ کم دو سو روپے اس میں سے خرچ بھی کر لیے۔''

میں نے جھلا کر اسے ڈانٹا۔ ''تم نے میرے منع کرنے کے باوجود ان کو کیوں خرچ کیا؟''

''نہ کرتی تو کیا کرتی۔ گھر میں فاقہ پڑ جاتا۔'' اس نے فوراً صفائی پیش کی۔ ''پڑوس کے کرامت صاحب کی بیوی نے الگ جان کھا رکھی تھی۔ آپ کو یاد ہوگا' کئی مہینے پہلے ان سے سو روپے ادھار لیے تھے۔ اب تک ادا نہیں کیے تھے۔ پچھلے جمعے کو آنکھیں نکال کر ایسی کھڑی ہو گئیں کہ ان کے روپے نہ دیتی تو وہ ایسا ہنگامہ برپا کرتیں کہ پاس پڑوس میں تھڑی تھڑی ہوتی۔ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتی۔''

''یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔'' میں نے زچ ہو کر کہا۔

کچھ دیر خاموشی رہی' پھر بیوی کی آواز ابھری۔ ''بچی کو ڈاکٹر کے پاس لے جانے کے بارے میں آپ نے کیا سوچا؟'' اس نے سہمی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھا۔ ''میں سو روپے کا ایک نوٹ نکالے لیتی ہوں۔ آپ اسے ڈاکٹر کے پاس لے جایئے۔''

''نہیں' میں ان میں سے کچھ نہیں لوں گا... '' میں اپنی بات پر اڑا رہا۔

''چاہے بچی کی جان چلی جائے مگر آپ کی آن نہ جائے۔'' وہ ایک دم بھڑک اٹھی۔ ''ایسی ہی آن ہے تو پھر یہ فلیٹ بھی چھوڑ دیجئے۔ یہ بھی تو بختاور کا ہے۔''

میں تلملا کر رہ گیا۔ کچھ کہتے بن نہ پڑی۔ کہتا بھی کیا۔ وہ ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھی۔ میں سر جھکائے چپ بیٹھا رہا۔

بیوی اٹھ کر کمرے سے باہر چلی گئی۔ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں سو روپے کا نوٹ دبا تھا۔ نوٹ میری طرف بڑھا کر اس نے نرم لہجے میں کہا۔ ''خواہ مخواہ خود کو ہلکان نہ کیجئے۔ یہ نوٹ لیجئے اور فوراً بچی کو ڈاکٹر کے پاس لے جایئے۔ ذرا اس کی حالت تو دیکھئے' کیا ہو رہی ہے۔ کیسی اکھڑی اکھڑی سانس بھر رہی ہے۔ یا اللہ! میری بچی کو بچا لے۔'' اس کی آواز بھرا گئی۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

میں نے خاموشی سے نوٹ لیا۔ بچی کو کمبل میں اچھی طرح لپیٹ کر ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ اس نے دیکھا تو پریشان ہو گیا۔ فوراً انجکشن لگایا۔ بچی کو واپس گھر لایا۔ رات کو اس کی حالت اور غیر ہو گئی۔ اب اسے ڈاکٹر کے پاس لے جانا ممکن نہ تھا۔ آدھی رات کو ڈاکٹر کے گھر پہنچا۔ بیوی کا خدشہ درست نکلا۔ ڈاکٹر کے پہنچنے سے پہلے ہی وہ ماں کو روتا بلکتا چھوڑ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئی۔

اس آڑے وقت میں احمد کے دیئے ہوئے روپے بہت کام آئے۔ ورنہ بچی کی تجہیز و تکفین کے لیے کسی کے آگے ہاتھ پھیلانا پڑتے۔ اپنا عالم تو یہ تھا کہ زہر کھانے کو بھی کچھ نہ تھا۔ بیوی کے پاس جو ٹوم چھلا تھا وہ پہلے ہی بک چکا تھا۔

اب صورت احوال یہ ہے کہ احمد ہر مہینے چمکتی دمکتی کار پر آتا ہے اور پابندی سے ہزار روپے دے جاتا ہے۔ کبھی تاخیر ہو جاتی ہے تو بے چینی سے اس کا انتظار رہتا ہے۔ اس کی کیمیا گری نے میرے دن پھیر دیئے ہیں۔ اچھا کھاتا ہوں اچھا پہنتا ہوں۔ عزت بھی ہے خوشحالی بھی ہے۔ غرض کہ بڑے آرام سے گزر بسر ہو رہی ہے۔ غربت و افلاس کے بادل چھٹ چکے ہیں۔ مسرت و شادمانی کی دھوپ نکل آئی ہے۔ بقول شخصے اب تو آرام سے گزرتی ہے۔ عاقبت کی خبر خدا جانے۔



خداداد کالونی

اس ٹوٹی ہوئی دیوار کی اوٹ میں دونوں بہت دیر سے خاموش بیٹھے تھے۔ چاندنی رات تھی مگر ہر طرف کہر کا غبار پھیلا تھا۔ اندھیرے میں وہ بھوتوں کی طرح خوفناک معلوم ہو رہے تھے۔

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ سردی بھی بڑھ گئی تھی۔ بالم نے اکتا کر انگڑائی لی اور آہستہ سے بولا۔ "چل یار اب تو نیند معلوم ہو رہی ہے۔" غازی نے آنکھیں نکال کر اس کی طرف دیکھا۔ اسی وقت سامنے درختوں کے نیچے کتوں کے بھونکنے کی آواز ابھری۔ اس نے رازدارانہ انداز میں سرگوشی کی۔ "شی! کوئی آ رہا ہے۔" سنسان سڑک پر قدموں کی آہٹ صاف سنائی پڑ رہی تھی۔

کوئی اسی طرف آ رہا تھا۔ غازی نے فوراً چاقو نکالا اور بالم کی کمر میں کہنی مار کر بولا۔ "لے بے کام بن گیا۔"

دونوں اندھیرے میں دبے دبے قدموں چلتے ہوئے آگے بڑھے۔ چاپ رفتہ رفتہ قریب آتی جا رہی تھی۔ پھر اندھیرے میں ایک دھندلا سا انسانی سایہ نظر آیا اور جیسے ہی وہ ٹوٹی ہوئی دیوار کے سامنے پہنچا' دونوں لپک کر شکاری کتے کی طرح اس کے سر پر جا پہنچے۔

بالم نے ڈپٹ کر کہا۔ "ٹھہر جا۔"

غازی نے جھپاک سے چاقو اس کے سینے پر رکھ دیا۔ "سالے! ذرا بھی آواز نکلی تو پورا چاقو اتار دوں گا۔"

نووارد لمحہ بھر تو ہکا بکا کھڑا رہا کہ یہ کیا مصیبت نازل ہوئی۔ پھر اس نے بڑی بے نیازی سے کہا۔

"اماں یہ چاقو تو سامنے سے ہٹاؤ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے مار ہی دو گے۔ مطلب کی بات کہو۔ چاہتے کیا ہو؟" اس کے لہجے میں ذرا بھی گھبراہٹ نہ تھی۔

اس دیدہ دلیری پر دونوں نے اسے ایسی حیرت سے دیکھا کہ چاقو پر غازی کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ وہ گم صم کھڑے اس پستہ قد آدمی کا چہرہ تک رہے تھے جو کانوں پر گلوبند لپیٹے سردی سے سکڑا سکڑایا کھڑا تھا۔

بالم نے اپنی بھاری آواز سے ایک بار پھر ڈانٹا۔ "ابے کہنا وہنا کیا ہے' جو کچھ ہے نکال کر سامنے رکھ دے۔" فوراً ہی غازی نے چاقو پھر اس کے سینہ پر رکھ دیا۔ مگر وہ ایسا ڈھاکڑ تھا کہ اس دفعہ بھی مرعوب نہ ہوا۔

''اماں پھر تم نے چاقو سامنے رکھ دیا۔'' اس نے بغیر کسی جھجک کے غازی کا ہاتھ ہولے سے ایک طرف کر دیا۔ کہنے لگا۔ ''بابا' اتنا ناراض کیوں ہوتے ہو؟ یہ لو۔'' اس نے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا' باہر نکالا اور دونوں کے سامنے کر دیا۔ ''لو سنبھالو' پورے بارہ آنے کی ریزگاری ہے۔ البتہ اس میں ایک دونی کھوٹی ہے۔ بعد میں مجھے گالیاں نہ دینا۔ یہ رہا بیڑی کا بنڈل۔ ماچس بھی ساتھ میں ہے۔ کہو تو کوٹ بھی اتار دوں۔ اسے نہ لو تو اچھا ہے۔ ابھی مجھے کئی میل جانا ہے۔ سردی میں اکڑ کر رہ جاؤں گا۔''

اس کی باتیں سن کر دونوں چکرائے۔ غازی نے ریزگاری اور بیڑی کا بنڈل لینے کو تو لے لیا مگر اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کا کیا کرے۔ واپس کر دے یا رکھ لے۔ کم از کم اس وقت کے چائے پانی کا خرچہ تو نکل ہی آتا۔ بالم نے بھی زبان سے ایک لفظ نہ نکالا۔ خاموشی سے اس کی جیبیں ٹٹولنے لگا۔ جیبوں کی تلاشی سے جب کچھ بھی برآمد نہ ہوا تو وہ اس کے پاجامے کا نیفہ ٹٹولنے لگا۔ راہ گیر اس کا مقصد بھانپ گیا تھا۔ مسکرا کر بولا۔ ''نہیں جی' تم میری پوری ننگا جھوری لے لو۔ میں پاجامہ اتار دیتا ہوں۔ اچھی طرح دیکھ لو۔'' اتنا کہہ کر وہ ازار بند کھولنے لگا۔

غازی اس کی اس تیزی پر جل کر چیخا۔ ''نہیں بے' اس کی ضرورت نہیں۔ سالے زیادہ تیزی دکھائی تو لگاؤں گا دو ہاتھ۔'' کہنے کو تو اس نے اکڑفوں میں یہ بات کہہ دی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی محسوس کیا کہ آج بڑے بکٹ سے پالا پڑا ہے۔

بالکل یہی بات بالم نے بھی سوچی۔ مگر اس نے خود پر زبردستی غصہ طاری کیا۔ اس شخص کی کمر پر کس کے ایک لات ماری۔ چیخ کر بولا۔ ''سیدھا ناک کی سیدھ میں چلا جا' مڑ کر دیکھا تو سمجھ لینا سالے خاں تمہاری خیریت نہیں۔''

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ آگے بڑھا اور آہستہ آہستہ سڑک پر چلنے لگا۔ دونوں خاموش کھڑے اسے جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔ پھر غازی کو کچھ خیال آیا۔ اونچی آواز سے ٹوکا۔ ''اے ٹھہر جا۔'' اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اس کی طرف بڑھا۔ بالم بھی اس کے پیچھے پیچھے چلا۔ غازی نے قریب جا کر تمام ریزگاری اور بیڑی کا بنڈل اس کے ہاتھ میں دیا۔ ''لے بھئی' یہ رہی تیری رقم'' اس دفعہ اس کا لہجہ بالکل بدلا ہوا تھا۔ نہ اس میں تلخی تھی نہ ڈانٹ پھٹکار۔

وہ شخص بولا۔ ''نہیں جی' تم مجھے ایک دونی دے دو تا کہ ایک چائے پی لوں۔ ہو سکے تو ایک بیڑی بھی سلگا کر دے دو۔''

غازی اب اس پر مہربان ہو چکا تھا۔ ''اب تم اسے رکھ لو' چائے ہم تم کو پلائیں گے اور بیڑی کے بجائے یہ لو سگریٹ پیئو۔'' اس نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا' کھولا' سگریٹ نکال کر سلگائی اور اس کے ہاتھ کی طرف بڑھائی۔

''یار! تیرا نام کیا ہے؟''

"یار محمد" اس نے بتایا۔ "مگر سب مجھے ٹمی کہتے ہیں۔"

بالم نے ہنس کر اپنے ردعمل کا اظہار کیا۔ "اماں الگ ہی الگ خاطرداریاں کرتے رہو گے۔ ادھر بھی تو ایک سگریٹ بڑھاؤ۔"

غازی نے سگریٹ نکالی اور بالم کو دے دی۔ وہ سگریٹ سلگا کر کش لگانے لگا۔

تینوں سڑک پر ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ تین ہٹی کے چوراہے پر ایک چائے خانے میں انہوں نے چائے پی۔ جب وہ باہر آئے تو ایک بج رہا تھا۔ غازی کو ٹمی نے کچھ ایسا متاثر کیا کہ معاً خیال آیا آدمی تو اپنے کینڈے کا لگتا ہے۔ اگر ساتھ میں آ جائے تو اچھا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اس سے بے تکلف ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ سردی برابر بڑھتی جا رہی تھی۔ سوا سنسناتی ہوئی چل رہی تھی۔

"اماں اس جاڑے پالے میں کہاں جاؤ گے؟" غازی نے چلتے چلتے اس سے کہا۔ "اپنے ہی ساتھ ٹھیر جاؤ۔ اب رات رہ ہی کتنی گئی ہے۔ نیند نہیں آئے گی تو چائے کا ایک دور اور چلے گا۔ یہاں تو رات بھر ہوٹل کھلے رہتے ہیں۔"

ذرا سی حیل وحجت کے بعد وہ ان کے ساتھ ٹھہرنے پر رضامند ہو گیا۔

تینوں ایک کیبن کے نزدیک پہنچ کر رک گئے۔ کیبن لکڑی کا بنا ہوا تھا اور فٹ پاتھ سے زیادہ فاصلے پر نہ تھا۔ عقب میں سرکاری کوارٹر کی دیوار تھی۔ قریب ہی نیم کا گھنا درخت تھا جس کی شاخیں کیبن پر جھکی ہوئی تھیں۔

بالم بولا۔ "لو بھئی اپنا ٹھیا آ گیا۔"

ٹمی نے حیرت سے کیبن دیکھا۔ "اماں اس کھوکھے کے نیچے تمہارا کیسے گزارا ہوتا ہے؟"

"یار کسی نہ کسی طرح ہو ہی جاتا ہے۔" بالم نے مسکرا کر بے نیازی سے کہا۔ "یوں سمجھو سر چھپانے کو ٹھکانہ مل گیا ہے۔ اور یہ بھی پھوکٹ میں نہیں ہے۔ روپیہ روز بھاڑا دینا پڑتا ہے۔"

"یہ ہے کس کا؟" ٹمی نے پوچھا۔

"ایک پنواڑی کا ہے۔" بالم نے آنکھ مار کر سرگوشی کی۔ "پان سگریٹ فروخت کرنے کے ساتھ ساتھ کچھ چرس ورس کا دھندا بھی کرتا ہے اور پولیس کے لیے مخبری بھی کرتا ہے۔ مگر اپنا یار ہے۔ وقت پڑنے پر ہمیشہ کام آتا ہے۔ بات یہ ہے۔۔۔"

مگر وہ اپنی بات پوری نہ کر سکا۔ غازی نے کیبن کے نیچے جھانکتے ہوئے پوچھا۔ "اماں بالم کہو تو موم بتی جلا لوں؟ بہت اندھیرا ہے۔"

"جلا لو تو اچھا ہے۔" بالم نے جواب دیا۔

غازی کیبن کے نیچے گھس گیا۔ اسی وقت اندر سے ایک کتیا نکل کر تیزی سے بھاگی اور ذرا دور ہٹ کر زور زور سے بھونکنے لگی۔ اندر سے غازی کی آواز سنائی دی۔ ''لو یار اپنا تو پلیتھن ہو گیا۔ اس حرام زادی نے تو یہاں بستر میں بچے جنے ہیں۔'' ساتھ ہی اندر سے پلوں کے پیاؤں پیاؤں کرنے کی آوازیں بھی ابھرنے لگیں۔

بالم گھبرا کر بولا۔ ''مار دیا حرام کی جنی نے۔ جب ہی تو میں کہوں یہ سالی آج اس طرح کیوں بھونک رہی ہے۔''

غازی وہیں سے بولا۔ ''ان سالوں کو بستر سے نکال کر کہاں ڈالوں؟''

بالم کی سمجھ نہ آیا کہ کیا جواب دے۔ ادھر کتیا تھی کہ برابر بھونکے جا رہی تھی۔ وہ مخمصے میں پڑ گیا۔ ''ان کو نکالو گے تو سالے سردی میں مر جائیں گے اور یہ سالی کب سونے دے گی۔ اس حرامزادی نے تو خاصی مصیبت کھڑی کر دی۔'' جھنجھلا کر وہ جھپٹا اور کتیا کے منہ پر زور سے لات ماری۔ وہ ٹیں ٹیں کرتی دور چلی گئی۔ مگر ذرا دیر بعد پھر قریب آ کر بھونکنے لگی۔ غازی کیبن کے نیچے سے نکل کر باہر آ گیا تھا۔ دونوں بے حد پریشان معلوم ہو رہے تھے۔

''بھئی اتنے پریشان کیوں ہو رہے ہو؟'' ٹمی نے ان کی پریشانی کو تاڑ لیا۔ ''چلو میرے ساتھ' کسی نہ کسی طرح رات کاٹ لیں گے۔''

دونوں کو اور کیا چاہیے تھا۔ فوراً آمادہ ہو گئے۔ غازی نے جوش میں آ کر اس کی پیٹھ پر ہاتھ مارا۔ ''یار ٹمی تو واقعی بڑے کام کا آدمی ہے۔ ورنہ اس حرام زادی نے تو آج رات مار ہی دیا تھا۔''

تینوں وہاں زیادہ دیر نہ ٹھہرے۔ آگے بڑھے اور خداداد کالونی کی طرف چل دیئے' جہاں ٹمی رہتا تھا۔

کوئی آدھ گھنٹہ بعد تینوں خداداد کالونی پہنچ گئے۔ غازی کو علاقہ بہت پسند آیا۔ سڑک کے ایک جانب شاندار کوٹھیاں تھیں۔ دوسری طرف طرح طرح کی جھگیاں اور جھونپڑیاں تھیں۔ پھٹے پرانے خیمے تھے جو دور تک بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے۔ جھگیوں اور خیموں کے درمیان ایک اونچے ٹیلے پر قائداعظم کا مزار تھا جس پر عالیشان مقبرہ تعمیر کرنے کا منصوبہ زیر غور تھا۔

کوٹھیوں میں کہیں کہیں اب تک روشنی ہو رہی تھی۔ جھگیوں میں اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ چاروں طرف گہرا سناٹا تھا۔

ٹمی کا گھر کوٹھیوں سے متصل تھا۔ یہ بھی ایک بڑی کوٹھی ہی تھی۔ مگر اس کی تعمیر نامکمل رہ گئی تھی۔ اس کا مالک کوئی ہندو سیٹھ تھا جو ہندوستان چلا گیا تھا۔ عمارت اب متروکہ جائیداد قرار دی جا چکی تھی۔ اس وقت اس میں کئی مہاجر خاندان آباد تھے جنہوں نے کمروں

اور دالانوں کے علاوہ کوٹھی کے وسیع احاطے میں بھی چٹائی اور پھوس کی جھگیاں کھڑی کر کے سر چھپانے کا ٹھکانہ پیدا کر لیا تھا۔لیکن ٹمی کے پاس پورا ایک کمرہ تھا۔ اوپر چھت تھی۔ فرش بھی پختہ تھا۔البتہ دیواروں پر پلاسٹر نہیں ہو سکا تھا۔دروازہ خود اس نے اپنے خرچ سے لگوایا تھا۔

ٹمی نے کمرے کے اندر جا کر لالٹین روشن کی۔ غازی اور بالم نے حیرت سے نظریں گھما پھرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ کمرے میں ایک چارپائی پڑی تھی۔ قریب ہی پانی سے بھرا ہوا گھڑا اور کچھ برتن موجود تھے۔ سامنے دیوار پر لکڑی کا تختہ لگا تھا جس پر ایک چوکور آئینہ' تیل کی شیشی اور کنگھا رکھا تھا۔ غازی نے کمرے میں چل پھر کر ایک ایک چیز کا بغور جائزہ لیا۔ بستر کے سرہانے پڑی ہوئی فلمی گانوں کی کتاب اٹھائی اور لالٹین کی روشنی میں نظریں گڑو گڑو کر پڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ جب وہ پڑھ نہ سکا تو ٹمی کے سامنے کتاب ڈال کر گویا ہوا۔

''ابے تو تو جان پڑتا ہے کہ پڑھ لکھ بھی لیتا ہے۔''

ٹمی انکساری برتنے کے سے انداز میں بولا۔''نہیں جی' بس یونہی کچھ انکل پچو سے کام چلا لیتا ہوں۔''

غازی نے مڑ کر بالم کی جانب دیکھا۔ مسکرا کر پوچھا۔''کیوں بے کیا خیال ہے؟'' اس نے قدرے تامل کیا۔''یار مجھے تو اس کا ٹھکانہ بڑے ٹھاٹ کا لگا۔''

''ہاں جی' بہت اچھی جگہ اس کے ہاتھ لگ گئی۔''

ٹمی اکڑ کر بولا۔''یوں ہی نہیں ملی' پورے تین سو پگڑی دے کر قبضہ ملا ہے۔''

غازی اس کی ہاں میں ہاں ملانے لگا۔''کیوں نہیں؟ اس سے کم میں کیا ملی ہوگی۔ پھر جگہ بھی موقعے کی ہے۔ ایک ہی دفعہ کام بن جائے تو وارے نیارے ہو جائیں۔''

بالم نے بھی اس کی تائید کی۔''ایک سے ایک شاندار کوٹھی ہے۔ یہاں تو بڑی بڑی موٹی مرغی پڑی ہے۔'' ٹمی جو اپنے گھر کی تعریف سن کر خوشی سے پھول کر کپا ہو گیا تھا' ان باتوں کو سن کر بہت سٹپٹایا۔ اس نے فوراً انہیں ٹوکا۔''دیکھو جی' یہ اپنا دھندا تم اپنے ہی علاقے میں کرنا۔'' اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔''میں ایسی یاری نہیں پالتا۔ رات یہاں بسر کر لو اور سیدھے سیدھے اپنا راستہ لو۔''

بالم کو اس کی بات سخت ناگوار گزری۔ تیوری پر بل ڈال کر بولا۔''ابے اتنا اکڑتا کیوں ہے؟ چلے نہیں جائیں گے تو کیا یہیں ڈیرے ڈالے پڑے رہیں گے۔ تجھے زیادہ کھل رہے ہیں تو لے ہم ابھی چلے جاتے ہیں۔'' اتنا کہہ کر وہ باہر جانے کے لیے

دروازے کی سمت بڑھا۔

ٹمی دھیما پڑ گیا۔ منانے کے سے انداز میں گویا ہوا۔ ''یار تونے تو حد کر دی۔ میرا یہ مطلب کب تھا۔ چل بیٹھ۔ اس جاڑے پالے میں کہاں جائے گا۔''

غازی نے بھی سوچا کہ اب اس گرم گرم کمرے سے نکل کر باہر سردی میں جانا خاصا کٹھن مرحلہ ہے۔ ''یار بالم تو بڑا تیز ہے۔ سالا ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتا۔ تونے بھی کس کی بات کا برا مانا۔ ارے یہ ٹمی تو اب اپنا یار ہو گیا ہے۔ میں نے تو سوچا ہے کہ اسے بھی اپنے ساتھ لین میں لگا لیا جائے۔ آدمی کام کا ہے۔ ذرا اناڑی ہے۔ ٹھیک ہو جائے گا۔ جس دن داؤں لگ گیا اور کرارے نوٹ سامنے آئے' سب بھول جائے گا۔'' اس نے بے تکلفی سے قہقہہ بلند کیا۔

بالم روٹھا ہوا بیٹھ گیا۔

ٹمی ذرا دیر خاموش رہا' پھر آہستہ آہستہ کہنے لگا۔ ''تم دونوں ابھی لونڈے ہو' میں تم سے بہت پہلے سارے پاپڑ بیل چکا ہوں۔ چوری بھی کی' چاقو بھی چلائے' جیل بھی کاٹی' سارے جتن کر چکا ہوں مگر بھائی خدا ان پولیس والوں سے بچائے۔ موت کے فرشتے کی طرح ایک بار گھر دیکھ لیا تو پھر پیچھا نہیں چھوڑتے۔ کہیں واردات ہوئی' خواہ مخواہ پکڑ بلوایا۔ کسی کے یہاں دنگا فساد ہوا' نزلہ سب سے پہلے ادھر گرا۔ اسی لیے گھر بار چھوڑ کر یہاں آ گیا۔ بابا اب اپنے میں بوتا نہیں ہے۔ جس دن کھوکھرا پار کی سرحد عبور کی اور پاکستان میں داخل ہوا اسی دن توبہ کر لی تھی کہ اب یہ کام نہیں کروں گا۔ اب تک اللہ میاں کا کرم ہے کہ اپنی بات پر قائم ہوں۔ تھوڑی بہت جو باقی ہے اسی طرح عزت کے ساتھ گزر جائے تو اس کا لاکھ لاکھ شکر۔''

دونوں خاموش بیٹھے اس کی باتیں سنتے رہے۔

ذرا دیر کمرے میں خاموشی رہی پھر غازی کی آواز ابھری۔ ''پر یار کریں تو کیا۔ لکھنے پڑھنے کے معاملے میں یہاں اللہ کا نام ہے۔ نہ کوئی ہنر آتا ہے نہ دست کاری۔ کام کاج کہیں ملتا نہیں۔ چھوٹا موٹا دھندا کریں تو اس کے لیے رقم کہاں سے لائیں۔''

ٹمی کو جیسے پہلے ہی سے علم تھا کہ وہ یہی کہیں گے۔ وہ بڑے اطمینان سے انہیں سمجھانے لگا۔ ''کوشش کرو تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔ کہیں محنت مزدوری کرو۔ اس طرح کیسے کام چلے گا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تم پولیس کے ہتھے نہیں چڑھے۔'' اس نے دونوں کے چہروں کو نظر بھر کر دیکھا۔ ''یارو' غور تو کرو بھلا یہ بھی کوئی زندگی ہوئی۔ ہر وقت جان سولی پر۔ کہیں پولیس والا نظر آ گیا' خون خشک ہو گیا۔ خواہ مخواہ ان کی خوشامد کرو اور گالیاں کھاتے میں کھاؤ۔ بھئی میں تمہارے ہی بھلے کی کہتا ہوں۔''

بالم ابھی تک چپ تھا۔البتہ غازی اس کی باتوں سے خاصا متاثر ہوا۔"اچھا جی' یوں ہی سہی۔چلو تمہاری بات مانی' تم جیسا کہتے ہو وہی کریں گے۔ہم کو بھی یہ زندگی کب پسند ہے۔"

ٹمیٰ نے خوش ہو کر بیڑی سلگائی۔دونوں کا حوصلہ بڑھایا۔دل جوئی کی اور زندگی کی اونچ نیچ دکھا کر لمبا سا لیکچر دے ڈالا۔

رات کے پچھلے پہر تک تینوں باتیں کرتے رہے۔اس عرصے میں ہر ایک نے دل کی بات صاف صاف کہہ ڈالی۔غازی تو پہلے ہی ٹمیٰ کا مرید ہو چکا تھا۔بالم بھی رفتہ رفتہ اس کی باتوں پر ایمان لے آیا۔اس عرصے میں وہ ایک دوسرے کے ساتھ خاصے گھل مل گئے تھے۔طے یہ ہوا کہ تینوں اب اکٹھا رہیں گے۔ٹمیٰ معمول کے مطابق سویرے کام پر چلا جائے گا اور وہ دونوں ویسٹ وہارف جائیں گے۔وہاں جہازوں پر سے سامان اتارنے کے لیے قلیوں کی بھرتی ہونے والی تھی۔کچھ عرصہ تینوں اس طرح محنت مزدوری کریں گے۔اس کے بعد جب ہر ایک کے پاس سو سو روپے اکٹھا ہو جائیں گے تو مل جل کر کوئی کاروبار شروع کر دیں گے۔یہ اسکیم تیار کرنے کے بعد ٹمیٰ نے اٹھ کر فرش پر بستر بچھا دیا۔تینوں کسی نہ کسی طور اس میں دبک کر سو گئے۔

یار محمد عرف ٹمیٰ منہ اندھیرے اٹھ بیٹھا۔اس نے جلدی سے انگیٹھی سلگائی۔چائے کا پانی چڑھایا۔تھوڑی دیر میں دودھ والا بھی آ گیا۔پھیری والے سے اس نے تین بن بھی خرید لیے۔جب وہ چائے تیار کر کے اٹھا تو دھوپ سامنے میدان میں پھیل چکی تھی۔غازی اور بالم ابھی تک بے خبر سو رہے تھے۔ٹمیٰ نے بڑی مشکل سے انہیں جھنجوڑ کر جگایا۔دونوں آنکھیں ملتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ گئے۔ٹمیٰ نے لوٹے میں پانی بھر کر رکھ دیا۔دونوں ہاتھ منہ دھو کر آئے تو چائے کی پیالیوں سے گرم گرم بھاپ اٹھ رہی تھی۔کھانے کے لیے بن بھی موجود تھے۔دونوں کو بہت مدت بعد پہلی بار صبح اٹھنے کی خوشی میسر ہوئی تھی۔

تینوں نے چسکیاں لے لے کر چائے پی۔بن کھائے اور رات کے پروگرام کے مطابق اپنی اپنی منزل کی جانب روانہ ہو گئے۔

شام کو جب ٹمیٰ پلاسٹک کے کارخانے سے واپس ہوا تو اس نے دیکھا' دونوں دروازے پر پہلے ہی سے موجود تھے۔ان کے اترے ہوئے چہرے دیکھ کر وہ سمجھ گیا کہ کام بنا نہیں۔پوچھنے پر معلوم ہوا کہ قلیوں کی بھرتی ہو رہی ہے' مگر ٹھیکیدار کا منشی پچاس روپے فی نفر رشوت مانگتا ہے۔

ٹمیٰ نے انہیں بددل نہ ہونے دیا' ڈھارس بندھائی۔"دل کیوں چھوٹا کرتے ہو؟ جب محنت ہی کرنا ٹھیری تو بندرگاہ پر نہ سہی کہیں اور سہی۔ڈھونڈو تو خدا مل جاتا ہے۔کام کا ملنا کون سی مشکل بات ہے۔"

اس کی باتوں سے دونوں خاصے پرامید ہو گئے۔ دوسرے دن تینوں پھر گھر سے نکل کر اپنی اپنی سمتوں کو چل دیے۔ اس روز بھی دونوں ناکام لوٹے۔ کئی روز تک یہی سلسلہ چلتا رہا۔ ان کے پاس چار روپے موجود تھے' بھاگ دوڑ میں خرچ ہو چکے تھے۔ ٹمی کو جلد ہی ان کے قلاش ہونے کا پتہ چل گیا۔

وہ ان کی اور بھی زیادہ ناز برداری کرنے لگا کہ کہیں دل برداشتہ نہ ہو جائیں۔ صبح اٹھ کر وہ اسی طرح انہیں چائے پلاتا' رات کو تینوں ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے۔ وہ ان سے بے تکلفی کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کرتا۔ مگر ٹمی ان سے جس قدر بے تکلف ہونا چاہتا تھا وہ اسی قدر بیگانے سے ہوتے جا رہے تھے۔ اب وہ اس ٹمی کے بجائے اس کے اصلی نام یار محمد سے مخاطب کرتے۔ خواہ مخواہ خوشامد کرنے کی کوشش کرتے۔ اس معاملے میں غیرارادی طور پر دونوں میں ایک مقابلہ شروع ہو گیا کہ کون ٹمی کی زیادہ خوشنودی حاصل کر سکتا ہے۔ اب دن چڑھے تک سونے کے بجائے وہ صبح تڑکے ہی اٹھ کر انگیٹھی سلگا دیتے اور اکثر ایسا بھی ہوتا کہ ٹمی کے سو کر اٹھنے سے پہلے ہی چائے تیار ہو جاتی۔

ٹمی کے ساتھ رہتے ہوئے مشکل سے دو ہفتے گزرے تھے مگر اس مختصر مدت میں دونوں خاصے بدل گئے تھے۔ اس تبدیلی پر خود ٹمی کو بھی تعجب تھا۔ اب اس کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ کسی طرح دونوں کام دھندے سے لگ جائیں۔ آخر ایک روز ایسی امید بھی نظر آئی۔ اس کے ایک ملنے والے نے صابن کے ایک کارخانے میں دونوں کے لیے کام کی سبیل نکالی تھی۔ اس شام وہ بڑا خوش خوش گھر پہنچا۔ ابھی تک دونوں واپس نہیں آئے تھے۔ وہ ان کی واپسی کا بے چینی سے انتظار ہی کر رہا تھا کہ اسی اثنا میں اس کی نظر بستر پر گئی۔ دیکھا' رضائی غائب تھی۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ اب جو اس نے دوسرے سامان کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ لوٹا بھی غائب ہے۔ اسے بے حد صدمہ پہنچا۔

وہ رات اس کے لیے کاٹنا دوبھر ہو گئی۔ سردی بھی زیادہ تھی۔ ہوا فراٹے بھرتی ہوئی چل رہی تھی۔ اس نے انگیٹھی سلگائی اور اس پر ہاتھ پھیلا کر جسم میں گرمی پہنچاتا رہا۔ جب آنکھیں نیند سے بوجھل ہو جاتیں تو انگیٹھی کے پاس ہی کنڈلی مار کر پڑ جاتا۔ مگر ذرا ہی دیر بعد آنکھ کھل جاتی۔ پھر کوئلے دہکاتا۔ نیند پھر حملہ کرتی۔ ساری رات وہ جاگتا رہتا اور بے قراری سے دونوں کا انتظار کرتا رہا۔ نہ وہ واپس آئے اور نہ ہی گھڑی بھر ٹمی اطمینان سے سو سکا۔

صبح وہ کام پر گیا تو آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ کام کرتے کرتے نیند کا جھونکا آ جاتا۔ کئی بار وہ گرتے گرتے بچا۔ اس روز اس نے

جی بھر کے دونوں کو گالیاں دیں۔ ان دنوں اس کا ہاتھ تنگ تھا۔ نئی رضائی خریدنے کی گنجائش نہ تھی۔ لہٰذا گھر لوٹتے ہوئے اس نے بازار سے پٹ سن کی خالی بوریاں خریدیں اور رات گئے تک انہیں جوڑ جوڑ کر سیتا رہا۔ ان سے رضائی کی سی گرمی اور آرام تو نہیں ملا مگر نیند آ گئی۔

کئی روز گزر گئے۔ رات تاریک اور سرد تھی۔ ٹمی ٹاٹ کے سلے ہوئے ٹکڑے کے اندر دبکا ہوا پڑا تھا۔ کوئی گیارہ بجے کا عمل تھا۔ ساری آبادی سنسان تھی۔ اچانک رات کے سناٹے میں کسی نے دروازے پر دستک دی۔ ٹمی نے گھبرا کر دروازہ کھولا تو حیرت رہ گیا۔ غازی اور بالم مجرموں کی طرح گردن جھکائے سامنے کھڑے تھے۔ ایک کی بغل میں نئی رضائی دبی تھی اور دوسرے کے ہاتھ میں جھلکتا ہوا لوٹا لٹک رہا تھا۔

ٹمی نے تیوری پر بل ڈال کر دونوں کو دیکھا۔ ہاتھ جوڑ کر تیکھے لہجے میں بولا۔ ''بس بھیا' اب تو تم مجھے بخش ہی دو اور یہ رضائی اور لوٹا بھی اپنے ساتھ لیتے جاؤ' مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔''

غازی نے زبان سے ایک لفظ نہ نکالا۔ چپ چاپ پیر سے جوتا نکال کر ٹمی کے سامنے ڈال دیا۔ ''سو جوتے مار لو ٹمی بھیا' مگر زبان سے یہ بات نہ کہو۔''

بالم جواب تک خاموش کھڑا تھا' روہانسا ہو کر بولا۔ ''اب تو ہم یہ طے کر کے آئے ہیں کہ یہ ساتھ چھوٹے گا تو بس مر کر ہی چھوٹے گا۔'' اتنا کہہ کر وہ اس کے پیروں پر جھک گیا۔

ٹمی کا غصہ پہلے ہی کافور ہو چکا تھا۔ اس نے جلدی سے بالم کا بازو پکڑ کر کھڑا کیا۔ تڑپ کر بولا۔ ''یار بالم! کیا غضب کر رہا ہے۔ تو تو میرا بھائی ہے۔'' اس نے کھینچ کر اسے گلے سے لگا لیا۔ بالم اس کے کندھے پر سر رکھ کر بچوں کی طرح رونے لگا۔

تینوں کمرے کے اندر آ گئے۔ غازی نے یہ خوشخبری سنائی کہ اسے ایک ہوٹل میں کام مل گیا ہے اور بالم بھی رکشا چلانے کے دھندے سے لگ گیا ہے۔ ٹمی کو نئی رضائی اور نئے لوٹے کے ملنے سے زیادہ اس اطلاع سے خوشی ہوئی۔

تینوں پہلے کی طرح ایک بار پھر بے تکلفی سے گالیاں بک بک کر باتیں کر رہے تھے۔ دفعتاً غازی نے مڑ کر بالم کو دیکھا' پوچھا۔ ''ابے بالم' وہ ڈبہ کہاں ہے؟''

بالم نے جھٹ جواب دیا۔ ''لے یار میں تو بالکل بھول ہی گیا تھا۔''

اس نے نٹ کھٹ چھوکرے کی طرح چھلانگ لگائی' رضائی کی تہہ کھولی۔ اندر سے ایک ڈبہ نکالا اور اسے کھول کر ٹمی کے سامنے رکھ

دیا۔ ڈبے کے اندر حلوہ اور پراٹھے تھے۔ تینوں نے مزا لے لے کر کھائے اور رات گئے تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ ٹمی بڑا خوش نظر آ رہا تھا۔ غازی اور بالم کے چلے جانے سے کمرے میں جو ویرانی برسنے لگی تھی' آج کئی روز بعد زائل ہو چکی تھی۔

سویرے اٹھ کر انہوں نے مل جل کر بڑی مستعدی سے چائے تیار کی اور خوشی خوشی اپنے کاموں پر چل دیے۔ کچھ عرصے تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ ٹمی کو جیسے یقین ہو چلا تھا کہ اب تینوں مل کر تین سو روپے جلد ہی مہیا کر لیں گے اور پھر کوئی کاروبار کرنے کی اسکیم پر عمل درآمد شروع ہو جائے گا۔

انہی دنوں ایک روز خلاف توقع غازی جلد ہی واپس آ گیا۔ وہ عام طور پر گیارہ بجے رات تک ہوٹل کا کام نبٹا کر آتا تھا۔ ٹمی نے اس کا اترا ہوا چہرہ دیکھا تو گھبرا کر پوچھا۔

"اماں' تم آج جلدی کیوں چلے آئے؟"

غازی نے کوئی جواب نہ دیا۔ چپ چاپ سلگتی ہوئی انگیٹھی کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔ دہکتے ہوئے کوئلوں کی سرخ سرخ آنچ میں اس کا چہرہ پتھر کے مجسمے کی طرح ٹھوس نظر آ رہا تھا۔ ٹمی نے اس دفعہ زور دے کر دریافت کیا۔

"یار کچھ بتا تو سہی' آخر ہوا کیا؟"

غازی نے اس طرح نظریں اٹھا کر دیکھا جیسے بے قرار ہو کر رو پڑے گا۔ پھر آہستہ آہستہ کہنے لگا۔ "یار' ٹمی' میں نے نوکری چھوڑ دی۔"

اڑا اڑا دھم' ٹمی کو ایسا محسوس ہوا گویا مکان کی چھت اس پر آ گری۔ گھبرا کر بولا۔ "کیوں؟ بات آخر کیا ہوئی؟"

"بات کیا ہوتی' میں کام ختم کر کے لوٹ رہا تھا کہ نمبر ۱۲ کے مسافر نے آواز دی۔ میں اندر چلا گیا۔ وہ آج ہی دوپہر کو اس کمرے میں آیا تھا۔ سالے کی ابھی مسیں بھی نہ بھیگی ہوں گی۔ مجھ سے چھوٹتے ہی کہتا کیا ہے' کوئی چھوکری ووکری لے کر آؤ' تم کو بھی خوش کر دوں گا۔ تن بدن میں آگ ہی تو لگ گئی۔ میں نے کہا' ابے تو نے مجھے کوئی بھڑوا سمجھا ہے۔" غازی کا چہرہ غم و غصے سے دہکنے لگا۔ تڑپ کر بولا۔ "سچ کہتا ہوں ٹمی بھائی چاقو نہیں تھا۔ ورنہ سالے کے ٹکڑے کر ڈالتا۔ خاصی تو تو میں میں ہو گئی۔ منیجر بھی وہاں آ گیا۔ وہ سالا الٹا مجھ پر گرجنے لگا۔

"تم نے منیجر کو پوری بات سمجھائی ہوتی۔"

"تو کیا تم سمجھتے ہو میں نے اسے سارا واقعہ نہیں بتایا؟"

''تب تو یار بڑی زیادتی ہوئی۔''

''لو یار اب ہم کسبیوں کی دلالی کریں گے۔ تف ہے سالی ایسی زندگی پر۔''

غازی دیر تک بیٹھا گالیاں بکتا رہا۔ ٹمی کبھی کبھار بیچ میں بول پڑتا۔ یوں ہی باتیں کرتے کرتے بارہ بج گئے مگر بالم ابھی تک نہیں لوٹا تھا۔ وہ دس بجے سے پہلے ہی واپس آ جاتا تھا۔ دونوں اس کا انتظار کرتے کرتے لیٹ گئے۔ کوئی تین بجے کے قریب ٹمی کی آنکھ کھلی۔ اس نے غازی کو جگایا۔ ''اماں غازی' یہ اپنا بالم ابھی تک نہیں لوٹا۔ خدا جانے کیا ہوا؟'' اب تو غازی کو بھی تشویش ہوئی۔ دونوں کی نیند اچاٹ ہوگئی۔ بیٹھے سوچتے رہے کہ اس وقت کیا کیا جائے۔

صبح کا دھندلکا پھیل چکا تھا۔ سردی شدید ہوگئی تھی۔ دونوں یہ طے کر کے باہر جانے ہی والے تھے کہ چل کر بالم کا پتہ لگایا جائے' اسی اثنا میں دروازہ کھول کر وہ کمرے میں داخل ہوا۔ اس کا چہرہ مردے کی طرح سفید ہو رہا تھا۔

غازی نے پوچھا۔ ''اماں کہاں سے آ رہے ہو؟''

''حوالات سے۔''

ٹمی نے گھبرا کر کہا۔ ''حوالات سے؟ آخر ہوا کیا؟''

''سالے نے موٹر الگ اوپر چڑھا دی۔ پوری رکشا کا کچومر کر دیا اور حوالات بھی دکھا دی۔ ٹانگ کا حال یہ ہوا۔'' بالم نے شلوار چڑھا کر پنڈلی دکھائی۔ اس پر کالا کالا خون جما ہوا تھا۔

ٹمی نے بڑے دکھ سے کہا۔ ''لو بھئی یہ بھی دھندے سے چھوٹا۔ دونوں پر ایک ہی روز مصیبت نازل ہونے والی تھی۔ مگر اب کیا کیا جائے؟'' وہ کئی روز تک یہی سوچتا رہا۔

دونوں ایک بار پھر روزی کی تلاش میں سویرے ہی سویرے نکل جاتے اور شام کو منہ لٹکائے واپس آتے۔

دونوں کی تمام پونجی جلد ہی ختم ہونا شروع ہوگئی۔ وہ ذرا ذرا سی بات پر آپس میں جھگڑ پڑتے۔ گالی گلوچ سے بڑھ کر کبھی کبھی ہاتھا پائی تک نوبت آ جاتی۔ ایک دوسرے سے بیڑی تک چھپا کر پیتے کہ کہیں دوسرا مانگ نہ لے۔ تنہائی میں وہ ایک دوسرے کے خلاف ٹمی کے کان بھرتے۔ ان کی آئے دن کی بڑھتی ہوئی کمینگی اور خود غرضی سے ٹمی بے حد پریشان ہوگیا تھا۔

پچھلے کئی روز سے غازی اور بالم میں سخت ٹھنی ہوئی تھی۔ آپس میں بات چیت بھی بند تھی۔ دونوں سویرے ہی سویرے علیحدہ سمتوں کو کام دھندے کی تلاش میں نکل گئے تھے۔ شام کو جب ٹمپی لوٹا تو دونوں میں سے کسی کا پتہ نہیں تھا۔ رات گئے تک بیٹھا ان کا انتظار کرتا رہا۔ اس دوران میں کئی بار تشویش بھی پیدا ہوئی۔ اس نے گھر کی ایک ایک چیز کا جائزہ بھی لیا۔ ہر چیز جوں کی توں موجود تھی۔

آدھی رات سے کچھ ہی دیر پہلے دونوں ساتھ ساتھ لوٹے۔ ان کے چہرے خلاف توقع ہشاش بشاش نظر آرہے تھے۔ آتے ہی بالم تو ٹمپی کے پاؤں دبانے لگا اور غازی نے جھٹ بیڑی سلگا کر پیش کی۔ ٹمپی ہنس کر بولا۔

''آخر آج اتنی خوشامد کیوں ہو رہی ہے؟ کچھ نہ کچھ دال میں کالا ضرور ہے۔''

بالم بتیسی نکال کر ہنسنے لگا۔ غازی سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ یار محمد فوراً بھانپ جائے گا۔ اماں اُس کے قبضے میں ضرور کوئی موکل وکل ہے۔ جبھی تو دل کی بات پڑھ لیتا ہے۔''

غازی بھی مسکرانے لگا۔ ''اب تو یہ بھانپ ہی گیا ہے تو پھر چھپانا کیا۔ صاف صاف بتا دے۔''

''نہیں یار تو ہی بتا۔''

دونوں ایک دوسرے سے اصرار کرنے لگے۔

ٹمپی گومگو کے عالم میں سوچتا رہا کہ یہ سالے نہ جانے آج کیا مسکوٹ کر کے آئے ہیں۔ آخر پریشان ہو کر پوچھا۔

''اماں، صاف صاف کہو بات کیا ہے۔''

غازی گویا ہوا۔ ''ٹمپی بھائی، بات یہ ہے کہ آج ایک جگہ موقع دیکھا ہے۔۔۔۔۔'' وہ آگے کہتے ہوئے ہچکچانے لگا۔ بالم نے فوراً غازی کو سہارا دیا۔ ''خدا قسم آج وارے نیارے ہو جائیں گے۔ بس تم اجازت دے دو۔''

ٹمپی کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ مگر غازی نے اسے کچھ کہنے کا موقع نہ دیا۔ جھٹ بول اٹھا۔ ''صرف ایک دفعہ اجازت دے دو۔ آئندہ یہ کام ہو تو کرنے والی کی۔۔۔۔۔'' اس نے پھر سے ایک زناٹے کی گالی بکی۔ بالم نے ٹمپی کے پاؤں اور بھی تیزی سے دبانا شروع کر دیئے۔ غازی نے جلدی سے دوسری بیڑی سلگا کر پیش کی۔

ٹمپی سخت الجھن میں پڑ گیا۔ ناراض بھی ہوا۔ سمجھایا بھی۔ مگر ان کی زبان پر ایک ہی رٹ تھی کہ آج کے بعد کبھی چوری کریں تو جوتے مار کے گھر سے نکال دینا۔ پولیس کے حوالے کر دینا۔ کبھی دونوں کی صورت نہ دیکھنا۔ آخر ان کی ضد کے سامنے ٹمپی کو مجبور ہونا

پڑا۔

ٹمی کی رضامندی ملتے ہی غازی نے جھٹ ٹریک کے اندر سے چاقو نکالا۔ فرش پر رگڑ کر اس کی دھار تیز کی اور پوری طرح تیار ہو کر بالم کے ہمراہ باہر نکل گیا۔ ٹمی نے غور کیا۔ اس وقت دونوں بے حد خوش نظر آ رہے تھے۔ ان کے چہروں پر خوف کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ ان کے جانے کے بعد باہر آہٹ بھی ہوتی تو وہ چونک پڑتا۔ ایسا محسوس ہوتا جیسے چاروں طرف خطرہ منڈلا رہا ہے۔

مگر غازی اور بالم خطرے سے بالکل بے نیاز تھے۔ ایک گلی کے موڑ سے نکل کر سڑک پر آئے۔ دونوں نے موقعے کی تلاش میں سڑک کا ایک چکر لگایا۔ تھوڑی دیر بعد وہ کوٹھیوں کے درمیان سے گزرنے والی اندھیری گلی میں مڑ گئے۔ اب وہ ایک عالیشان دو منزلہ مکان کے پچھواڑے کھڑے تھے۔ ہر طرف گہرا سناٹا تھا۔ کہر کے دھندلکوں نے تاریکی کا جال پھیلا رکھا تھا۔ بجلی کے کھمبے پر جلنے والا بلب روشنی کا مٹیالا دھبہ معلوم ہو رہا تھا۔

ذرا دیر تک وہ کوٹھی کی چار دیواری میں کھڑے آہٹ لیتے رہے۔ پھر غازی نے کوئی دعا پڑھ کر دونوں کندھوں پر دم کیا اور ''یا علی مدد'' کہہ کر بلی کی طرح قدآدم دیوار پر چڑھ گیا۔ چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا بھالتا آہستہ سے نیچے اترا اور کوٹھی کے احاطے میں پہنچ گیا۔ بالم بھی دیوار پھاند کر ذرا ہی دیر بعد اس کے پاس پہنچ گیا۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ تاریکی تھی۔ گھنے درختوں کے سایوں نے تاریکی کو اور گہرا کر دیا تھا۔ پہلے سے سوچی سمجھی اسکیم کے مطابق غازی نے چاقو دانتوں میں دبایا۔ دونوں ہاتھوں سے پانی کا پائپ آہستہ آہستہ ہلا کر اطمینان کیا۔ ایک بار پھر چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھا اور سنبھل سنبھل کر پائپ کے سہارے چڑھتا ہوا بالائی منزل پر پہنچ گیا۔ بالم نہایت مستعدی سے نیچے کھڑا پہرہ دے رہا تھا کہ ذرا بھی کھٹکا ہو تو سیٹی بجا کر فوراً غازی کو خطرے کا سگنل دے دیا۔

کوٹھی کے پورچ کے اوپر جو کھلی چھت تھی' غازی وہاں ذرا دیر جھکا ہوا کھڑا رہا۔ پھر اس کمرے کی طرف بڑھا جو مشرقی گوشے میں تھا۔ اس کے عقب میں گلی تھی۔ غازی دبے دبے قدموں میں چلتا ہوا کمرے کے قریب پہنچا۔ اس نے دروازے سے کان لگا کر اندر کی سن گن لی۔ کمرے میں قبرستان کا سا سناٹا تھا۔ مگر دروازہ اندر سے بند تھا۔ دوسرے دروازے بھی بند تھے۔ کھڑکیاں بھی بند تھیں۔ تاہم اس نے اندر پہنچنے کی سبیل نکال ہی لی۔ کھڑکی کی چوکھٹ پر پیر ٹکا کر ایک ہاتھ اوپر اٹھایا۔ روشن دان کو آہستہ سے دھکا دیا۔ وہ کھل گیا۔ غازی اچھل کر روشن دان پر پہنچا۔ گردن اندر داخل کی اور بدن سمیٹ کر کسی نہ کسی طرح روشن دان کے راستے کمرے

میں اتر گیا۔ لیکن اس کوشش میں اس کا کندھا بری طرح چھل گیا۔ وہ کندھے کی تکلیف کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ کوئی چیز شور کرتی ہوئی دھڑام سے گری۔ ساتھ ہی وہ بھی منہ کے بل فرش پر آ رہا۔

کمرے میں ننھا سا سبز بلب روشن تھا۔ اس کی ہلکی ہلکی روشنی میں غازی نے دیکھا' وہ گلدان رکھنے کے اونچے اسٹول کے پاس فرش پر پڑا ہے۔ اس کی داہنی ٹانگ اس کے ایک پائے سے الجھی ہوئی تھی۔ اس نے اپنی ٹانگ باہر نکالی ہی تھی کہ اچانک کمرے میں سہمی ہوئی آواز ابھری۔

''کون ہے؟''

غازی سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ پیڈسٹل لیمپ روشن ہو گیا۔ اس کی تیز روشنی ہر طرف پھیل گئی۔

سامنے مسہری پر ایک نوجوان اور خوبصورت عورت گردن اٹھائے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی جانب گھور رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کے برابر سے ایک مرد کا چہرہ ابھرا۔ وہ بھی پریشان اور سراسیمہ نظر آ رہا تھا۔ عورت کا چہرہ اور خوفزدہ ہو گیا۔ بدحواس ہو کر وہ چیخنے لگی۔ ''چور' چور!'' رات کے گہرے سناٹے میں اس کی آواز بڑی ڈراؤنی معلوم ہوئی۔ برابر لیٹے ہوئے مرد نے فوراً ہاتھ بڑھا کر اس کے منہ پر رکھ دیا اور ذرا اونچا ہو کر تکیے کے سہارے بیٹھ گیا۔

غازی نے چاقو سنبھالا اور پھرتی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے فرار ہونے کے لیے کمرے میں نظر دوڑائی۔ آگے بڑھا اور دروازے کی جانب لپکا۔ عین اس وقت باہر زینے پر کسی کے چڑھنے کی آہٹ سنائی دی۔ کوئی آہستہ آہستہ کھانستا ہوا ادھر ہی آ رہا تھا۔ غازی کے قدم وہیں رک گئے۔

''معلوم ہوتا ہے' وہ بڈھا کھوسٹ جاگ گیا۔'' مرد نے سرگوشی کی۔ اس کی آواز خوف سے کپکپا رہی تھی۔ ''جلدی سے لیمپ بجھا دو۔''

''ہاں' وہی ہے۔'' عورت کے چہرے پر سراسیمگی طاری ہو گئی۔ اس نے ہاتھ بڑھایا اور بیڈ سوئچ دبا کر لیمپ بجھا دیا۔

کمرے میں اندھیرا پھیل گیا۔ باہر چھت پر قدموں کی آہٹ ابھر رہی تھی اور رفتہ رفتہ قریب آتی جا رہی تھی۔ دروازے پر پہنچ کر چاپ ختم ہو گئی۔ ذرا دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ غازی نے چاقو تان لیا۔ اور دروازے کی سمت اس طور مڑ کر چوکس کھڑا ہو گیا کہ جیسے ہی وہ اندر داخل ہو فوراً حملہ کر دے۔

باہر سے آواز آئی۔ ''کیا ہوا بیگم' ڈر گئیں؟''

عورت کچھ نہ بولی۔" مرد بھی خاموش رہا۔ دونوں خوف سے دم بخود تھے۔ غازی بھی ڈرا ہوا تھا۔ چاقو پر اس کی گرفت مضبوط ہو گئی۔ کمرے میں گہری خاموشی طاری تھی۔

باہر دروازے پر بھی خاموشی تھی۔ رات سنسان تھی۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ مگر یہ پر ہول سکوت زیادہ دیر تک قائم نہ رہا۔ دروازے پر پھر آواز ابھری۔ "بیگم' بیگم! میں نے تمہارے کمرے سے چیخنے کی آواز سنی تھی۔ خیریت تو ہے؟" اس دفعہ اس نے زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔

عورت ہنوز دم بخود پڑی رہی۔ غازی بھی سانس روکے کھڑا تھا۔ وہ فوراً تاڑ گیا کہ آنے والا سامنے مسہری پر لیٹی ہوئی عورت کا شوہر ہے۔

اب صورت حال کچھ اور سنگین ہو گئی تھی۔ وہ چاقو سنبھالے ہوئے مستعدی سے کھڑا تھا اور نگاہیں اٹھائے دروازے کو تک رہا تھا۔

دروازے پر پھر آہٹ ابھری اور زیادہ زور سے ابھری۔ ساتھ ہی آواز بھی آئی۔ "بھئی بیگم! تم تو بہت گہری نیند سوتی ہو' دروازہ تو کھولو۔" وہ زور زور سے کھانسنے لگا۔ رک رک کر دروازہ بھی کھٹکھٹاتا رہا۔

"کون ہے بھئی؟ کاہے کو شور مچا رکھا ہے۔" عورت اب خاموش نہ رہ سکی۔ اٹھلا کر بیزاری سے بولی۔

غازی نے مڑ کر مسہری کی جانب چوکنا نظروں سے دیکھا۔ وہ سخت پریشان اور گھبرایا ہوا تھا۔ کمرے میں ٹھہرنا خطرناک تھا اور فرار ہونے کا بھی کوئی راستہ نہ تھا۔ وہ بری طرح پھنس گیا تھا۔

"میں ہوں علی اشرف" دروازے پر کھڑے ہوئے شوہر نے اونچی آواز سے کہا۔ "بیگم' تم خیریت سے تو ہو؟"

"میں بالکل خیریت سے ہوں۔" بیوی نے جھنجلا کر جواب دیا۔ "مجھے سخت نیند آ رہی ہے۔ پریشان نہ کیجئے' جایئے جا کر سو جایئے۔ آپ کو نیند نہیں آتی' میری نیند بھی حرام کر دی ہے۔"

وہ نرم لہجے میں بولا۔ "اچھا' اچھا' ناراض نہ ہو۔ میں جا رہا ہوں' تم اطمینان سے سو۔"

بیوی نے کچھ نہ کہا۔ خاموش لیٹی رہی' مگر شوہر خاموش نہ رہا۔ "اکبر بھی اپنے کمرے میں نہیں ہے۔ نہ جانے کہاں واہی تباہی گھومتا پھرتا ہے۔ اسے تو رات کو بھی چین نہیں۔" وہ بڑبڑاتا رہا مگر بیوی ٹس سے مس نہ ہوئی۔ دم سادھے پڑی رہی۔

باہر دروازے پر اس کی کھانسی سنائی دی۔ وہ الجھ الجھ کر کچھ دیر کھانستا رہا۔ پھر زور زور سے ہانپنے لگا۔ اس کے ہانپنے کی آواز

کمرے کے اندر صاف سنائی دے رہی تھی۔ جب ذرا قرار آیا تو وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا لوٹ گیا۔ اس کی چاپ چھت پر ابھرتی رہی۔ دور ہوتی گئی۔

جب چاپ زینے پر پہنچ کر رات کی خاموشی میں ڈوب گئی تو غازی کے ہوش بھی بجا ہوئے۔ اب وہ ان دونوں کی جانب متوجہ ہوا۔ اس نے موقعے کی نزاکت سے فائدہ اٹھانے کی ٹھانی۔ چاقو ہاتھ میں دبائے ہوئے آگے بڑھا۔ مسہری کے قریب پہنچا۔ سبز بلب کی دھندلی دھندلی روشنی میں اس نے دیکھا۔ مرد سہما ہوا تکیے کے سہارے بیٹھا تھا۔ اس کا بالائی دھڑ لحاف سے باہر نکلا ہوا تھا۔ وہ سردی سے کپکپا رہا تھا۔ غازی کو اپنی جانب گھورتے دیکھ کر اس نے پوچھا۔ ''کیا چاہتے ہو؟''

غازی نڈر ہو کر بولا۔ ''چاہنا وانا کیا ہے' جو مال پانی ہے نکال کر ادھر دو۔''

''اکبر'' عورت نے مرد کو مخاطب کیا۔ ''جو کچھ تمہارے پاس ہے' دے دلا کر اس سے پیچھا چھڑاؤ۔'' اس کے لہجے میں سخت غم و غصہ تھا۔ ''نہ جانے یہ مصیبت کہاں سے نازل ہو گئی۔''

اکبر نے زبان سے کچھ نہ کہا۔ مڑا اور تکیے کے نیچے ہاتھ ڈال کر ٹٹولنے لگا۔ اس نے پرس نکالا اور غازی کے سامنے پھینک دیا۔ دھیرے سے بولا۔ ''اس میں جو کچھ ہے لے لو اور یہاں سے چپ چاپ چلے جاؤ۔'' غازی نے چمڑے کا خوشنما بٹوہ اٹھا کر کھولا۔ رقم گنی۔ کل ۶۳ روپے تھے۔ سخت کوفت ہوئی۔ اس نے بٹوہ جیب میں رکھا اور اپنی جگہ پر جما ہوا کھڑا رہا۔ عورت کو اس کا رویہ گراں گزرا۔ جھنجھلا کر بولی۔

''اب کھڑے کیوں ہو؟ جاؤ یہاں سے۔''

غازی موقعے سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ درشت لہجے میں گویا ہوا۔ ''میں اس طرح یہاں سے نہیں ٹلنے کا۔ اس ۶۳ روپلی سے اپنا کام نہیں چلے گا۔ جلدی نکالو ورنہ۔۔۔۔۔۔'' اس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

عورت کا چہرہ غصے سے لال بھبوکا ہو گیا۔ اس نے بھنا کر کچھ کہنا چاہا مگر اکبر نے جھٹ اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس نے مڑ کر غازی کی جانب دیکھا۔ ہاتھ کے اشارے سے واضح کیا کہ اب اس کے پاس اور کچھ نہیں۔

غازی نے اسے نظر انداز کیا۔ عورت کی جانب متوجہ ہوا۔ اس کے بال تکیے پر بکھرے ہوئے تھے۔ ہلکی ہلکی سبز روشنی میں اس کا چہرہ کچھ اور دل آویز ہو گیا تھا۔ وہ برابر اسے گھور رہی تھی۔ اس کی نگاہوں سے حقارت آشکارہ تھی۔ غازی نے بھی اس کی نفرت کو محسوس کیا۔ تلملا کر سوچا۔ یہ سالی حرافہ کس اطمینان سے اپنے دھگڑے کے پہلو میں لیٹی ہے۔ ذرا بھی خوفزدہ نہیں۔ اوپر سے رعب جھاڑ رہی

ہے۔ کچھ نہ کچھ اس سے بھی اینٹھنا چاہیے۔ اس نے تیوری پر بل ڈال کر قہر آلود نظروں سے عورت کو دیکھا۔ چاقو سنبھال کر آگے بڑھا۔ ڈپٹ کر آہستہ سے بولا۔

"نقد نہیں تو کوئی زیور و یور نکالو جلدی کرو۔"

اس نے کھلا ہوا چاقو عین اس کے سامنے کر دیا۔

عورت کا سارا غصہ کافور ہو گیا۔ سراسیمہ ہو کر پھٹی پھٹی آنکھوں سے تکنے لگی۔ اکبر بدحواس ہو کر لحاف سے باہر آ گیا۔ اس کے جسم پر نام کو لباس نہ تھا۔ خوف سے اس کی گھگی بندھ گئی۔ گڑگڑا کر بولا۔ "خدا کی قسم اب ہمارے پاس کچھ بھی نہیں۔ زیور و یور بھی نہیں ہے۔"

عورت نے جلدی جلدی گردن ہلا کر اس کی تائید کی۔ "زیور تو نیچے کمرے میں رکھا ہے، مگر میں وہاں کیسے جا سکتی ہوں۔"

اکبر نے عاجزی سے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے اور سہمی ہوئی نگاہوں سے غازی کو جانب دیکھنے لگا۔ غازی کو ننگا دھڑنگا اکبر اس عالم میں بڑا مضحکہ خیز لگا۔ اسے بے ساختہ ہنسی آ گئی۔ جل کر بولا۔ "سالا زنخا، دھت تیرے کی۔" اس نے سڑی ہوئی گالی دی۔

وہ گالی سن کر بھی خاموش رہا۔ عورت بھی دم بخود پڑی رہی۔ غازی نے اس کی جانب کوئی توجہ نہ دی۔ مزید ڈرانے دھمکانے سے گریز کیا۔ مبادا بنا بنایا کھیل بگڑ جائے، لینے کے دینے پڑ جائیں۔ وہ جھنجلایا ہوا مڑا۔ دروازے پر پہنچا۔ بولٹ کھولا۔ باہر نکلا اور چھت پر پہنچ گیا۔

ہر طرف سناٹا تھا۔ کہر کا نیلگوں دھندلکا پھیلا ہوا تھا۔ غازی منڈیر کے پاس پہنچا۔ پائپ مضبوطی سے پکڑا اور اس کے سہارے پھسلتا ہوا چھت سے نیچے اتر گیا۔ اس نے ادھر ادھر نگاہیں دوڑائیں۔ بالم کا کہیں پتہ نہیں تھا۔

احاطے میں ٹھہرنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ فوراً چار دیواری پر چڑھا اور آہستہ سے گلی میں اتر گیا۔ بالم وہاں بھی نہ تھا۔ اسے تشویش لاحق ہوئی۔ گلی سے نکل کر سڑک پر پہنچا۔ بالم دور دور تک نظر نہ آیا۔ اس نے کئی بار حلق سے اپنی مخصوص آواز نکالی۔ مگر اس اشارے کا اسے کوئی جواب نہ ملا۔

غازی نے چاقو بند کیا اور احتیاط سے جیب میں رکھ لیا۔ بالم کے نہ ملنے پر وہ پریشان ہو گیا تھا۔ اسی پریشانی کے عالم میں واپسی ٹیمی کے پاس پہنچا۔ دیکھا، بالم وہاں موجود ہے۔ مگر خوفزدہ اور گھبرایا ہوا نظر آ رہا تھا۔

غازی نے خفا ہو کر کہا۔ ''سالے خان' تم یہاں بیٹھے ہو اور میں تم کو ادھر تاپ رہا تھا۔''

بالم کھسیانا ہو کر صفائی پیش کرنے لگا۔ ''یار جیسے ہی جگار ہوئی' میں نے فوراً سیٹی بجا کر خطرے سے خبردار کیا پر تمہارا کہیں پتہ نہ تھا۔

ٹمی نے مداخلت کی۔ ''یار میں تو سمجھا تھا کہ آج تو دھر لیا گیا اور تیرے ساتھ مجھے بھی حوالات دیکھنا پڑے گی۔''

''اماں کوئی کچی گولیاں کھیلے ہوئے ہیں۔'' غازی نے ہنس کر مطلع کیا۔ ''مگر استاد' کام کچھ بنا نہیں۔'' اس نے پرس نکال کر سامنے ڈال دیا۔ ''البتہ وہ مزا آیا کہ زندگی بھر یاد رہے گا۔ یار ایسے موقع پر پہنچا کہ معاملہ بالکل چنا جور گرم تھا۔'' وہ کھلکھلا کر ہنسا اور ساری تفصیل مزہ لے لے کر سنانے لگا۔

بالم اور ٹمی اس کی باتیں سن کر بار بار ہنس پڑتے۔

اس روز وہ فجر کی اذان کے وقت تک جاگتے رہے۔ سوئے تو دن چڑھے تک کسی کی آنکھ نہ کھلی۔ ٹمی کو بھی کارخانے جانا نہیں تھا۔ اور غازی اور بالم تو کافی عرصے سے چھٹی ہی پر تھے۔ بیکار دن تھے' بیکار راتیں۔

سب سے پہلے غازی کی آنکھ کھلی۔ دونوں کو سوتا چھوڑ کر سیدھا حلوائی کی دکان پر گیا اور گرم گرم پوریاں لے آیا۔ بالم اور ٹمی ابھی تک سو رہے تھے۔ اس نے دونوں کو جگایا۔ سب نے مل کر پوریاں کھائیں۔ سگریٹ کے لمبے لمبے کش لگائے اور زور زور سے قہقہے لگاتے رہے۔ اس روز وہ بڑے مگن تھے۔

غازی کا پروگرام تھا کہ شام کو سینما دیکھا جائے' مگر ٹمی نے مخالفت کی۔ ''تم ساری رقم اسی طرح خرچ کر دو گے۔ تم کو تو حرام خوری کی عادت پڑ گئی ہے۔ یہ نہیں سوچتے کہ ایسا سبیتا نکالا جائے کہ کوئی ڈھنگ کا کام دھندا کیا جائے۔''

غازی مسکین سی صورت بنا کر بولا۔ ''اتنی سی رقم سے بھلا کیا دھندا شروع کیا جا سکتا ہے۔''

بالم نے بھی اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ ''اماں ٹمی بھائی ۶۳ روپلی سے بھی کوئی دھندا شروع کیا جا سکتا ہے۔'' اتنا کہہ کر وہ احمقوں کی طرح ہنسنے لگا۔ ''یار آج فلم کا پروگرام ہو ہی جائے۔ بہت دن ہو گئے سالی کوئی فلم نہیں دیکھی۔''

ٹمی کے آگ ہی تو لگ گئی۔ پہلے تو اس نے دونوں کو خوب ڈانٹا۔ پر سرپرستانہ انداز میں دیر تک سمجھاتا بجھاتا رہا۔ آخر یہ طے ہوا کہ اس رقم سے کوئی چھوٹا موٹا کاروبار کیا جائے۔ اب سوچنا یہ رہ گیا تھا کہ کس قسم کا کاروبار شروع کیا جائے۔ کئی اسکیمیں سامنے آئیں مگر کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔

بالم‘ جواب تک خاموش بیٹھا تھا‘ چٹکی بجا کر بولا۔ ”یار سینما کے ٹکٹوں کی بلیک کیسی رہے گی؟ مزے سے دونوں مل کر چار پانچ روپے روزانہ پیٹ لیا کریں گے اور سینما پھوکٹ میں دیکھنے کو ملے گا۔ کہو استاد کیسی کہی؟“ وہ داد طلب نگاہوں سے دونوں کو دیکھنے لگا۔

غازی نے گالی دے کر کہا۔ ”یہ سالا تو ایسی ہی سوچتا ہے۔ ابے یہاں ایک سے ایک بڑا دھاکڑ مکرانی پڑا ہے۔ سالے ان کی دادا گیری کے سامنے تمہاری کیا دال گلے گی۔ پھر پولیس کے ڈنڈے الگ کھاؤ۔ ایسا دھندا کرنا ہے تو کوکین یا چرس کا کاروبار کرو جس میں رقم بھی اچھی ہاتھ لگے۔ ٹکٹوں کی بلیک میں تو ہر وقت جوتا لات رہے گا۔“

ٹمی کو یہ باتیں سخت ناگوار گزریں۔ ”تم دونوں کا تو ایمان خراب ہو گیا ہے۔ جب سوچو گے بے ایمانی اور اٹھائی گیری پن کی بات۔“ پھر اس نے خود ہی فیصلہ صادر کر دیا۔ ”میرے ساتھ رہو گے تو یہ چار سو بیسی نہیں چلے گی۔ تم دونوں آج ہی جا کر ایک ٹوکری خریدو اور ایمپریس مارکیٹ سے انڈا مکھن اور ڈبل روٹی لے کر کل صبح سے پھیری لگانا شروع کر دو۔ روپیہ‘ دھیلی روز بچ جایا کرے گا۔ کچھ رقم پلے ہو جائے تو کوئی اور دھندا بتاؤں گا۔“

دونوں نے حیل و حجت کرنا چاہی تو اس نے ڈانٹ کر خاموش کر دیا۔

کچھ دیر بعد دونوں اٹھے اور ایمپریس مارکیٹ کی جانب روانہ ہو گئے۔

ان کے جانے کے بعد ٹمی پھر پڑ کر سو گیا۔ شام کو آنکھ کھلی۔ دیکھا‘ دونوں ابھی تک واپس نہیں آئے۔ وہ گھر میں بیٹھا ان کا انتظار کرتا رہا۔ رات کے کوئی نو بجے دونوں لوٹے۔ مگر آپس میں گالم گلوچ کرتے ہوئے۔ غازی نے آتے ہی بالم کی شکایت کا دفتر کھول دیا۔

”ٹمی بھائی‘ اس سالے نے تو آج اپنا گلا کٹوا دیا۔ یہ دیکھو‘ دس آنے پوری رقم میں سے باقی بچے ہیں۔“

وہ جیب سے ریز گاری نکال کر دکھانے لگا۔ ”ٹمی کو دکھ بھی ہوا اور غصہ بھی آیا۔ پوچھا۔ ”آخر ہوا کیا؟“

غازی نے بتایا۔ ”اماں‘ میں تو انڈے خریدنے جا رہا تھا‘ اس سالے کا ایک یار مل گیا۔ اس نے ایسی پٹی پڑھائی کہ میں بھی اندھا ہو گیا۔ ریلوے کے پارسلوں کا نیلام تھا۔ اماں وہ بیچ بچا جاتے ہیں جن کا کوئی چھڑانے والا نہیں ہوتا۔ زبردستی مجھ سے ایک پارسل پر بولی لگوا دی۔ بیس روپے پر بولی چھوٹی۔ اندر سے نکلا کیا؟ گوڈر اور پتھر کے ٹکڑے۔ ریلوے والوں نے اصلی مال پہلے ہی پار کر دیا تھا۔“

بالم‘ جواب تک مجرموں کی طرح سر جھکائے کھڑا تھا‘ تڑپ کر بولا۔ ”اب یہ پوچھو کہ باقی رقم کہاں گئی؟“ اس نے غازی کی طرف

دیکھ کر کہا۔ ”اب یہ بھی کہہ دو کہ ریس چلنے کے لیے بھی میں نے ہی کہا تھا۔“

غازی سر کے بال کریدنے لگا۔ ”میں نے سوچا کہ چلو یہاں تقدیر نے دھوکا دیا' شاید ریس میں قسمت لڑ جائے۔ پر سالا آج کا دن ہی کچھ منحوس تھا۔“

ٹمنی خاموش بیٹھا رہا۔ دونوں دیر تک اپنے اپنے طور پر خود کو بے گناہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ جب دیر تک ٹمنی کچھ نہ بولا تو دونوں نے اس کی خوشامد شروع کر دی۔ بالم پیر دبانے کے لیے بار بار ہاتھ بڑھاتا اور ٹمنی اس کا ہاتھ جھٹک دیتا۔ غازی نے بیڑی سلگا کر دی تو اس نے لینے سے بھی انکار کر دیا۔ کئی منٹ تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ آخر ٹمنی جل کر دونوں کو گالیاں دینے لگا۔ دونوں بے غیرتی سے دانت نکالے ہنستے رہے۔

اب پھر دونوں پیسے پیسے کو محتاج ہو چکے تھے۔ بات بات پر آپس میں جھگڑا کرتے۔ ٹمنی کی خوشامد کرتے اور سویرے ہی سویرے کام دھندے کی تلاش میں گھر سے نکل جاتے۔ انہی دنوں ایک روز ٹمنی نے کارخانے سے واپسی پر یہ بری خبر سنائی کہ اس کا کام بھی جاتا رہا۔ سیٹھ نے کارخانہ بند کر دیا تھا۔ اس لیے کہ اس سال حکومت نے اسے امپورٹ لائسنس نہیں دیا تھا۔

بے روزگاری کے دنوں میں ٹمنی بھی بدلنے لگا۔ ذرا ذرا سی بات پر لڑ پڑتا۔ گالیاں بکتا۔ اس کی طبیعت میں برابر چڑچڑا پن آتا جا رہا تھا۔ بالم اور غازی ہر وقت سہمے ہوئے رہتے تھے۔ ٹمنی کی تیوری پر بل دیکھتے تو چپکے سے باہر نکل جاتے۔ اب وہ اس سے ڈرنے لگے تھے۔

غازی اور بالم تو پہلے ہی قلاش تھے۔ اب ٹمنی کی حالت بھی انہی کی سی ہو گئی تھی۔ کئی کئی وقت بغیر کچھ کھائے گزر جاتے۔ تینوں مل جل کر گھنٹوں نئی نئی اسکیمیں سوچتے۔ دن دن بھر دوڑ دھوپ کرتے مگر کوئی نتیجہ نہیں نکل رہا تھا۔

انہی دنوں کا ذکر ہے۔ ٹمنی رات بھر کا بھوکا تھا۔ صبح اٹھا تو نہ چائے تھی نہ بیڑی۔ رات کو نیند اسے یوں ہی کم آئی تھی۔ مزاج بھی چڑچڑا ہو رہا تھا۔ کمرے میں اس وقت صرف بالم موجود تھا۔ غازی سویرے ہی سویرے کہیں نکل گیا تھا۔

ٹمنی نے منہ ہاتھ دھونے کے لیے لوٹا لے کر گھڑے سے پانی نکالنا چاہا۔

گھڑا بالکل خالی تھا۔ وہ جھنجھلا کر بالم پر برس پڑا۔ ”تم لوگ تو سالے لاٹ صاحب ہو' کسی سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ مٹکے میں پانی بھر لیا ہوتا۔ میں کوئی تمہارے باپ کا نوکر ہوں کہ ہر کام میں ہی کروں۔“

بالم نے دیکھا کہ صبح ہی صبح نزلہ ادھر گر رہا ہے' اس نے جھٹ غازی کو ڈھال بنایا۔ کہنے لگا۔ ''میں نے تو کل پانی بھر دیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے غازی صبح اٹھ کر نہایا ہے۔ یہ دیکھو دروازے کے باہر کیچڑ ہو رہی ہے۔''

ٹمی نے غازی کو گالیاں دینا شروع کر دیں۔ اس وقت اتفاق سے وہ بھی آ گیا۔ پہلے ہی غصہ کیا کم تھا کہ اس بات پر اور آگ لگ گئی کہ وہ اس کی پتلون بھی پہنے ہوئے تھا۔ اس کے پہنچتے ہی چیخ کر بولا۔

''کیوں جی' یہ پتلون تم نے کس کی اجازت سے پہنی؟ تمہارے باپ نے بنوا کر دی تھی کہ جب چاہا پہنا اور سالے نواب بن کر چل دیئے۔''

غازی شکایت کرنے کے لہجے میں بولا۔ ''دیکھو جی ٹمی' تم ذرا ذرا سی بات پر باپ دادا تک پہنچ جاتے ہو۔'' پھر اس نے غصے سے اس کی پتلون اتار کر پھینک دی اور اپنی شلوار پہنتے ہوئے بڑبڑانے لگا۔ ''شلوار پھٹی ہوئی تھی' سالا بدن تک ننگا نظر آتا ہے۔ ایک جگہ کام ملنے کی امید پر گیا تھا۔ ذرا سی پتلون پہن لی تو آفت مچا دی۔''

ٹمی اس درشت لہجے میں بولا۔ ''ہم نے ہزار دفعہ کہا کہ ہماری چیز مت چھوا کرو۔ مگر تم تو بے غیرت ہو بے غیرت'' اور پھر اس نے غصے سے اٹھ کر پتلون کی موریاں پکڑیں اور چر چر کر کے اسے پھاڑ ڈالا۔

کمرے کی فضا بڑی مکدر ہو گئی تھی۔ ٹمی زور زور سے گالیاں دے رہا تھا۔ بالم بھی کبھی کبھی اس کی تائید کرتا جا رہا تھا۔ غازی اس وقت ٹمی سے تو کچھ نہ کہہ سکا البتہ بالم پر برس پڑا۔ ٹمی کو اس بات پر اور تاؤ آ گیا۔ کہنے لگا۔

''ابے اس کے سر کیوں ہو رہا ہے؟ مجھ سے کہہ۔ دادا گیری دکھانا ہے تو کہیں اور جا کر دکھا۔ یہاں نہیں چلے گی۔ بس ہو چکی یاری۔ بڑھاؤ اپنا ٹٹو اور یہاں سے چلتے پھرتے نظر آؤ۔''

غازی نے زبان سے تو ایک لفظ نہیں نکالا جھپٹ کر اس کی گردن دبوچ لی اور اس زور سے دھکا دیا کہ ٹمی فرش پر دور تک لڑھکتا چلا گیا۔ ٹمی فوراً اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں۔ گلا پھاڑ کر چیخا۔

''ابھی نکل جا' سالے' الو کے پٹھے''

غازی تیزی سے دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ بالم لمحہ بھر تک خاموش کھڑا رہا' پھر وہ بھی باہر چلا گیا۔ ٹمی کو اس کے اس طرح چلے جانے پر حیرت تو ہوئی مگر اس نے بالم کو نہ ٹوکا نہ روکا۔

دونوں کے جانے کے بعد وہ تھکا ہوا سا بستر پر جا کر لیٹ گیا۔ کمرے کے اندر ویرانی برس رہی تھی۔ سورج اب چڑھ کر سر پر آ

گیا۔ مگر وہ اسی طرح بے سدھ پڑا رہا۔ سہ پہر ہوئی۔ شام ہوگئی۔ دونوں میں سے کوئی بھی واپس نہ آیا۔ اس نے بڑے دکھ کے ساتھ سوچا۔ اب وہ دونوں یہاں کبھی نہیں آئیں گے۔

جب اندھیرا بڑھنے لگا تو اسے خیال آیا کہ اس طرح گھر میں پڑے پڑے کس طرح کام چلے گا۔ کئی وقت کے فاقے نے اسے بیماروں کی طرح نحیف و ناتواں بنا دیا تھا۔ آخر وہ ہمت کر کے اٹھا اور یہ طے کر کے گھر سے نکلا کہ آج کوئی نہ کوئی دھندے کی صورت نکال کر واپس آئے گا۔ کہیں دور جانے کی ہمت نہ تھی۔ لہٰذا اس نے سوچا کہ آخر خداداد کالونی میں اتنی بہت سی جو شاندار کوٹھیاں ہیں' کہیں نہ کہیں تو کام کاج مل ہی جائے گا۔ اب وہ برتن دھونے سے لے کر ہر کام کرنے کے لیے آمادہ ہو چکا تھا۔

مُنّی نے سوچا کہ سب سے پہلے وہ کس کے پاس جائے۔ سوچتے سوچتے اسے خان بہادر صاحب کا خیال آ گیا۔ ان کی کوٹھی کے نوکروں سے اس کی جان پہچان بھی تھی۔ اکثر وہاں آتا جاتا رہتا تھا۔ خان بہادر کو بھی کبھار سلام کرنے کا موقع مل جاتا۔ وہ سیدھا ان کے پاس پہنچا۔ اتفاق سے وہ کوٹھی کے لان میں ٹہلتے ہوئے مل گئے۔ وہ ان کو سلام کر کے ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ انہوں نے آنے کی وجہ دریافت کی تو اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

''سرکار' کام کاج چھوٹ گیا ہے۔ بہت دنوں سے بے روزگار ہوں۔ دو وقت کے کھانے کا سہارا ہو جائے' تو آپ ہی کے قدموں میں پڑا رہوں گا۔''

وہ اظہار معذرت کرتے ہوئے بولے۔ ''بھئی فی الحال کسی آدمی کی ضرورت نہیں۔ اکرم میاں کو ایک اردلی کی پچھلے دنوں ضرورت تھی۔ مگر اب تو انہوں نے ملازمت ہی چھوڑ دی۔ وہ تو نہیں چاہتا تھا' ماں نے زور دیا کہ میرا بیٹا دفتر کے کاموں سے دبلا پڑ گیا ہے۔ میں آٹھ سو روپلی کے لیے اس کی صحت غارت نہیں ہونے دوں گی۔ تم جانو ماں کی ممتا کے سامنے کس کا بس چلتا ہے۔ اکرم کو نوکری چھوڑنا ہی پڑی۔ اب تو وہ آئندہ مہینے امریکہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے جا رہا ہے۔''

مُنّی نے سوچا' یہ شخص تو نہ معلوم کب تک اپنے بیٹے کی کتھا سناتا رہے گا۔ یہ ایسی باتیں تھیں جن سے اسے کوئی سروکار نہ تھا۔ اس نے خان بہادر سے اجازت لی۔

''اچھا سرکار' پھر کسی اور وقت آؤں گا۔ ابھی ایک جگہ اور جانا ہے۔''

وہ کوٹھی سے باہر نکلا اور برابر غصے سے بڑبڑاتا رہا۔ یہاں پانچ ٹکے کا سہارا نہیں' یہ سالا بتا رہا ہے کہ سات آٹھ سو روپے میں میرے بیٹے کی صحت خراب ہوتی جا رہی ہے۔ واہ اللہ میاں خوب ہے تمہارا انصاف۔''

وہ اپنی دھن میں مگن جا رہا تھا کہ اندھیرے میں کسی سے ٹکرا گیا۔ گھبرا کر دیکھا ایک ننگ دھڑنگ بچہ کھڑا منہ بسور رہا ہے۔
اس کے ہاتھ میں کٹورا تھا جو زمین پر گر پڑا تھا۔ بچہ کچھ دیر منہ بسورتا رہا۔ پھر ایکبار زور سے چلا کر رونے لگا۔ سامنے کی جھگی میں سے ایک عورت چیخی۔ "ارے کیا ہو گیا؟ حرامی منہ سے تو بول۔ روئے کیوں جا رہا ہے؟"
ٹمی نے سوچا' عورت بڑی تیز معلوم ہوتی ہے۔ بلا کی طرح پیچھے پڑ جائے گی۔ وہ گھبرا کر برابر والی سڑک پر مڑ کر ایک بنگلے کے اندر داخل ہو گیا۔ اسی وقت نہ جانے کہاں سے ایک خوفناک کتا نکل کر اس پر جھپٹا۔ ٹمی گھبرا کر چیخا۔ فوراً ہی کسی نے آواز دی۔
"روبی' روبی ادھر آؤ۔" کتا دم ہلاتا ہوا اس کے قدموں پر جا کر لوٹنے لگا۔ اس شخص نے وہیں سے پوچھا۔ "کس سے ملنا ہے؟"
ٹمی خاموشی سے اس کے پاس چلا گیا۔ وہ کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ اندر سے دس بارہ سال کا ایک بچہ نکلا اور اس شخص سے کہنے لگا۔ "پاپا' نیلی کھانا نہیں کھاتی۔ بہت شور مچا رہی ہے۔" اسی اثناء میں ایک پیاری سی بچی منہ بسورتی ہوئی آ گئی۔ وہ پوچھنے لگا۔
"نیلو بیٹا' کیا بات ہے؟"
بچی سسکیاں بھرتی ہوئی بولی۔ "وہیں لے چلو پاپا' جہاں کل کھانا کھایا تھا۔ ہم یہاں نہیں کھائیں گے۔"
اس شخص نے بچی کو گود میں اٹھا لیا اور اسے چمکارنے لگا۔ "ہوٹل چلے گی؟ میں اپنی نیلو کو لے کر ابھی چلوں گا۔" اس نے ڈرائیور کو آواز دی۔
"ڈرائیور گاڑی نکالو۔ ہم باہر جائیں گے۔"
اس نے ٹمی کی طرف توجہ ہی نہیں دی۔ بچی کو گود میں لیے ہوئے اندر چلا گیا۔ اب وہاں ٹھہرنا بے کار تھا اور اس سے زیادہ اس بڑے بڑے بالوں والے خوفناک کتے کا خوف دامن گیر تھا۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا کوٹھی سے باہر آ گیا۔ وہاں سے دل برداشتہ لوٹا۔ اسے یہی مناسب معلوم ہوا کہ واپس گھر چلا جائے لیکن بھوک کے مارے برا حال تھا۔ اس نے سوچا گھر جا کر بھی کیا کرے گا۔ چلو ایک آدھ جگہ اور کوشش کر دیکھوں۔ شاید کہیں قسمت لڑ جائے۔ واپس تو بہر حال جانا ہی ہے۔
وہ ڈرتا جھجکتا ایک اور کوٹھی پر پہنچا۔ پھاٹک ہی سے اس نے چاروں طرف چوکنا نظروں سے دیکھا۔ کہیں آس پاس کوئی کتا تو نہیں ہے۔ مگر میدان صاف تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ مگر وہاں بالکل سناٹا تھا۔ وہ خاموش کھڑا رہا۔ لوٹنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ مشرقی کمرے کا دروازہ کھول کر ایک ادھیڑ عمر آدمی باہر آیا۔ وضع قطع سے خانساماں معلوم ہوتا تھا۔ ٹمی نے آہستہ سے پوچھا۔ "صاحب اندر ہیں؟"

وہ بولا "ہاں اندر ہی ہیں؟" اس نے ایک کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ "سامنے بیٹھے ہیں۔ جا کر مل لو۔" اتنا کہہ کر وہ چلا گیا۔ ٹمی آگے بڑھا۔ دروازے پر پہنچا۔ ہچکچاتے ہوئے کمرے کا پردہ سرکایا اور دہلیز پر ٹھٹک کر رہ گیا۔

اندر سے کسی نے بھاری آواز میں پوچھا۔ "کون ہے؟ اندر آ جاؤ۔ وہاں کیوں کھڑے ہو؟"

وہ بھاری بھرکم جسم کا آدمی تھا۔ ڈاڑھی مونچھیں صفا چٹ۔ سر چندلا۔ آنکھوں پر چوڑے فریم کا چشمہ۔ اس وقت وہ کوئی انگریزی رسالہ پڑھ رہا تھا۔ ٹمی سے پوچھنے لگا۔

"کیوں بھئی' کیا کام ہے؟"

اس کا لہجہ بڑا نرم تھا۔ ٹمی کو ڈھارس بندھی۔ گڑگڑا کر اپنا مدعا بیان کیا۔ وہ خاموشی سے ٹمی کی باتیں سنتا رہا۔ ٹمی اپنی بات ختم بھی نہ کر سکا تھا کہ ایک ملازم کمرے میں داخل ہوا۔ ادب سے گویا ہوا۔

"ڈاکٹر صاحب آ گئے ہیں۔"

ذرا ہی دیر بعد ڈاکٹر ایک موٹی تگڑی عورت کے ساتھ کمرے میں آ گیا۔ عورت نے ڈاکٹر کو مخاطب کیا۔ "دیکھئے' ڈاکٹر صاحب! ان کی گردن پر آج صبح سے یہ سرخ نشان نظر آ رہا ہے۔ یہ برابر مصر ہیں کہ مچھر کے کاٹنے کا نشان ہے۔ انہیں اپنی صحت کا ذرا بھی خیال نہیں۔ دیکھئے تو کیسا لال ہو رہا ہے۔ میرا تو دل پریشان ہو رہا ہے۔"

"ڈاکٹر صاحب! ان کو تو یونہی وہم ہو جاتا ہے۔"

ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے جھک کر اس کی گردن کا اچھی طرح معائنہ کیا اور کاغذ پر نسخہ لکھ کر بولا۔ "بازار سے یہ مرہم منگوا لیں۔ سوتے وقت لگا لیں۔ اس مرہم سے یہ داغ مٹ جائے گا۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ صبح تک ٹھیک نہیں ہوا تو انجکشن لگا دوں گا۔"

ساری ہدایات دے کر اس نے اپنا بیگ سنبھالا اور چلنے کے لیے کھڑا ہو گیا۔ عورت نے اپنا پرس کھولا اور ڈاکٹر صاحب کو پچاس روپے دے دیے۔ ڈاکٹر چلا گیا۔ عورت وہیں بیٹھ کر باتیں کرنے لگی۔ باتیں کرتے کرتے اس کی نظر ٹمی پر پڑ گئی۔ پوچھنے لگی۔

"یہ کون ہے؟"

اس کا خاوند بولا۔ "بے چارہ پریشان ہے۔ ملازمت چاہتا ہے۔"

وہ بگڑ کر بولی۔ "آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ ہمارے پاس یونہی زیادہ آدمی ہیں۔ مگر آپ کو اس سے کیا غرض' جو آیا اسے رکھ لیا۔ نوکروں کی پوری پلٹن ہو گئی اور سب حرام خور نکلے ہیں۔" وہ ٹمی کی جانب متوجہ ہوئی۔ "نا بابا' ہم کو کوئی نوکر وکر نہیں چاہیے۔" مگر ٹمی

وہاں سے ہٹا نہیں۔ گردن جھکائے کھڑا رہا۔ اس نے عاجزی سے کہا۔ ”کام کاج نہیں مل سکتا تو آپ دس بیس روپے سے مدد کر دیجئے۔ اللہ نے آپ کو اتنا دیا ہے۔ میں اس سے کوئی چھوٹا موٹا دھندا۔۔۔۔۔۔۔۔“

عورت نے اس کی بات پوری سنی بھی نہیں' منہ بگاڑ کر بولی۔ ”لو اور سنو! یہاں کوئی خیرات بٹتی ہے کہ آ ؤ پیروں لے جاؤ۔“

ٹمی نے سوچا اب جو یہاں ٹھہرا تو یہ حرام زادی نوکر کو بلا کر باہر نکلوا دے گی۔ اس نے بڑی خون خوار نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور کمرے کے باہر آ گیا۔

سڑک پر پہنچ کر اسے بالم اور غازی یاد آ گئے۔ ان کی یاد کے ساتھ اور بھی بہت سی باتیں یاد آ گئیں۔ اس نے پلٹ کر کوٹھی کی طرف دیکھا۔ پھاٹک پر چوکیدار بھی نہیں تھا۔ کتا بھی نگرانی کے لیے نہیں تھا۔ کوٹھی کی چھت پر پیپل کا گھنا پیڑ جھکا تھا۔ موقع اچھا تھا۔ وہ شکاری کی سی تیز نظروں سے اس طرف یک لخت گھورتا رہا۔ پھر خود ہی چونک پڑا۔ نہیں جی' یہ ٹھیک نہیں۔ معلوم ہوتا ہے اللہ تعالٰی میرا امتحان لے رہے ہیں۔ یہ تو آزمائش ہے۔ اس نے اپنے گالوں پر کس کس کے دو طمانچے لگائے۔ کان پکڑے اور تیز تیز قدموں سے گھر کی طرف چل دیا۔

گھر پہنچ کر دیکھا کہ دروازہ کھلا ہے۔ گھبرایا ہوا اندر گیا۔ غازی اور بالم وہاں موجود تھے۔ اسے دیکھتے ہی کان پکڑ کر گردن جھکا لی۔ اس حالت میں وہ سرکس کے مسخروں کی طرح نظر آ رہے تھے۔ ٹمی کو بے اختیار ہنسی آ گئی۔ پوچھا۔ ”تم دونوں دن بھر کہاں رہے؟“

بالم بولا۔ ”بات بعد میں ہو گی' پہلے کچھ کھا لو۔ بھوک کے مارے آنتیں قل ھو اللہ پڑھ رہی ہیں۔ بس اب آ جاؤ۔ اتنا کہہ کر اس نے کاغذ میں لپٹی ہوئی روٹیاں اور کباب نکال کر سامنے رکھ دیئے۔

”صبح سے ایک دانہ بھی حلق میں گیا ہو تو سور کھایا ہو۔“ غازی نے ٹمی کا ہاتھ پکڑ کر بٹھا لیا۔

تینوں کتوں کی طرح کھانے پر ٹوٹ پڑے۔ کھانا کھانے کے بعد دیر تک شکوے شکایت کا سلسلہ جاری رہا۔ پھر انہوں نے اس موضوع پر بحث چھیڑ دی کہ اب کیا کیا جائے۔ باتوں باتوں میں بالم نے مشورہ دیا کہ مکان کو پگڑی پر اٹھا دیا جائے۔ ایک آدمی کئی دن سے اس کے لیے کہہ بھی رہا ہے۔ اس کا اندازہ تھا کہ پانچ سو روپے تک دے دے گا۔ اگر ایسا ہو جائے تو پھر اس رقم سے کوئی کاروبار شروع کیا جائے۔

لیکن ٹمی اس کے لیے آمادہ نہ ہوا۔ ”یہ بھی سوچا کہ رہو گے کہاں؟“

"اماں کہیں بھی پڑ رہیں گے۔ تھوڑے دنوں کی تو بات ہی ہے۔ کام دھندا چل گیا تو رہنے کا ٹھکانہ بھی ہو جائے گا۔ یوں کب تک بھوکے مرتے رہیں گے؟"

ٹمی پھر بھی رضامند نہ ہوا۔

غازی نے دبی زبان سے تجویز پیش کی۔ "کہو تو ایک روز پھر قسمت آزما لیں۔ میں نے کئی جگہ موقع لگایا ہے۔ قسم خدا کی داؤں لگ گیا تو سارے دلدر دور ہو جائیں گے۔ بولو کیا کہتے ہو؟"

ٹمی بھنا کر گالیاں بکنے لگا۔ جب ذرا اس کا غصہ ٹھنڈا ہوا تو غازی اور بالم نے پھر وہی سوال دہرایا کہ آخر کیا کیا جائے۔ کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا اور فوری طور پر کرنا تھا۔ بڑی حیل وحجت کے بعد ٹمی اس بات پر آمادہ ہو گیا کہ ہفتہ بھر تک کام کاج تلاش کیا جائے۔ اگر اس عرصے میں کامیابی نہ ہو تو مکان پگڑی پر دے کر اس رقم سے کوئی چھوٹا موٹا کاروبار شروع کیا جائے۔

تینوں کام دھندے کی تلاش میں سویرے ہی سویرے نکل گئے۔ سب سے پہلے ٹمی واپس آیا۔ اس نے دیکھا' پاس پڑوس کے گھروں میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ عمارت قریب کی کوٹھی میں رہنے والے حاجی کریم نے اپنے کلیم کی بنیاد پر الاٹ کرالی ہے۔ پندرہ روز کی مدت میں عمارت خالی کرنے کا نوٹس بھی مل چکا ہے۔

ٹمی کو یہ اطلاع ملی تو پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ سخت پریشان ہوا۔ رات گئے غازی اور بالم لوٹے۔ ٹمی نے انہیں بھی صورت حال سے آگاہ کیا۔ وہ بھی پریشان ہو گئے۔

دوسرے روز صبح عمارت میں رہنے والے سارے مرد اکٹھے ہوئے۔ ہر شخص اپنی اپنی رائے کا اظہار کر رہا تھا۔ گھنٹوں بحث ہوتی رہی۔ آخر یہ فیصلہ کیا گیا کہ حاجی کریم سے ایک وفد کی صورت میں ملاقات کی جائے۔ حاجی کو اپنی پریشانیوں سے آگاہ کیا جائے اور یہ درخواست کی جائے کہ وہ مدت سے رہتے بستے لوگوں کو بے دخل کرنے کی کوشش نہ کرے۔ اس عمارت کے بجائے کوئی اور کوٹھی بنگلہ اپنے نام الاٹ کرا لے۔

پروگرام کے مطابق شام کو ایک وفد عبداللہ خان کی سربراہی میں حاجی کریم کی کوٹھی پر پہنچا۔ عبداللہ سن رسیدہ ہونے کے ساتھ ساتھ معاملہ فہم بھی تھا۔ مزاج کا بھی ٹھنڈا تھا۔ بات کرنے کا ڈھب جانتا تھا۔ نمازی اور پرہیزگاری تھا۔ سب اس کی عزت کرتے تھے۔ انہی خصوصیات کی بنا پر اسے متفقہ طور پر سربراہ مقرر کیا گیا تھا۔ وفد پانچ افراد پر مشتمل تھا۔ ان میں ٹمی بھی شامل تھا۔

حاجی کریم عمر میں عبداللہ خاں سے کچھ زیادہ تھا۔ خوب گھنی سفید ڈاڑھی تھی۔ جسم بھاری بھرکم تھا۔ چہرے سے خوشحالی ٹپکتی تھی۔ میریٹ روڈ پر ہارڈ ویئر کی بہت بڑی دکان تھی۔ اس کے علاوہ امپورٹ ایکسپورٹ کا بھی کاروبار تھا۔ بارسوخ آدمی تھا۔ اعلیٰ حکام تک رسائی تھی۔ مگر طبیعت میں تکبر نہ تھا۔ اس نے وفد کا خندہ پیشانی سے خیر مقدم کیا۔ عبداللہ خاں سے مسکرا کر پوچھا۔ ''کہو میاں عبداللہ کیسے آنا ہوا؟'' اس نے جان بوجھ کر بے نیازی کا مظاہرہ کیا۔ انجان بننے کی کوشش کی۔

''سرکار! ایک درخواست لے کر آپ کے پاس آئے تھے۔'' عبداللہ خاں نے عاجزی سے کہا۔

''کیسی درخواست؟ خیریت تو ہے؟''

''اجی' یہ تو آپ کو خبر ہی ہوگی کہ ہم لوگ جس عمارت میں رہتے ہیں اسے خالی کرنے کا نوٹس ملا ہے۔'' عبداللہ نے صورت حال بیان کی۔ ''بڑی مشکل سے سر چھپانے کا ٹھکانہ ملا ہے۔ اب یہاں سے نکل کر کہاں جائیں گے۔''

''بھئی جھگیوں میں تو رہنا ہی ہے' کہیں بھی ڈال لو۔ اللہ کے نہ جانے کتنے بندے اسی طرح گزر بسر کر رہے ہیں۔'' حاجی کریم کے چہرے سے نرمی غائب ہوگئی۔ ''اس وقت تو تم نے ناجائز قبضہ کر رکھا ہے۔ ایک نہ ایک دن تو تم کو بوریا بستر اٹھا کر یہاں سے جانا ہی تھا۔ اب تو خالی کرنے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں۔ سرکاری حکم ہے۔''

''سرکار! آپ اتنی مہربانی کریں' اس عمارت کے بجائے کوئی اور الاٹ کرالیں۔'' عبداللہ خاں نے گڑگڑا کر کہا۔ ''آپ کو اللہ نے سب کچھ دیا ہے۔ اوپر تک پہنچ بھی ہے۔ ہم لوگوں کے دل سے آپ کے لیے دعائیں ہی نکلیں گی۔''

''اماں' عبداللہ خاں تم کیسی بچوں کی سی باتیں کر رہے ہو۔'' حاجی کریم بے رخی سے گویا ہوا۔ ''آج کل کے زمانے میں الاٹمنٹ حاصل کرنا تم نے ہنسی ٹھٹھا سمجھ رکھا ہے۔ ہر شخص تو بغل میں کلیم کا بستہ دبائے الاٹمنٹ کے لیے مارا مارا پھر رہا ہے۔ تم کو کیا خبر کہ کتنی بھاگ دوڑ کے بعد یہ الاٹمنٹ ملا ہے۔ پانی کی طرح پیسہ بہایا ہے۔ پندرہ ہزار تو صرف الاٹمنٹ آرڈر نکلوانے کے لیے رشوت دی ہے۔''

''ضرور دی ہوگی جی' رشوت کے بغیر تو کوئی کام بنتا ہی نہیں۔'' عبداللہ نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی' لہجے میں رقت پیدا کرتے ہوئے گھگیا کر کہا۔ ''ہم تو یہ چاہتے تھے کہ آپ کے زیر سایہ پڑے رہیں' کچھ ہماری پریشانی کا بھی خیال کریں۔''

''اپنی پریشانی تو تم کو یاد رہ گئی مگر میری پریشانی کا ذرا خیال نہ آیا۔'' حاجی کریم کا لہجہ تلخ ہوگیا۔ اس کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر عبداللہ خاموش ہوگیا مگر ممی سے خاموش نہ رہا گیا۔ ''حاجی صاحب آپ کے پاس تو رہنے کو پہلے ہی اتنی بڑی کوٹھی موجود ہے۔''

حاجی کریم نے ٹمی کو پوری بات کہنے نہ دی' فوراً مداخلت کی۔ ''لاکھوں کی جائیداد چھوڑ کر آیا ہوں۔ یہ کوٹھی کیا ہے! ایسی ہی کتنی کوٹھیاں اور بنگلے چھوڑ کر آیا ہوں۔ یہاں اس کے عوض کلیم میں ملا ہی کیا ہے۔'' اس نے منہ بگاڑ کر نہایت بے مروتی سے کہا۔ ''صاف بات یہ ہے کہ یہ جگہ تو تم کو خالی ہی کرنا ہوگی۔ خیریت اسی میں ہے کہ اپنا اپنا سامان اٹھاؤ اور کہیں اور ڈیرہ ڈالو۔ قانون سے ٹکر لینے کی کوشش کرو گے تو نقصان اٹھاؤ گے۔ جس نے بھی ہیکڑی دکھائی' ذرا بھی سرکشی کی' وہ جیل کی ہوا کھائے گا۔'' اس نے سیدھی دھمکی دی۔ ''ابھی وقت ہے' ٹھنڈے دل سے سوچ لو بعد میں پچھتاؤ گے۔''

وفد کے ارکان میں سے کسی کو مزید کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوئی۔ سب منہ لٹکائے چپ بیٹھے رہے۔ حاجی کریم اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ''اچھا بھئی' مجھے تو اب کھانا کھانا ہے۔ میرا کام تو تم کو شیب وفراز سے خبردار کرنا تھا' وہ میں نے کر دیا۔ آگے تمہاری مرضی۔'' وہ مڑا' برابر والے کمرے کا دروازہ کھولا اور اندر چلا گیا۔

وفد کے لیے اب ٹھہرنا فضول تھا۔ سب اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ حاجی کریم کی کوٹھی سے نکل کر باہر سڑک پر آ گئے اور بوجھل قدموں سے اپنے ٹھکانے کی جانب چلے۔ سب کے چہروں سے غم وغصہ عیاں تھا۔

''اماں' کیسی اونچی' اونچی ہانک رہا تھا۔'' شیخ عنایت نے چلتے چلتے اپنی جھنجلاہٹ کا اظہار کیا۔ وہ وفد کے ارکان میں سے سب سے زیادہ عمر دراز تھے۔ پریشان حال بھی کچھ زیادہ ہی تھے۔ ''کہتا تھا عالیشان کوٹھیاں اور بنگلے چھوڑ کر آیا ہوں۔ میں نے اس کی وہ کوٹھیاں بھی دیکھی ہیں اور بنگلے بھی۔ اپنی طرح یہ بھی آگرے ہی کا ہے۔ نائی کی منڈی میں کرائے کے مکان میں رہتا تھا جس کا دروازہ بھی نہ تھا۔ ٹاٹ کا پردہ پڑا ہوتا تھا۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے' وہ بھی ثابت نہ تھا۔''

''اماں شیخ جی! تم سچ کہہ رہے ہو؟'' عیدو کبابیے نے چونک کر حیرت سے پوچھا۔ وہ بھی پانچ رکنی وفد میں شامل تھا۔

''تو کیا میں جھوٹ کہہ رہا ہوں۔'' شیخ عنایت نے تڑپ کر اپنے ردعمل کا اظہار کیا۔ ''اسے کیا میں تو اس کے باپ کو بھی جانتو ہوں۔ وہ بے چارہ تو ساری زندگی خوانچہ اٹھا کر گلی گلی پھیری لگاتا رہا۔ اس نے کچھ پڑھ پڑھا لیا تھا۔ ضلع کچہری کے پھاٹک پر بوری پر بیٹھا عرضیاں ورضیاں لکھا کرتا تھا۔ یہاں آ کر دیکھا تو ٹھاٹھ باٹ ہی اور تھے۔ پتہ نہیں حاجی کیسے بن گیا۔ میں تو کہوں ہوں' جس طرح جعلی کلیم ولیم کا چکر چلا کر جائیداد اور کوٹھیاں الاٹ کروا رہا ہے ایسے ہی اس نے خود کو حاجی بھی بنا لیا ہوگا۔''

''اجی اب تو وہ بڑا آدمی بن گیا ہے۔'' عیدو کبابیے نے تبصرہ کیا۔ ''ایسا ویسے کو تو گھاس نہیں ڈالتا۔ دیکھتا نہیں کس شان سے موٹر میں بیٹھ کر کوٹھی سے نکلتا ہے۔''

"ہاں بھئی' اپنی اپنی قسمت ہے۔" عبداللہ خاں نے آہ سرد کھینچی۔ "اللہ جسے دیتا ہے چھپر پھاڑ کر دیتا ہے۔"

وفد کے ارکان اسی طرح باتیں کرتے ہوئے نڈھال اور شکستہ اپنے ٹھکانے پر پہنچے۔ سب ہی دل برداشتہ تھے مگر ٹمی کا حوصلہ بلند تھا۔ اس نے دوسروں کا بھی حوصلہ بڑھایا اور سب کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ چاہے پولیس آئے یا فوج' عمارت کسی قیمت پر خالی نہ کی جائے۔ اس نے اونچی آواز سے کڑک کر کہا۔

"اجی' یہاں سے ہمیں اٹھانا دل لگی نہیں ہے۔ اتنے سارے لوگ جم کر سامنے آ گئے تو کس مائی کے لال میں ہمت ہے کہ یہ جگہ ہم سے خالی کرا لے۔"

اس کی باتوں سے لوگوں کو خاصی ڈھارس ہوئی۔

سب نے تہیہ کر لیا کہ عمارت خالی کرنے کے بجائے ڈٹ کر صورت حال کا مقابلہ کیا جائے۔ یہ خبر اڑتی اڑتی حاجی کریم تک پہنچی۔ اس نے فوراً پینترا بدلا۔ عبداللہ خاں کو اپنے ملازم کے ذریعے بلایا۔ عمارت خالی کرنے کی بات چھیڑی۔ عبداللہ خاں نے اپنی اور دوسروں کی پریشانی سے ایک بار پھر اسے آگاہ کیا۔

اس دفعہ حاجی نے خفگی سے اجتناب کیا۔ لہجے میں نرمی اور حلاوت پیدا کرتے ہوئے ہمدردی کا اظہار کیا اور یہ پیش کش کی کہ عمارت خالی کرنے والے ہر خاندان کو وہ جھگی بنانے کے لیے پچاس روپے دے گا۔

عبداللہ خاں نے واپس پہنچ کر حاجی کریم کی پیش کش سے آگاہ کیا۔ اس کی باتوں سے صاف اندازہ ہوتا تھا کہ وہ حاجی کریم سے بہت متاثر ہے۔ اسے نیک دل اور خدا ترس سمجھتا ہے۔ کچھ لوگ حاجی کریم کی پیش کش قبول کرنے پر نیم رضامند بھی ہو گئے مگر ٹمی اور اس طرح کے چند جوشیلے نوجوانوں نے مخالفت کی تو وہ بھی اکھڑ گئے۔

عبداللہ نے حاجی کریم کو سب کا عندیہ بتایا تو اس دفعہ بھی اس نے نرمی سے کام لیا۔ اپنی پیش کش پچاس سے پچھتر کر دی اور عبداللہ کو دو سو روپے دینے کا وعدہ کیا۔ یہ رشوت کام کر گئی۔ عبداللہ نے اس دفعہ نہایت رازداری سے کام لیا۔ ۷۵ روپے معاوضہ لے کر عمارت خالی کرنے پر لوگوں کو چپکے ہی چپکے آمادہ کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

دیکھتے ہی دیکھتے کئی خاندان عبداللہ خاں کے ذریعے حاجی کریم سے رقم لینے کے بعد عمارت چھوڑ کر چلے گئے۔ مگر بیشتر خاندان جمے رہے' ان میں ٹمی بھی شامل تھا۔ بالم اور غازی اس کے ساتھ مرنے مارنے پر پوری طرح تیار تھے۔ عبداللہ خاں نے ایسے خاندانوں کو سمجھا بجھا کر اپنا ہم خیال بنانے کی بہت کوشش کی لیکن کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ آخر ایک رات وہ بھی اپنا سامان اٹھا کر چلا

گیا۔

نوٹس کی معیاد ختم ہوگئی مگر عمارت خالی کرانے کے لیے نہ کوئی سرکاری اہلکار آیا نہ حاجی کریم کا کوئی کارندہ یا ملازم۔ دن گزرتے رہے۔ مہینہ بھر سے زیادہ عرصہ ہوگیا۔ ٹھہرنے والے ٹھہرے رہے۔ اب وہ مطمئن نظر آتے تھے اور جو لوگ عمارت خالی کر کے چلے گئے تھے ان کی ناسمجھی پر کف افسوس ملتے تھے۔

ٹمنی' غازی اور بالم میں سے کسی کو اب تک کام کاج نہیں ملا تھا۔ لیکن انہی دنوں بالم کا ایک شناسا رکشا والا اتفاق سے بیمار پڑ گیا۔ بام اس کا رکشا لے کر چلانے لگا۔ اس سے جو کچھ مل جاتا تینوں کسی نہ کسی طور پیٹ بھر لیتے۔

مکان پگڑی پر اٹھانے کی بات چیت پھر شروع ہوگئی تھی۔ پچھلے دنوں تو کوئی اس ڈر سے آمادہ نہ ہوتا تھا کہیں خالی نہ کرنا پڑے۔

ایک روز غازی کہیں سے سینما کا پاس لے آیا۔ تینوں فلم دیکھنے گئے اور کوئی بارہ بجے رات کو لوٹے۔ انہوں نے دور ہی سے دیکھ لیا کہ عمارت کے سامنے لوگوں کا ہجوم ہے۔ گیس بتی جل رہی تھی۔ لوگ چیخ چیخ کر باتیں کر رہے تھے۔ بچے رو رہے تھے۔ تینوں گھبرائے ہوئے قریب پہنچے۔ دیکھا' پولیس کی خاصی بڑی جمعیت موجود ہے۔ سڑک کے ایک طرف سامان کا جگہ جگہ ڈھیر لگا تھا۔ پوری عمارت پولیس نے خالی کرائی تھی۔

عورتیں رو رو کر بپتا سنا رہی تھیں کہ کس طرح گھروں میں گھس گھس کر زبردستی کھینچ کر باہر نکالا گیا۔ کیونکر ان کا سامان اٹھا اٹھا کر پھینکا گیا۔ دھونس دھمکی اور مار پیٹ سے بھی دریغ نہ کیا گیا۔ مرد خاموش تھے۔ ان میں سے کچھ کو پولیس پکڑ کر تھانے لے گئی تھی۔ ان پر ہنگامہ اور بلوہ کرنے کا الزام تھا۔

غازی اور بالم آپے سے باہر ہوگئے۔ گالیاں بکنے لگے۔ مگر ٹمنی نے سمجھا بجھا کر انہیں ٹھنڈا کیا۔ دونوں کو ساتھ لے کر اپنا سامان تلاش کرنے لگے۔ دیر تک ادھر ادھر ڈھونڈنے کے بعد کچھ سامان ملا۔ وہ رات انہوں نے سامنے کے چھوٹے سے میدان میں بسر کی جو کوڑا کرکٹ ڈالنے کے کام آتا تھا۔

سردی ختم ہو چکی تھی مگر رات بھر اس شدت کی اوس پڑی کہ تینوں بھیگ کر رہ گئے۔ سویرے اٹھے تو ہر ایک کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ میدان میں پڑے ہوئے دوسرے لوگوں کا حال بھی ان سے مختلف نہ تھا۔ کوئی کھانس رہا تھا کوئی درد سے ہائے ہائے کر رہا تھا۔

میدان رفتہ رفتہ خالی ہوتا گیا۔ جس کا جدھر منہ اٹھا' چلا گیا۔

مگر ٹمی اڑ گیا۔ وہ کہیں نہ گیا۔ بالم اور غازی بھی اس کے ساتھ ٹھہرے۔ تینوں نے ٹوٹی پھوٹی جھگیوں کے ملبے سے بانس نکالے چٹائیاں اکٹھا کیں اور ایک گھنے درخت کے تنے کے سہارے سر چھپانے کا ٹھکانہ بنالیا۔

عمارت کے خالی ہوتے ہی حاجی کریم نے ادھوری تعمیر مکمل کرانے کے لیے کام شروع کرادیا۔ بالم اور غازی روز صبح اٹھ کر زیر تعمیر عمارت دیکھتے' ان کا خون کھولنے لگتا۔ وہ حاجی کریم اور اس کے گھر والوں کے ساتھ ایسے ایسے جائز اور ناجائز رشتے جوڑتے کہ اگر سن لیتا تو دونوں کو عمارت کی دیواروں میں چنوا دیتا۔ البتہ ٹمی خاموشی سے سب کچھ دیکھتا رہا۔ اب اس نے ہنسنا بولنا بھی بند کردیا تھا۔ ہر وقت گم صم رہتا۔ نوکری کی تلاش بھی چھوڑ دی تھی۔ اس کی صحت گرنے لگی تھی۔ رخساروں کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں اور آنکھوں میں ویرانی چھائی رہتی۔

دیکھتے ہی دیکھتے ادھوری اور اجڑی ہوئی عمارت کی جگہ ایک بڑی شاندار کوٹھی ابھر کر سامنے آگئی۔ اس کی دیواریں اجلی اجلی نظر آتیں۔ دروازے تازہ پالس سے جھلکتے۔ دریچوں پر ریشمی پردے لہراتے۔ کوٹھی تعمیر ہوگئی تو ایک رات زبردست جشن ہوا۔ حاجی کریم کے بڑے بیٹے نے جو باپ کی بہ نسبت تعلیم یافتہ اور روشن خیال سمجھا جاتا تھا' شاندار ہاؤس وارمنگ پارٹی دی۔ اس میں سیاسی رہنماؤں کے ساتھ ساتھ اعلیٰ حکام اور دیگر معززین نے شرکت کی۔ کوٹھی کے سامنے ہر طرف آس پاس کاریں ہی کاریں نظر آتی تھیں۔ رات گئے تک یہ ہنگامہ برپا رہا۔

رات کے پچھلے پہر غازی کی اچانک آنکھ کھل گئی۔ دیکھا کہ ٹمی نے اس کے سرہانے سے چاقو نکال لیا ہے اور خاموش کھڑا انگلی پھیر پھیر کر دھار کی تیزی دیکھ رہا ہے۔ دھندلی روشنی میں وہ بڑا ڈراؤنا نظر آرہا تھا۔

غازی دم سادھے پڑا رہا۔ ذرا دیر بعد ٹمی آہستہ آہستہ چلتا ہوا باہر چلا گیا۔ جب وہ اندھیرے میں غائب ہوگیا تو غازی نے بالم کو جگایا۔ صورت حال سے آگاہ کیا۔ دونوں نے سوچا' معلوم ہوتا ہے کہ ٹمی آج کہیں گھات میں گیا ہے۔ غازی کہنے لگا۔

''ہاں جی' بھلا کہیں ایمانداری سے کام چلتا ہے آج کل۔ سالا خواہ مخواہ بڑا ملاں بنا گھومتا ہے۔ اپنا تو کباڑا کردیا۔'' بالم نے گلا کیا۔ ''یار یہاں کی دھوپ میں رکشا چلانا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ اماں سر بھن کے رہ جاتا ہے۔''

دونوں دیر تک اسی طرح باتیں کرتے رہے۔ انہیں ٹمی کی واپسی کا انتظار تھا۔ صبح کی سفیدی پھیلنے سے پہلے انہیں سڑک پر ٹمی نظر آیا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھا رہا تھا۔ آن کی آن میں وہ ان کے سامنے تھا۔

دونوں اٹھ کر بیٹھ گئے۔غازی بولا۔''اماں کہاں گئے تھے؟''

ٹمی نے انگلی کے اشارے سے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔دونوں نے دھندلی روشنی میں دیکھا' اس کے ہاتھ میں کھلا ہوا چاقو تھا جس سے ابھی تک خون ٹپک رہا تھا۔دونوں کانپ اٹھے۔ٹمی نے کپڑے کی ایک پوٹلی ان کے سامنے ڈال دی۔آہستہ سے بولا۔

''بیس ہزار سے کچھ کم ہیں۔سالو' اسے لے کر بھاگ جاؤ۔میں نے وہاں سب کا صفایا کر دیا۔پانچوں کو ٹھکانے لگا دیا ہے۔سب کو قتل کر دیا۔ایک ایک کو۔''وہ شرابی کی طرح جھوم جھوم کر بول رہا تھا۔پھر اسی عالم میں غصے سے چیخا۔

''ابے اب میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو؟ جاؤ نکل جاؤ۔دن چڑھنے سے پہلے پہلے یہاں سے دور چلے جاؤ۔اس وقت تک کسی نوکر چاکر کو پتہ نہ چلے گا۔''

غازی نے ڈرتے ڈرتے کہا۔''اور تم؟''

ٹمی ہنس دیا۔''میں تو سیدھا تھانے جا رہا ہوں۔''

بالم تڑپ کر بولا۔''نہیں ٹمی بھائی' یہ نہیں ہو سکتا۔تم بھی ہمارے ساتھ چلو۔''

ٹمی نے ڈپٹ کر کہا۔''بڑا آیا سالا ہمدرد بن کے۔ابے جاتے ہو کہ نہیں۔''اس نے دونوں کے سامنے چاقو کر دیا۔

دونوں گھبرا کر کھڑے ہو گئے۔غازی کچھ کہنے کے لیے ٹھٹکا تو ٹمی نے زور سے گالی دی۔''جا تیری تو۔۔۔۔۔۔۔''اور وہ ان کی طرف چاقو اٹھا کر لپکا۔

دونوں نے رقم کی پوٹلی جلدی سے اٹھائی اور بھاگ کھڑے ہوئے۔

کچھ دور جا کر وہ ٹھہر گئے۔دونوں نے دیکھا۔ٹمی خون آلود چاقو لیے شرابیوں کی طرح لڑکھڑاتا ہوا سامنے سڑک پر جا رہا ہے۔صبح کاذب کی ہلکی سفید روشنی میں وہ کبڑے سائے کی مانند نظر آ رہا تھا۔

دونوں آگے بڑھے اور تیز تیز قدم اٹھاتے اسٹیشن کی جانب روانہ ہو گئے۔وہ ٹمی کی ہدایت کے مطابق جلد سے جلد کراچی سے بہت دور نکل جانا چاہتے تھے۔



میموریل

شام ہوتے ہی ٹوٹو نے پھر وہی حرکت کی۔ نہ جانے اس بچے کو کیا ہو گیا ہے۔ ادھر اندھیرا ہوا اور ٹوٹو غائب۔ ڈھنڈیا پڑی۔ دیکھا میلے کپڑوں کی ٹوکری کے اندر پڑا گہری نیند سوتا ہے۔ اس کی عجیب و غریب عادت نے مجھے خواہ مخواہ الجھن میں مبتلا کر دیا۔

پچھلے مہینے میں نے بچوں کی نفسیات کے بارے میں کچھ کتابیں خریدی تھیں۔ ان سے استفادہ کیا۔ کئی کتابوں کے مطالعے کے بعد مشہور ماہر نفسیات کارل ژنگ کی کتاب "بچوں کی انوکھی عادتیں" کارآمد نظر آئی۔ اس میں بچوں کی بعض حیرت انگیز عادتوں کا ذکر ہے۔ مثلاً ایک بچے کی یہ عادت تھی کہ رات کو جب تک مرغ کی بانگ نہیں سن لیتا اس وقت تک اسے نیند نہ آتی' دوسرے کو لکڑی کترنے کا عارضہ تھا۔ اس نے گھر کا سارا فرنیچر کتر کتر کر ستیاناس کر دیا تھا۔ اسی طرح ایک اور بچے کی عادت تھی کہ چراغ جلے اس پر اچانک غنودگی طاری ہو جاتی تھی۔ جب تک ریڑھ کی ہڈی پر ہلکی سی ضرب نہ لگتی اس کی غنودگی ختم نہ ہوتی۔ غرض کہ بچوں کی ایسی ہی اور بھی طرح طرح کی عادات اور اطوار کا کتاب میں ذکر تھا۔ ان کا علاج معالجہ بھی تجویز کیا گیا تھا۔

مگر ٹوٹو نے جو انوکھی عادت اختیار کی تھی' کارل ژنگ کی تصنیف میں اس کا کوئی تذکرہ نہ تھا۔ البتہ کارل ژنگ نے یہ ضرور بتایا تھا کہ بچوں میں اور بھی ایسی انوکھی اور دلچسپ عادتیں پائی جاتی ہیں جن کا ہنوز تجزیہ نہیں کیا جا سکا۔ اس کا خیال ہے کہ بچوں میں ایسی عجیب و غریب عادتیں اس لیے پیدا ہو جاتی ہیں کہ ان کے دماغ کے بعض رگیں ضرورت سے زیادہ حساس ہوتی ہیں۔ اس کا علاج اس نے یہ بتایا تھا کہ رات کو سونے سے قبل روغن زیتون میں شورہ ملا کر بچے کے تمام جسم کی مالش کی جائے تو افاقہ ہو جاتا ہے۔

میں نے کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد سوچا کارل ژنگ نے تو بہت مہنگا نسخہ تجویز کیا۔ اس لیے کہ چند برس پہلے جب میرے سر کے بال پت جھڑ کی مانند تیزی سے گرنے لگے تھے تو کسی نے روغن زیتون استعمال کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ اس وقت روغن زیتون کی ایک شیشی کی قیمت نو روپے تھے۔ اب ستائیس نہیں تو کم از کم بیس بائیس روپے تو ضرور ہو گی۔

اس ادھیڑ بن میں بیٹھا تھا کہ بیوی نے قریب آ کر پوچھا۔ "کس سوچ میں بیٹھے ہیں؟" اس کے لہجے میں تشویش تھی۔

"سوچ رہا تھا یہ اپنا ٹوٹو روزانہ شام کو جس طرح میلے اور گندے کپڑوں میں جا کر سو جاتا ہے یہ تو بڑی بری عادت ہے۔" میں نے اپنی ذہنی پریشانی کا اظہار کیا۔

لیکن میری پریشانی سمجھنے اور اس پر ہمدردی سے غور کرنے کے بجائے وہ بگڑ کر بولی۔ ''آپ نے مکان ہی ایسی خراب جگہ لیا ہے۔ دن بھر تو گلی کے گندے بچوں کے ساتھ کھیلتا ہے۔ اب اس کی عادت گندے اور میلے کپڑوں میں سونے کی نہ پڑے گی تو کیا صاف ستھرے بستر پر نیند آئے گی۔ جیسا ماحول ہو گا ویسی ہی بچے کی اٹھان ہو گی۔''

بات تو اس نے بڑے پتے کی کہی۔ مگر اس نیک بخت کو یہ نہیں معلوم کہ اب وہ زمانہ تو گیا جب کہیں رہائش اختیار کرتے وقت اور سہولتوں کے ساتھ یہ بھی دیکھا جاتا تھا کہ پاس پڑوس کیسا ہے۔ اس وقت تو گھوڑے اصطبل میں اور انسان مکانوں میں رہتے تھے۔ اب تو انسان اور گھوڑے ایک ساتھ باندھے جاتے ہیں۔ جسے سر چھپانے کی جہاں جگہ مل جاتی ہے وہیں ڈیرا ڈال دیتا ہے۔ اگر مگر کے پھیر میں پڑا تو گیا کام سے۔

ایسی باتیں میں اکثر سوچتا ہوں' لیکن بیوی سے کبھی ان کا اظہار نہیں کرتا۔ حالانکہ اسے ''نورنامہ'' اور ''دعائے گنج عرش'' منہ زبانی یاد ہیں۔ ''بہشتی زیور'' اور میلاد شریف کی کتابیں وہ فرفر پڑھ لیتی ہے اور قرآن شریف کا ناظرہ چھٹ پن ہی میں ختم کر لیا تھا۔ سنا ہے آمین' جسے عرف عام میں نشرہ کہتے ہیں' بہت دھوم دھام سے منائی گئی تھی۔ مگر یہ ساری تعلیم اس نے گھر کی چار دیواری کے اندر ایک نابینا حافظ جی اور بوڑھی استانی سے حاصل کی تھی۔ کبھی اسکول نہیں گئی۔ ماں باپ نے اس ڈر سے نہ بھیجا کہ زیادہ پڑھ لکھ کر محلے کے عاشق مزاج لونڈوں سے آنکھیں لڑانے کے ساتھ ساتھ پرچہ بازی نہ کرنے لگے۔ ان کے ناموس پر حرف آئے اور رسوائی کا باعث بنے۔

میں چونکہ اخبار کا پابندی سے مطالعہ کرتا ہوں اور انگریزی رسائل اور جرائد بھی پڑھتا ہوں لہٰذا زندگی برتنے اور سمجھنے کے معاملے میں خاصا روشن خیال واقع ہوا ہوں۔ لیکن آپ اس مغالطے میں ہرگز مبتلا نہ ہوں کہ میں یہ رسائل اور جرائد مقررہ قیمت ادا کر کے خریدتا ہوں۔ بات صرف اتنی ہے کہ مہینے کی آخری تاریخوں میں جب جیب میں اتنی رقم بھی نہیں ہوتی کہ کسی اچھے ریستوران میں بیٹھ کر یار دوستوں کے ساتھ شام گزاری جائے یا مار دھاڑ سے بھرپور ہالی وڈ کی نئی فلم دیکھی جائے تو اس کڑکی کے عالم میں کسی کباڑیے سے نہایت سستے داموں پر راتوں کی نیند حرام کر دینے والا انگریزی کا کوئی ناول یا ''نیوز ویک'' ''ٹائم'' ''پوسٹ'' ''لائف'' اور اسی قبیل کے دوسرے جرائد کے پرانے شمارے خرید لیتا ہوں۔ ان میں ایک آدھ سنسنی خیز کہانی' کوئی حیرت انگیز فیچر' کچھ چھڑک دار اسکینڈل' کچھ پلنگ توڑ تصاویر' غرض یہ کہ اتنا چٹ پٹا مسالہ ہوتا ہے کہ رات کو سونے سے قبل وہ لمحات' جو کبھی کبھی دوبھر ہو جاتے ہیں' مزے سے کٹ جاتے ہیں۔ ان جرائد کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ انگریزی کی استعداد بڑھتی ہے جو

میرے ایسے ملازم پیشہ آدمی کے لیے ترقی کا پاسپورٹ ہے۔

مجھے خاموش دیکھ کر بیوی نے تنک کر کہا۔ "آپ الٹی سیدھی باتیں سوچ سوچ کر خواہ مخواہ میں اپنا دماغ خراب کرتے ہیں۔ میرا کہا مانیں تو فوراً ٹوٹو کو اسکول میں داخل کر دیجئے۔ ماشاء اللہ اب وہ پانچویں برس میں لگ گیا ہے۔ اسکول جانے لگے گا تو دن بھر کھیل کود کے بہانے جو آوارہ گردی کرتا ہے' سب ختم ہو جائے گی۔" اس نے ایک ہی سانس میں تمام باتیں کہہ ڈالیں۔

میں نے بھی بلا عذر اس کی بات مان لی۔ مسکرا کر کہا۔ "اب یہی کروں گا۔"

"یہی کروں گا نہیں' کل ہی جا کر اسکول میں بٹھا دیجئے۔" وہ اسی تیکھے لہجے میں بولی۔ "وہ آپ کے غزنوی صاحب نہ جانے کب دورے سے واپس آئیں گے۔ ایسا نہ ہو کہ کسی اسکول میں جگہ بھی نہ رہے۔"

میں نے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ "غزنوی صاحب کسی لمبے دورے پر نہیں گئے ہیں' جلد ہی لوٹ آئیں گے۔"

مگر وہ اپنی بات پر اڑی رہی۔ "ذرا سوچئے تو کب غزنوی صاحب آئیں گے۔ کب وہ سفارش کریں گے۔ کب بچہ اسکول میں پڑھنے بیٹھے گا۔ پھر سو باتوں کی ایک بات تو یہ ہے کہ آپ جو دو دو انگریزی اسکولوں میں پڑھاتے ہیں' ان میں سے کسی ایک میں داخل کرانے میں کیا حرج ہے۔ یہ تو سب سے اچھا ہے کہ بچہ ہر وقت اپنی آنکھوں کے سامنے رہے۔"

بیوی نے ٹھیک ہے کہا۔ میں بیک وقت دو اسکولوں میں پڑھاتا ہوں اور دونوں ہی انگلش میڈیم اسکول ہیں۔ مگر میں اپنے بچے کو ان اسکولوں میں تعلیم دلانا نہیں چاہتا اور اس کا سبب بیوی کو بھی بتانا نہیں چاہتا۔ اس وقت بھی میں نے اسے کسی نہ کسی طرح ٹال دیا اور صاف بات گول کر گیا۔

میں جس اسکول میں پڑھاتا ہوں' اس کا نام "گرین وڈ مونٹیسوری اسکول" ہے۔ مگر نہ یہاں ہریالی ہے نہ جنگل میں منگل منانے کا سماں ہے۔ یہ کبھی روئی کی گانٹھیں رکھنے کا گودام تھا۔ ہمارے پرنسپل صاحب بھی کسی زمانے میں روئی کے آڑھتی تھے۔ خدا برا کرے سٹے بازی کا کہ ان کا تمام کاروبار ایسا چوپٹ ہوا کہ گودام پر جھاڑو پھر گئی۔ اس عبرت ناک حادثے نے ان کے دل میں ایسا خوف پیدا کیا کہ سر میں خدمت خلق کا سودا سمایا۔

اس خدمت خلق کے جذبے سے سرشار ہو کر انہوں نے اپنے گودام میں نئی نسل کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنے کے لیے اسکول کھول دیا۔ اسکول کے کیبن نما چھوٹے چھوٹے کمروں میں سویرے ہی سویرے لگ بھگ تین سو بچے ٹھونس دیے جاتے ہیں۔ تمام

دن بجلی کے مدھم بلب روشن رہتے ہیں اور اکثر موسم سرما میں پنکھا چلانے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اسکول کی سب سے دلچسپ شخصیت پرنسپل صاحب ہیں جو مالک ہیں اور منتظم اعلیٰ بھی۔ حالانکہ وہ غلط انگریزی بولتے ہیں' نہایت دھڑلے سے بولتے ہیں اور مونٹیسوری کے ہجے ہمیشہ غلط لکھتے ہیں۔ مگران کا دعویٰ ہے کہ اگر وہ بچوں کو پڑھانا شروع کر دیں تو دور دور تک کوئی اسکول باقی نہیں رہے گا۔ جگہ چونکہ کم ہے لہٰذا وہ زیادہ بچے اسکول داخل نہیں کرنا چاہتے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے درس وتدریس کی جانب ابھی تک سنجیدگی سے توجہ نہیں دی۔

البتہ وہ ہفتے میں ایک دو بار ماسٹروں کو سبق ضرور دیتے ہیں۔ طلباء کے سامنے ہی وہ اکثر غیظ وغضب کے عالم میں اس طرح گرجتے برستے ہیں کہ کبھی کبھی تو یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ بے چارے کلاس ٹیچر کو چیڑ کے بکسوں کی لکڑی سے بنی ہوئی کسی میز پر مرغا بنا کر بٹھا دیں گے۔ یہ ڈانٹ ڈپٹ وہ اس لیے روا رکھتے ہیں کہ ملازمین کو ہمیشہ تنبیہ کرتے رہنا چاہیے' خواہ اسکول کے اساتذہ ہی کیوں نہ ہوں۔

پرنسپل صاحب کے اس سخت گیر رویے کا نتیجہ یہ ہے کہ طلباء نہایت ڈھٹائی سے اساتذہ کے ساتھ ٹھٹول کرتے ہیں۔ چنانچہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ عین اس وقت جب کوئی استاد کسی طالب علم کو اس کی نازیبا حرکت پر فہمائش کرنے میں مصروف ہوتا ہے' اچانک کلاس روم کے کسی گوشے سے آواز بلند ہوتی ہے۔ ''پرنسپل صاحب آ رہے ہیں۔'' یہ سنتے ہی استاد کی سٹی گم ہو جاتی ہے۔ وہ پریشان ہو کر دروازے کی جانب دیکھتا ہے۔ تمام طلباء ٹھٹھا مار کر زور زور سے ہنستے ہیں۔

سو روپے ماہوار کی مستقل آمدنی اور عزت دار کہلوانے کا ارمان نہ ہوتا تو اس اسکول میں پڑھانے سے کہیں بہتر تھا کہ میں کباب پراٹھے کی دکان کھول لیتا۔ بیمار اور مردہ مویشیوں کے گوشت کے ساتھ چھیچھڑے ملا کر قیمہ بناتا۔ طرح طرح کے تیز مسالے ڈالتا اور ٹھاٹھ سے چٹ پٹے کباب بیچتا اور اپنی مہینہ بھر کی تنخواہ چند روز میں کھری کر لیتا۔ ویسے اللہ توفیق دے تو اسکول قائم کرنے کا دھندا بھی برا نہیں۔ اس میں فائدہ ہے۔ عزت بھی ہے اور کمائی بھی تگڑی ہے۔

پرنسپل صاحب نے سٹے بازی میں جتنا لٹایا' اسے مع سود بلکہ سود در سود وصول کر چکے ہیں۔ عالیشان بنگلے میں رہتے ہیں اور کار میں اڑے اڑے پھرتے ہیں۔ مگر اسکول کھولنے کے لیے گانٹھ میں رقم ہونا بنیادی شرط ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے' پیسہ پیسے کو کماتا ہے اور وہی اپنے پاس نہیں۔ ساتھ ہی کاروباری ذہنیت رکھنا بھی ضروری ہے۔ یہ پیداگیری کا فن ہے' جو اللہ کسی کسی کو ودیعت کرتا ہے۔ یہ ہر کس وناکس کے بس کی بات نہیں۔ میں اس صلاحیت سے قطعی محروم ہوں۔ جب ہی تو گریجویٹ ہونے کے باوجود آئے دن پرنسپل

صاحب کی ڈانٹ ڈپٹ سنتا ہوں اور اف نہیں کرتا۔

دوسرا اسکول جس میں دوپہر کے بعد پڑھاتا ہوں' شہر کے ایک گنجان بازار میں واقع ہے۔ یہاں رات گئے تک شور وغل رہتا ہے۔ اسکول ایک ایسی دومنزلہ عمارت کے نچلے حصے میں قائم ہے جس کے ایک گوشے میں دن چڑھے تک قصائی کی دکان بھی لگتی ہے۔ اس وقت صدر دروازے پر ایک بورڈ آویزاں ہوتا ہے جس پر یہ عبارت درج ہے۔ ''یہاں بڑا گوشت فروخت ہوتا ہے۔'' دس بارہ بجے تک دکان چلتی ہے۔ پھر قصائی' گوشت کاٹنے کی چھری' قیمہ بنانے کا بغدا اور دوسرا ساز و سامان ایک کوٹھڑی میں رکھ دیتا ہے۔ عمدہ اور چکنا گوشت اپنے کھانے کے لیے پوٹلی میں باندھ کر چلا جاتا ہے۔

قصائی کی دکانداری ختم ہونے کے بعد صفائی ہوتی ہے۔ کتوں کو دھتکار کر بھگایا جاتا ہے اور دروازے پر لٹکا ہوا بورڈ پلٹ دیا جاتا ہے۔ اب اس پر انگریزی کے موٹے موٹے حروف میں 'ہیپی پیراڈائز اسکول'' لکھا ہوا نظر آتا ہے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ اسکول لگا ہے۔ کلاسوں میں پڑھائی ہو رہی ہے۔ ناگہاں ہوا کے تیز جھکڑ سے بورڈ پلٹ گیا۔ ہر چند کہ ایسا کم ہی ہوتا ہے مگر جب ایسا ہوتا ہے تو یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ کوئی گھبرایا ہوا شخص کلاس روم کے اندر ہکا بکا کھڑا ہے اور ادھر ادھر نظریں دوڑا کر یہ دیکھ رہا ہے' گوشت کہاں فروخت ہوتا ہے۔

سنا ہے رات کو اسکول کی عمارت قمار بازوں کا اڈہ بن جاتی ہے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ اس وقت بھی 'ہیپی پیراڈائز اسکول'' کا بورڈ دروازے پر آویزاں ہوتا ہے۔ اس اسکول کے مالک' جن کا پرنسپل ہونا لازمی شرط ہے' ذات کے قصائی نہیں ہیں۔ مگر اساتذہ کی کھال ادھیڑنے کے معاملے میں کسی قصائی سے کم ماہر نہیں۔

وہ مجھے ڈیڑھ سو روپے ماہانہ دیتے ہیں۔ مگر تنخواہ کے رجسٹر میں پورے چار سو درج کرتے ہیں اور رسیدی ٹکٹ لگا کر باقاعدہ دستخط بھی کراتے ہیں۔ موسم گرما کی دو مہینے کی تعطیل شروع ہوتے ہی دوسرے اساتذہ کی طرح میری ملازمت بھی ختم کر دی جاتی ہے۔ حالانکہ وہ تمام طلباء سے تعطیل کی پوری مدت کی پیشگی فیس وصول کرتے ہیں۔

اسکول جب دوبارہ کھلتا ہے تو ہر ٹیچر کی ملازمت بھی از سرِ نو شروع ہوتی ہے۔ نہ وہ کبھی تقرری کا پروانہ دیتے ہیں نہ ہی مہنگائی الاؤنس' ترقی بھی نہیں دیتے۔ گریڈ بھی نہیں بڑھاتے۔ مگر ہر سال طلباء کی فیس بڑھا دیتے ہیں۔ لہٰذا ان کی خوشحالی کا یہ عالم ہے کہ بڑا بیٹا میڈیکل کالج سے ایم بی بی ایس کرنے کے بعد لندن میں ایف آر سی ایس کر رہا ہے۔ دوسرا انجینئرنگ کے آخری سال میں ہے لیکن امریکہ کی مشہور درسگاہ ایم آئی ٹی میں داخلہ دلانے کے لیے انہوں نے ابھی سے بھاگ دوڑ شروع کر دی ہے۔ ویسے ان کی تمام

ہی اولادیں اعلیٰ ترین تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔ دراں حالانکہ وہ خود میٹرک ہیں۔ سنا ہے میٹرک کا سرٹیفکیٹ بھی جعلی ہے۔

یہ بات اس حیثیت سے درست معلوم ہوتی ہے کہ جب وہ میرٹھ میں تھے تو ثقہ راویوں کے بیان کے مطابق چونگی کے محکمے میں چپراسی تھے۔ اس وقت ان کا نام منور خان تھا۔ مہاجر بن کر کراچی پہنچے تو سید انور علی ہو گئے اور محکمۂ آبکاری میں لوئر ڈویژن کلرک بھرتی ہو گئے۔ رشوت خوری کے الزام میں ملازمت سے نکالے گئے تو اتنا کما چکے تھے کہ لارنس روڈ پر کرائے کی دکان کھول لی۔ مگر اس میں منافع کی شرح کم تھی اور کریانہ مرچنٹ کہلانے میں وہ سبکی محسوس کرتے تھے لہٰذا اسکول کھولا۔

یہ کاروبار ایسا راس آیا کہ دن دونی رات چوگنی ترقی ہوئی۔ نہایت ٹھاٹھ باٹ سے رہتے۔ حکومت میں بھی اوپر تک اثر و رسوخ حاصل تھا۔ ہر سال اسکول کی جانب سے سالانہ تقریب منعقد کرتے اور ہمیشہ کسی وزیر یا بہت بڑے افسر کی بیگم کو مہمان خصوصی بناتے۔ ایسی تقریبات میں جو سپاسنامہ پیش کرتے اسے لکھنے کا فرض بھی عام طور پر اس خاکسار کو انجام دینا پڑتا۔ سپاسنامہ پڑھتے وقت وہ بار بار اٹکنے کے ساتھ ساتھ بعض الفاظ اور اصطلاحات کا تلفظ کند چھری سے اس بے دردی کے ساتھ ذبح کرتے کہ تمام اساتذہ کے سر ندامت سے جھک جاتے۔

ایسی صورت میں آپ ہی بتایئے میں اپنے بچے کو کس طرح ان دونوں اسکولوں میں تعلیم دلوا سکتا تھا۔ دیکھتی آنکھوں تو مکھی نہیں نگلی جاتی۔ پھر ٹوٹو تو میرا پہلوٹی کا بچہ ہے۔ اس کے بارے میں تو یوں بھی بہت حساس ہوں۔ معاف کیجئے۔ میں نے اب تک یہ نہیں بتایا کہ ٹوٹو کا اصل نام محمد علی ہے۔ ویسے انگریزی رسالے ''لک'' میں ایک خوبصورت ہسپانوی بچے کی تصویر دیکھ کر ایک عرصہ تک میں اسے لازیرو کہتا رہا۔

آپ کہیں گے اپنی اولاد اور عقل کے بارے میں ہر شخص کو مغالطہ ہوتا ہے۔ مشکل یہ ہے کہ آپ میری آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتے جو ٹوٹو میں مستقبل کے ایک بڑے آدمی کی علامتیں دیکھ رہی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ ہم میاں بیوی اس بات پر تلے ہوئے تھے کہ ٹوٹو کو اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم دلوائیں گے۔ اس سلسلے میں ہمارے درمیان سخت بحث بھی ہوتی۔ بیوی کہتی کہ وہ ٹوٹو کو ڈاکٹر بنائے گی اور اپنی بات کی تائید میں کہتی۔ ''ڈاکٹروں کی آمدنی آپ کیا جانیں۔ کسی روز ڈاکٹر کریمی کے مطب میں جا کر دیکھئے۔ خدا کی قسم نوٹوں کے ڈھیر لگے ہوتے ہیں۔'' میں مخالفت کرتا تو وہ اپنی رائے اس شرط پر بدلنے کے لیے آمادہ ہو جاتی۔

''اچھا تو پھر اسے انجینئرنگ ہی پڑھوا دیجئے۔ خالو فیاض کے پڑوس میں ایک انجینئر رہتا ہے۔ تنخواہ تو ہزار بارہ سو ہوگی مگر اوپر کی آمدنی اس قدر ہے کہ ایک چھوڑ دو دو تو موٹریں ہیں۔ جس شہر میں تبادلہ ہوتا ہے سال بھر کے اندر وہاں اس کی کوٹھی بن کر تیار ہو جاتی

ہے۔ انجینئری میں بھی کم ٹھاٹھ نہیں۔ مگر میں تو یہی کہوں گی کہ ٹوٹو کو تو ڈاکٹر ہی بنایا جائے۔ آئے دن تو میں بیمار رہتی ہوں' وہ ڈاکٹر بن گیا تو میرے ہر مرض کا علاج ہو جائے گا۔ نہ اسپتال جانے کی ضرورت پڑے گی نہ ڈاکٹروں کو لمبی لمبی فیس دینی پڑے گی۔"

آخر طویل بحث و مباحثہ کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ ایک بچے کو ڈاکٹر' دوسرے کو انجینئر اور سب سے چھوٹے کو پروفیسر بنایا جائے۔ بیوی کو پروفیسری سے کوئی دلچسپی نہیں۔ یہ میری تمنا تھی اور اس تمنا کے پس منظر میں یہ جذبہ کارفرما تھا کہ میں تعلیم کے میدان میں مارکھا گیا۔ پھٹیچر اسکولوں کا پھٹیچر ٹیچر ہی رہا' پروفیسر نہ بن سکا۔ اپنے بیٹے کو پروفیسر بنا کر میں اپنی کچلی ہوئی خواہشات پوری ہوتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

بیوی نے مجھے چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی پہلا سوال ٹوٹو کے داخلے کے بارے میں ہوتا۔ کوئی حیلہ بہانا کارگر نہ ہوا۔ اس کی بات مجھے ماننی ہی پڑی۔ رات کو منصوبہ بنا۔ صبح ہوئی تو بیوی سر پر کھڑی تھی۔ زور زور سے جھنجھوڑ رہی تھی۔ میں آنکھیں ملتا ہوا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ دیکھا ٹوٹو میاں نہائے دھوئے' آڑی مانگ نکالے' نئی پتلون اور جیکٹ ڈاٹے اسکول جانے کے لیے چاق و چوبند کھڑے ہیں۔ دل باغ باغ ہو گیا۔ خود میں نے بھی اسی اہتمام سے تیاری کی۔ جب میں ٹوٹو کے ہمراہ گھر سے روانہ ہوا تو اس کی ماں کی خاموشی کا عالم نہ پوچھیے۔ بات بات پر باچھیں کھلی جاتی تھیں۔

راستہ میں ایک بار خیال بھی آیا کہ غزنوی صاحب دورے سے واپس آجاتے تو اچھا تھا۔ وہ بارسوخ آدمی ہیں' ان کی کوشش سے کونونٹ میں داخلہ ملنا آسان ہو جاتا۔ مگر یہ سوچ کر دل مضبوط کیا کہ آخر میں بھی تو اسکول ٹیچر ہوں۔ کچھ نہ کچھ تو پیشے کا لحاظ رکھا ہی جائے گا۔

سینٹ پیٹر اسکول کا راستہ میرے گھر سے بس کے ذریعے مشکل سے پندرہ منٹ کا ہوگا۔ میں جس وقت وہاں پہنچا' اسکول لگ چکا تھا۔ پھاٹک کے اندر داخل ہوا تو آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ سامنے وسیع میدان تھا۔ اس کے تین طرف اسکول کی دو منزلہ عمارت تھی' میدان کے ایک حصے میں خوشنما باغیچہ تھا۔ اس میں چھوٹے بچوں کے لیے جھولوں کے علاوہ کھیل کود کے طرح طرح کے لوازمات تھے۔

صاف ستھرا ماحول تھا۔ ضرورت کی ہر چیز قاعدے قرینے سے اپنی جگہ موجود تھی۔

پرنسپل کے دفتر کے سامنے پہنچا۔ چپراسی کی زبانی معلوم ہوا کہ وہ اپنے کمرے میں بیٹھے ہیں۔ میں نے چپراسی سے کاغذ کی چٹ

لی۔سوچا اس وقت اپنے نام سے فائدہ اٹھایا جائے چنانچہ سید محمد باقر کے بجائے ایس اے بیکر' ٹیچر ''گرین ووڈ اسکول'' لکھ کر چٹ اندر بھیجی۔تیر نشانے پر بیٹھا۔ذرا ہی دیر بعد پرنسپل نے اندر بلایا۔وہ ادھیڑ عمر کا انگریزی پادری تھا۔خوبصورت بھوری ڈاڑھی' سفید براق لباس' آنکھوں پر سنہرے فریم کا چشمہ' سینے پر لٹکتی ہوئی چمکتی دمکتی صلیب' بڑا پروقار آدمی تھا۔
وہ خندہ پیشانی سے ملا۔بیٹھنے کو کرسی پیش کی۔مسکرا کر انگریزی میں پوچھا۔''میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟'' اس کا لہجہ نرم اور شگفتہ تھا۔

''اس بچے کو آپ کے اسکول میں داخل کروانا چاہتا ہوں۔'' میں نے قریب کھڑے ہوئے ٹوٹو کی جانب اشارہ کیا۔

پرنسپل کے چہرے پر سنجیدگی چھا گئی۔''میرا خیال ہے غالباً آپ نے دروازے کے باہر لگا ہوا بورڈ نہیں دیکھا۔''

مجھے یاد آیا کہ دروازے پر ایک بورڈ آویزاں تھا جس پر یہ عبارت درج تھی۔''تمام کلاسوں میں داخلہ بند ہو چکا ہے۔'' لیکن پرنسپل سے ملاقات کرنے سے قبل میں نے اس بورڈ کی اہمیت جس طرح نظر انداز کی تھی اسی طرح اس کی بات سن کر بھی مسکرایا اور لہجے میں اعتماد پیدا کرتے ہوئے گویا ہوا۔

''بورڈ تو میں نے دیکھا ہے۔لیکن گرین ووڈ اسکول میں۔۔۔۔۔۔۔''

اس نے میری پوری بات بھی نہ سنی' ترش روئی سے بولا۔''یہ بورڈ دروازے پر صرف اس لیے لگایا گیا ہے تاکہ لوگ نہ اپنا وقت برباد کریں نہ میرا۔''

میں نے ڈھٹائی اختیار کرنے کی کوشش کی۔بولنے کے لیے منہ کھولا۔مگر اس بندہ خدا نے کچھ کہنے کا موقع نہ دیا۔اس کے ہونٹوں سے شگفتگی غائب ہو چکی تھی۔چہرے پر جھنجلاہٹ سرخی بن کر دوڑنے لگی۔اس نے مجھے تیکھی نظروں سے دیکھا۔میرا رویہ اسے نہایت شاق گزرا تھا۔فوراً چپراسی کو بلانے کے لیے زور سے گھنٹی بجائی۔میں گھبرا کر جھٹ کھڑا ہو گیا۔خدشہ پیدا ہوا کہ کہیں چپراسی کو بلا کر کمرے سے باہر نہ نکلوا دے۔سراسیمگی کے عالم میں پرنسپل سے ہاتھ بھی نہ ملا سکا۔معذرت بھی نہ کی۔مڑا اور دروازے کی جانب بڑھا۔اسی وقت چپراسی بھی اندر داخل ہوا۔اس زور سے چپراسی سے ٹکرایا کہ آنکھوں تلے اندھیرا آ گیا۔

اسکول کے پھاٹک سے باہر نکلا تو اس قدر کوفت تھی کہ دل بیٹھا جاتا تھا۔ٹوٹو ساتھ ساتھ تھا۔وہ بھی حیران و پریشان نظر آتا تھا۔نہ اس نے بات کی نہ میں نے۔چپ چاپ گھر کی جانب چلا۔مگر یہ فکر دامن گیر تھی کہ بیوی کے سامنے کیا عذر پیش کیا جائے۔

خدا خدا کرکے راستہ کٹا۔گھر میں داخل ہوا۔بیوی بے چینی سے منتظر تھی۔میں نے پہلے سے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت صاف

جھوٹ بولا۔ ''ایک ہفتہ بلایا ہے۔''

اس نے شاید میری پریشانی کو تاڑ لیا۔ جھٹ اپنے شبے کا اظہار کیا۔ ''صرف بلایا ہی بلایا ہے' داخل بھی ملے گا کہ نہیں؟''

میں نے مسکرانے کی کوشش کی۔ بیوی کو باور کرایا۔ ''داخلہ کیوں نہیں ملے گا۔ آخر بلایا کس لیے ہے؟''

بات آئی گئی ہوگئی۔ اسی پریشانی میں ڈوبا ہوا اسکول پہنچا۔ دوسرے اساتذہ سے تذکرہ کیا۔ کسی نے مشورہ دیا کہ ڈائریکٹر تعلیمات کے دفتر میں کسی سے جان پہچان پیدا کرو۔ کسی نے بعض بڑے افسروں کا نام لیا۔ ان سے ملنے پر زور دیا۔ کسی نے سیاسی لیڈروں کے ذریعے سفارش پہنچانے کا نسخہ بتایا۔ سب نے ایسے افراد کا ذکر کیا جن کے پاس پہنچنے کے لیے علیحدہ رسائی پیدا کرنے کی ضرورت تھی اور وہ میرے بس میں نہ تھی۔

اسی پریشانی میں غلطاں و پیچاں تھا کہ ایک روز والد مرحوم کے پرانے شناسا محمد نواز مل گئے۔ وہ فوج میں صوبیدار میجر رہ چکے تھے۔ اب پنشن لیتے تھے۔ دیکھتے ہی ہمدردی سے بولے۔ ''کچھ پریشان نظر آ رہے ہو۔ برخوردار بات کیا ہے؟'' میں نے حال دل بیان کیا۔ اپنی الجھن بتائی۔

وہ بے نیازی سے بولے۔ ''تم اس عیسائیوں والے اسکول کا ذکر تو نہیں کر رہے' جو صدر میں ہے؟''

میں نے جواب دیا۔ ''جی ہاں اسی اسکول میں بچے کو داخل کرانے کا خواہشمند ہوں۔''

نہایت اطمینان سے گویا ہوئے۔ ''وہاں تو کام بن سکتا ہے۔ ابھی چلو۔ نیک کام میں تاخیر نہیں کرنی چاہیے۔''

میں گھبرا گیا۔ ان سے تو بات کر کے مصیبت مول لے لی۔ وہ تو بیچ سر ہو گئے۔ اصرار کر کے اسی وقت مجھے اپنے گھر لے گئے۔ فوجی وردی پہنی۔ سینے پر خدا معلوم کتنی قسم کے فیتے اور تمغے سجائے۔ سرٹیفکیٹوں کا پلندہ سنبھالا۔ میرے گھر کی جانب چلے۔ میں ساتھ ساتھ تھا۔ سوچ رہا تھا کہ کس طرح ان سے پیچھا چھڑاؤں۔ وہ سینہ تانے گردن اٹھائے' نہایت آن بان سے چل رہے تھے اور بہت مطمئن نظر آ رہے تھے۔

ہم دونوں گھر پہنچے۔ انکار کی گنجائش نہ تھی۔ ٹوٹو کو ساتھ لیا اور سینٹ پیٹر اسکول پہنچ گئے۔ مجھے پرنسپل کے روبرو جاتے ہوئے ہچکچاہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ مگر صوبیدار میجر محمد نواز بضد تھے کہ میں بھی اندر چلوں۔ چپراسی نے چٹ بڑھائی۔ انہوں نے اس کا ہاتھ ایک طرف جھٹک دیا۔ دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گئے۔ میں بھی ان کے پیچھے پیچھے چلا۔ ٹوٹو بھی ہمراہ تھا۔ صوبیدار صاحب نے

کھٹاک سے جوتوں کی دونوں ایڑیاں جوڑیں۔ ایک ہاتھ اٹھا کر خالص فوجی انداز سے سیلوٹ مارا۔ پرنسپل نے کھڑے ہو کر ہاتھ ملایا۔ کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ مگر صوبیدار صاحب بدستور کھڑے رہے۔ انہوں نے ٹوٹو کی جانب دیکھا۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر سامنے کیا۔ بلا کسی تمہید کے مدعا بیان کیا۔ ''صاحب! اس بچے کو آپ کی سپردگی میں دینے لایا ہوں۔''

صوبیدار صاحب تمغوں سے سجا ہوا سینہ اٹھائے اٹینشن کھڑے تھے۔ میں ان کی آڑ میں اس طرح سکڑا سکڑایا کھڑا تھا کہ پرنسپل کی نظر نہ پڑے اور مجھے ایک بار پھر خفت اٹھانا نہ پڑے۔ میں گومگو کے عالم میں تھا۔ سوچ رہا تھا' دیکھئے پردۂ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے۔

پرنسپل گم صم کھڑا تھا۔ گردن جھکائے کسی گہری فکر میں غرق تھا۔ صوبیدار صاحب نے اسے خاموش دیکھا تو زیادہ دیر ضبط نہ کر سکے۔ کڑک کر بولے۔ ''صاحب' ہم نے زندگی بھر ہز مجیسٹی گورنمنٹ کی خدمت کی ہے۔ اس کے ہمیشہ وفادار رہے۔ سرکار کے حکم پر قربانی دی۔ سر ہتھیلی پر رکھ کر لڑائیاں لڑی ہیں۔'' انہوں نے سینے پر سجے ہوئے چمکتے دمکتے تمغوں کی جانب انگلی سے اشارہ کیا۔ ''یہ بہادری پر ملے ہیں۔''

''ٹیک اٹ' ٹیک اٹ'' پرنسپل نے آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔

صوبیدار صاحب نے اسی جوش و خروش سے کہا۔ ''پچھلی جنگ عظیم میں میرے دو بھائی برما میں بہادری سے لڑتے ہوئے مارے گئے۔'' انہوں نے سرٹیفکیٹوں کا پلندہ پرنسپل کے سامنے ڈال دیا۔ ''یہ سرٹیفکیٹ دیکھئے' میں نے بھی ہز مجیسٹی گورنمنٹ کے لیے جاپانیوں کے خلاف جنگ کی۔ زخمی بھی ہوا۔''

پرنسپل مسکرا کر بولا۔ ''ول' ول' صوبیدار' تم گھبراؤ نہیں۔ ہم تمہارے بچے کے لیے ضرور کچھ کرے گا۔''

''صاحب' اسے تو آج ہی داخلہ ملنا چاہیے اور ابھی ملنا چاہیے۔'' صوبیدار صاحب اڑ گئے۔ انہوں نے پتلون چڑھائی' گھٹنے کے پاس زخم کا نشان دکھایا۔ ''دیکھئے یہ گولی کے زخم کا نشان ہے جو تریپولی کے محاذ پر ترک فوجوں سے لڑتے ہوئے لگی تھی۔ یہ پہلی جنگ عظیم کی بات ہے۔ میں اس قدر زخمی ہوا تھا کہ دو مہینے اسپتال میں رہا۔ میری رجمنٹ کی کمان کیپٹن اکبر خان کر رہے تھے جو بعد میں نواب سر اکبر خان آف ہوتی کہلائے۔ انہوں نے مجھے بہادری کا سرٹیفکیٹ بھی دیا تھا۔'' صوبیدار صاحب نے اپنے کاغذات کے پلندے کی طرف ہاتھ اٹھایا۔ ''ان سرٹیفکیٹوں میں سب کچھ لکھا ہے۔ انہیں ذرا پڑھ کر تو دیکھئے۔ آپ کو ہماری وفاداری کا بخوبی اندازہ ہو جائے گا۔''

پرنسپل نے سرٹیفکیٹ الٹ پلٹ کر سرسری نظروں سے دیکھے' گردن اٹھائی۔ صوبیدار صاحب کو مخاطب کیا۔ "ول صوبیدار' تمارے بچے کو ضرور ایڈمیشن ملے گا۔"

صوبیدار محمد نواز نے مڑ کر میری جانب داد طلب نظروں سے دیکھا۔ ان کی خضاب لگی مونچھیں اس وقت زیادہ ہی بارعب نظر آ رہی تھیں۔ گردن بھی تنی ہوئی تھی۔ میں ان کی شخصیت سے سخت مرعوب ہوا۔ پرنسپل نے نہ میری طرف توجہ کی نہ اسے یہ یاد آیا کہ میں اس کے پاس پہلے بھی آ چکا ہوں۔ اس نے گھنٹی بجائی۔ کلرک کو بلایا۔ ہدایت جاری کی کہ ٹوٹو کو کے جی یعنی کنڈرگارٹن میں داخل کر لیا جائے۔

میں کلرک کے ہمراہ اس کے دفتر میں گیا۔ اس نے فارم داخلہ دیا۔ میں نے اسے پر کیا۔ مگر جب اس نے فیس بتائی تو میں چکرا گیا۔ تیس روپے ٹیوشن فیس' پچاس روپے ماہانہ بس کا کرایہ' پندرہ روپے فیس داخلہ۔ اس کے علاوہ کھیل کود' یونیفارم اور اسی قسم کے دیگر اخراجات تھے۔ لگ بھگ ڈیڑھ سو روپے کا نسخہ تھا۔ اسی وقت گھر گیا۔ روپے لایا اور اللہ کا نام لے کر ٹوٹو کو اسکول داخل کرا دیا۔

صوبیدار صاحب کی وردی اور تمغوں کے سامنے یہ میرا گریجویٹ ہونا کام آیا نہ ڈبل ٹیچری۔ ٹوٹو کا داخلہ اس قدر آسانی سے ہو گیا کہ میں ششدر رہ گیا۔ کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ وہ اس قدر بااثر اور کام کے آدمی ہیں۔

اب صبح ہی صبح گھر کے سامنے سینٹ پیٹرا اسکول کی بس ہارن بجاتی۔ پڑوسیوں پر بڑا رعب پڑتا۔ ٹوٹو میاں کندھے پر خوبصورت بستہ لٹکائے' جھومتے جھامتے گھر سے نکلتے اور بس میں سوار ہو کر روانہ ہو جاتے۔ ہم دونوں میاں بیوی اسے سکول جاتے دیکھتے تو خوشی سے سیروں خون بڑھ جاتا۔ دروازے سے لگے اسکول کی بس کو جاتے ہوئے دور تک دیکھتے رہتے۔

دوسرا مہینہ شروع ہوا تو یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ ٹوٹو کی تعلیم کے ۸۰ روپے ماہوار یعنی تیس روپے ٹیوشن فیس اور پچاس روپے بس کا کرایہ' گھر کے اخراجات کی کس مد سے نکال کر مہیا کئے جائیں۔ نپی تلی آمدنی تھی۔ جتنی ماہانہ یافت تھی' خرچ اس سے کچھ زیادہ ہی تھا۔ کسی نہ کسی طرح غریبا مئو گزر بسر ہو رہی تھی۔ سفید پوشی کا بھرم قائم تھا۔

بہت سوچ بچار کے بعد بچت کا یہ طریقہ نکالا کہ روزانہ گھر سے اسکول جاتے ہوئے دو کے بجائے ایک روپیہ جیب میں ڈال کر نکلتا۔ صبح بس سے جاتا۔ اس لیے کہ وقت پر اسکول پہنچنا ضروری تھا۔ تاخیر سے پہنچتا تو گرین ووڈ مونٹیسوری اسکول کے پرنسپل آدھے دن کی تنخواہ کاٹ لیتے۔ "ہپی پیراڈائز اسکول" بھی بس ہی سے جاتا۔ وہاں بھی مقررہ وقت پر پہنچنے کی سخت پابندی تھی۔ البتہ واپسی پر

پیدل گھر آتا۔ وقت اپنا تھا' ٹانگیں اپنی تھیں' نہ کسی کا ڈر نہ خوف۔

سگریٹوں کی تعداد بھی کم کردی اور سستے برانڈ کی سگریٹ پینے لگا۔ کرتا بھی کیا۔ ایک روپیہ یومیہ جیب خرچ میں سستی اور گھٹیا ہی سگریٹ پی سکتا تھا۔ صرفہ کرنے کا دوسرا نسخہ یہ آزمایا کہ صبح جو عورت پر برتن دھونے آتی تھی اسے علیحدہ کردیا۔ حالانکہ بیوی نے احتجاج کیا۔ اپنی مجبوری کا رونا رویا' کہنے لگی۔

''میں ٹھنڈے پانی میں ہاتھ ڈالتی ہوں تو چھوٹے بچے کا سینہ جکڑ جاتا ہے۔ نمونیہ ہوجانے کا ڈر رہتا ہے۔ جتنی بچت ہوگی اس سے زیادہ دوا دارو پر خرچ ہوجائے گا۔''

لہٰذا یہ ذمہ داری مجھے اپنے سر لینا پڑی۔ مگر اس کفایت شعاری سے بھی کام نہ چلا۔ نظر کپڑوں کی دھلائی کی طرف گئی۔ طے کیا گیا کہ صرف بڑے کپڑے دھوبی کو دیے جائیں۔ بچوں کے کپڑے گھر ہی پر دھوئے جائیں۔ کچھ اس طرح بچت ہوئی۔ گھی ہر مہینے تین سیر خرچ ہوتا تھا' دو سیر کردیا گیا۔ دودھ سیر بھر کے بجائے تین پاؤ آنے لگا۔ گھر میں سو اور ساٹھ کینڈل پاور کے جتنے بلب لگے تھے سب اتار لئے گئے پچیس اور چالیس کینڈل پاور کے بلب لگادیے گئے۔ اس طرح گھر کا بجٹ از سر نو تیار ہوا اور ٹوٹو کی پڑھائی کے اخراجات پورے کرنے کی سبیل نکلی۔

ٹوٹو میاں روز اجلی یونیفارم پہنے' آڑی مانگ نکالے ٹھاٹھ سے اسکول جاتے۔ میں تاروں کی چھاؤں میں اٹھ کر رات کے جھوٹے برتن صاف کرتا۔ بچوں کے کپڑے دھوتا' مزے سے بگلا مارکہ سگریٹ پیتا اور دوسروں کو تلقین کرتا کہ یہی سگریٹ پیا کرو۔ کم خرچ بالا نشین۔ نہ گلا پکڑتا ہے نہ کش لگاتے وقت ٹھسکا لگتا ہے۔

ایک سال اسی طرح لشتم پشتم گزر گیا۔ نہ پوچھئے اس عرصے میں کیا کیا جتن کرنا پڑے۔ کس کس طرح اپنی خواہشات کا گلا گھونٹ کر ٹوٹو کی تعلیم کے اخراجات پورے کئے۔ ۸۰ روپے تو ہر مہینے بہرحال دینا ہی پڑتے۔ اس کے علاوہ کبھی پکنک کا چندہ جاتا' کبھی میجک شو' کبھی سالانہ تقریب کا' کبھی اس کا کبھی اس کا۔ آئے دن کوئی نہ کوئی چکر چلتا۔ طرح طرح کے مطالبے ہوتے اور ہر مطالبہ پورا بھی کرنا پڑتا۔

دوسرے سال ٹوٹو کا چھوٹا بھائی ٹی ٹی بھی بقول میری بیوی کے پانچویں سال میں لگ گیا' اسے بھی سکول میں داخل کرانے کا سوال سامنے آیا۔ ایک بار پھر صوبیدار صاحب کا دامن پکڑا۔ ان کے ہمراہ سینٹ پیٹرا اسکول کے پرنسپل کے پاس پہنچا۔ صوبیدار صاحب خاکی وردی پہنے' تمغوں سے سینہ سجائے پرنسپل کے کمرے میں داخل ہوئے۔ فوجی بوٹوں کی ایڑیاں ایک دوسرے سے

ملائیں' اٹینشن ہوئے' ایک ہاتھ سے کھٹاک سے سلیوٹ کیا اور کھٹاک سے ٹی ٹی کو بھی داخلہ مل گیا۔ میں نے اسکول سے باہر نکلتے ہی فرط عقیدت سے صوبیدار صاحب کا ہاتھ چوم لیا۔

اب میں سگریٹ کے بجائے چاند تارا مارکہ بیڑی پینے لگا تھا۔ اسکول بھی پیدل جاتا۔ واپس تو سال بھر سے پیدل ہی آتا تھا اور اس کا عادی بھی ہو چکا تھا۔ گوشت ہفتے میں صرف ایک بار آتا۔ دالوں اور سبزیوں پر ہی گزارہ ہوتا۔ بناسپتی گھی کے بجائے سرسوں کا تیل استعمال ہونے لگا۔ صبح کا ناشتہ اور دوپہر کا کھانا ایک ساتھ کر دیا گیا۔ دودھ آدھ سیر ہی آتا۔ پانی کی ملاوٹ کے باوجود اس میں مزید پانی ڈال کر مقدار پوری کی جاتی۔ بجلی کے بلب صرف مہمانوں کی آمد پر روشن کیے جاتے۔ ورنہ اپنا کام تو لالٹین سے چل جاتا تھا۔ مہینے میں ایک بار بیوی بچوں کے ساتھ کوئی فلم ضرور دیکھتا تھا' اس سے بھی توبہ کر لی۔

کرتا بھی کیا' ٹوٹو کے ساتھ ٹی ٹی کی فیس اور طرح طرح کے چندوں کی صورت میں لگ بھگ دوسو روپے ماہانہ پابندی سے ادا کرنا پڑتا۔ ٹوٹو اب کے جی سے پرائمری میں آ گیا تھا۔ لہٰذا اس کی فیس میں اضافہ ہو گیا۔

مگر میری تنخواہ میں صرف دس روپے کا اضافہ ہوا۔ وہ بھی پپی پیراڈائز اسکول کے مالک یا پرنسپل نے اپنے منجھلے بیٹے کے انجینئر بن جانے کی خوشی میں کیا تھا۔

البتہ تیسرے بچے کوکب کا اسکول میں داخلہ مجھے گراں نہیں گزرا۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ چونکہ تینوں بھائی ایک ہی سکول میں زیر تعلیم تھے' لہٰذا ایک کی فیس معاف ہو گئی۔ اس میں بھی صوبیدار صاحب کی کوشش کو بڑا دخل تھا۔ کوکب کو داخل کرانے میں بھی انہوں نے دستگیری کی تھی۔ اب وہ اس دنیا میں نہیں رہے۔ اللہ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ میرے لیے تو وہ رحمت کا فرشتہ تھے۔ ان کی وردی میں عجیب تاثیر تھی۔ ادھر انہوں نے اٹینشن ہو کر پرنسپل کے سامنے سلیوٹ مارا ادھر غیب سے آواز آئی۔ کھل جا سم سم! سینٹ پیٹرز اسکول کا دروازہ اس طرح پاٹوں پاٹ کھل جاتا کہ میرا ہر بچہ بے دھڑک اندر داخل ہو جاتا۔ کسی میں اتنی مجال نہ تھی کہ اسے داخلہ دینے اور تعلیم حاصل کرنے سے روکے۔

میرے تینوں بچے ذہین اور ہونہار تھے۔ ہر سالانہ امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کرتے رہے اور نیچے سے اوپر کے درجوں میں پہنچتے رہے۔ ان کی فیسیں اور چندے بھی بڑھ کر اوپر اور اوپر پہنچتے رہے۔ مگر میں ترقی کر کے اوپر نہ جا سکا۔ جہاں تھا وہیں جما رہا۔ اخراجات بڑھے' مہنگائی بڑھی اور تیزی سے بڑھی اور میری تنخواہ اس طرح بڑھی جیسے آٹے میں نمک۔ لہٰذا دودھ بند کر دیا' گھی

بند کر دیا' گوشت بند کر دیا' بیڑی پینا بھی چھوڑ دی اور صرف حقہ گڑ گڑانے لگا۔ رکشا اور بس کا سفر بھی چھوٹ گیا۔ میں سڑکوں پر جوتیاں چٹخاتا پھرتا۔ ملنے جلنے والوں کو نصیحت کرتا۔ پیدل چلو' جان بناؤ اور ڈاکٹروں کے چکر سے محفوظ رہو۔ نہ بیماری کا ڈر نہ علاج معالجے کی فکر۔

میں سوچ ہی رہا تھا کہ مزید بچت کے لیے کھانا دو وقت کے بجائے ایک وقت کر دیا جائے۔ اسی اثناء میں مجھے ایک نائٹ اسکول میں ملازمت مل گئی۔ ٹائپنگ کا کورس میں پہلے ہی مکمل کر چکا تھا اور ایک سیکنڈ ہینڈ ٹائپ رائٹر بھی خرید لی تھی۔ چنانچہ نائٹ اسکول سے فارغ ہوتا تو آدھی رات تک بعض وکیلوں کی قانونی دستاویزات ٹائپ کرنے کا کام انجام دیتا۔ سویرے ہی سویرے گھر سے نکلتا' رات کے گیارہ بجے واپس آتا اور بارہ بجے تک بلکہ اکثر و بیشتر رات کے پچھلے پہر تک ٹائپ رائٹر پر کھٹ پٹ کرتا رہتا۔

لیکن یہ محنت شاقہ ذرا نہ کھلتی۔ مجھے یہ اطمینان تھا کہ میرے تینوں بچے اعلیٰ اور معیاری سکول میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ ان کا مستقبل روشن تھا اور میں ان کے روشن مستقبل میں اپنا مستقبل روشن اور تابناک دیکھ رہا تھا۔ اب ان سے میری ملاقات اتوار کے اتوار ہوتی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ جس وقت میں گھر سے نکلتا وہ سوئے ہوتے اور جب واپس آتا تو وہ اپنے بستروں پر گہری نیند سو چکے ہوتے۔

آمدنی میری اب اتنی ہو گئی تھی کہ کسی نہ کسی طور گزر بسر ہو رہی تھی۔ نہ کسی کا قرض تھا نہ ادھار۔ مگر مسلسل شب بیداری کے باعث ایک بری عادت یہ پڑ گئی کہ کلاس میں اکثر کرسی پر بیٹھے بیٹھے سو جاتا۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ عادت پی پیراڈائز اسکول سے پڑی تھی۔ اسکول سے جب جی چاہتا اٹھ کر چلا جاتا۔ بغیر درخواست دیے چھٹی کرتا۔ طبیعت راغب ہوتی تو سبق پڑھا دیتا۔ ورنہ میز پر ٹانگیں پھیلائیں' آنکھیں بند کیں اور سو گیا۔ کوئی باز پرس کرنے والا نہ تھا۔ اسکول کے پرنسپل سید انور علی' جو منتظم اعلیٰ بھی تھے' دوسرے ہی بکھیڑوں میں الجھے ہوئے تھے۔ بہت کم اسکول آتے اور جب آتے تو گھڑی دو گھڑی سے زیادہ اپنے دفتر میں نہ ٹھہرتے۔ کلاسوں کی طرف رخ ہی نہ کرتے۔

ان دنوں وہ سخت مصروف نظر آتے۔ اس مصروفیت کی نوعیت یہ تھی کہ انہیں اچانک علامہ اقبال کے افکار سے عشق ہو گیا اور اس کا مظاہرہ پہلے پہل اس طرح دیکھنے میں آیا کہ ایک روز انہوں نے تمام اساتذہ کی میٹنگ بلائی۔ ایک نہایت ولولہ انگیز تقریر فرمائی جس کا لب لباب یہ تھا کہ علامہ اقبال نے اپنی تعلیمات اور اپنے افکار سے کس طرح اسلام کو سربلند کیا۔ اپنی شاعری سے برصغیر کے مسلمانوں کو کیوں کر خواب غفلت سے بیدار کیا۔ انہیں وہ عزم اور حوصلہ دیا جس کا نتیجہ آج ہمارے سامنے پاکستان کی صورت میں

موجود ہے۔ پرنسپل صاحب نے اساتذہ پر زور دیا کہ وہ نئی نسل کو اقبال کے افکار سے اس طرح لیس کریں کہ آگے چل کر وہ ملک وقوم کی خدمت کا فرض خلوص اور ذمہ داری سے انجام دیں۔

ان کے ارشادات پر دوسرے ہی روز سے عمل درآمد بھی شروع ہوگیا۔ یہ نہایت روح پرور منظر تھا۔ پپی پیراڈائز کے طلباء جھوم جھوم کر نہایت والہانہ انداز میں اقبال کی مشہور نظم "دعا" ترنم سے پڑھ رہے تھے۔ پھر تو یہ معمول ہوگیا کہ ہر صبح کورس میں یہ نظم گائی جاتی۔ حالانکہ انگلش میڈیم اسکولوں کے لیے جہاں "بابابابلیک شیپ" ------- "ٹونکل ٹونکل لٹل اسٹار" یا اسی قبیل کی دوسری انگریزی نظموں کا رواج تھا' یہ قطعی نئی بات تھی۔ مگر پرنسپل صاحب مطمئن تھے اور نہایت فخر سے فرماتے تھے کہ انہوں نے ایک اسلامی روایت کی بنیاد ڈالی ہے۔

علامہ اقبال کے ساتھ ان کا والہانہ عشق اس قدر بڑھا کہ یوم اقبال پر نہایت اہتمام سے ایک جلسہ منعقد کیا۔ شمالی ناظم آباد کے ایک کھلے میدان میں شاندار پنڈال لگایا گیا۔ جلسے کے لیے مہمان خصوصی کے طور پر کمشنر کو بلایا گیا۔ انہیں سپاسنامہ پیش کیا گیا۔ وہ حسب معمول اس ناچیز نے لکھا۔ پرنسپل صاحب کی ہدایات پر اس میں بار بار ترمیم کی گئی۔ جلسے کی کارروائی تلاوت کلام پاک سے شروع ہوئی۔

پرنسپل صاحب نے سپاسنامہ پیش کیا جس میں علامہ اقبال کے افکار اور ان کی تعلیمات عوام میں پھیلانے اور فروغ دینے کے لیے "اقبال میموریل لائبریری" قائم کرنے کی تجویز پیش کی گئی۔ لائبریری کے قیام کے لیے کمشنر سے جگہ مہیا کرنے کی اپیل کی گئی۔ جس میدان میں جلسہ منعقد ہوا تھا وہ دراصل تین ہزار سے بھی زیادہ مربع گز پر مشتمل ایک کمیونٹی پلاٹ تھا۔ یہ پلاٹ پبلک لائبریری کے لیے مختص تھا۔ سپاسنامے میں کمشنر صاحب بہادر کی خدمات جلیلہ کا ایسا شاندار قصیدہ تھا کہ وہ پھڑک اٹھے۔ درباداری اور خوشامد کے عادی افسر تھے۔ سپاسنامے سے اس قدر متاثر ہوئے کہ اسی وقت پلاٹ کے الاٹمنٹ کے احکامات جاری کردیئے۔

"انجمن محبان اقبال" کے نام سے پہلے ہی ایک تنظیم قائم ہوچکی تھی۔ جلسہ اسی کے زیر اہتمام ہوا تھا۔ انجمن کے تاحیات صدر پپی پیراڈائز اسکول کے پرنسپل سید انور علی تھے۔ ارکان میں ان کے چار بیٹے' دو بھتیجے شامل تھے۔

سید انور علی جوڑ توڑ والے آدمی تھے۔ کراچی ڈویلپمنٹ اتھارٹی یعنی KDA کے احکام کو کھلا پلا کر وہ پہلے ہی رام کر چکے تھے۔ لہٰذا جلد ہی ضروری خانہ پری مکمل ہوگئی اور پلاٹ کا الاٹمنٹ ملتے ہی چاردیواری بنائی گئی اور "اقبال لائبریری" کا بورڈ بھی آویزاں کردیا گیا۔

سید انور علی نے لائبریری کی عمارت کی تعمیر کے لیے بھاگ دوڑ کی۔ سرکاری گرانٹ کے علاوہ مخیر صنعت کاروں اور دوسرے اہل ثروت سے چندہ حاصل کیا۔ اس فنڈ سے عمارت کی تعمیر کا کام شروع کیا۔ ان دنوں وہ عمارت کی تعمیر میں اس قدر انہماک اور سرگرمی میں مصروف تھے کہ چپی پیراڈائز اسکول کی طرف توجہ دینے کے لیے بھی ان کے پاس وقت نہیں تھا۔

ذکر تھا میری اس بری عادت کا' جس کے باعث میں اکثر کلاس میں کرسی پر بیٹھے بیٹھے سو جاتا تھا۔ گرین وڈ کے پرنسپل کی خصوصیات تو میں بیان ہی کر چکا ہوں۔ انہوں نے کئی بار مجھے غنودگی کے عالم میں دیکھ لیا۔ سخت برہم ہوئے۔ طلباء کے سامنے بے عزت بھی کیا۔ لیکن ایک روز تو انہوں نے حد کر دی۔ میں طلباء کو سبق دے کر حسب عادت کرسی پر سو گیا۔ اسی اثناء میں پرنسپل صاحب وارد ہوئے۔ بنیادی طور پر تو وہ روئی کے آڑھتی ہی تھے۔ غصہ ضبط نہ کر سکے۔ کان پکڑ کر مجھے کھڑا کر دیا۔ حواس باختہ ہو کر آنکھ کھولی۔ دیکھا کلاس کے طلباء قہقہے لگا رہے ہیں اور پرنسپل صاحب فرشتہ اجل کی مانند سر پر کھڑے نہایت قہر آلود نظروں سے مجھے گھور رہے ہیں۔

ڈپٹ کر بولے۔ ''اس دفعہ تو میں نے چھوڑ دیا۔ آئندہ کلاس میں سوتے ہوئے پایا تو اسی روز نوکری سے برخاست کر دوں گا۔''

وہ ڈانٹ پھٹکار کر چلے گئے۔ بڑی کرکری ہوئی۔ طلباء سے آنکھ ملانے کی ہمت نہ ہوئی۔ مگر نہ میری شب بیداری میں فرق آیا اور نہ نیند نے مجھ پر رحم کھایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ ہی عرصے بعد کلاس میں سوتے ہوئے پھر پکڑا گیا۔ پرنسپل صاحب اس قدر غضب ناک ہوئے کہ مجھے زور سے دروازے کی جانب دھکا دیا۔ لڑکھڑا کر گرتے گرتے بچا۔ وہ مجھے اپنے دفتر میں لے گئے۔ اسی وقت تنخواہ کی رقم ہاتھ میں رکھ کر اسکول سے چلتا کیا۔

گرین وڈ اسکول کی ملازمت ختم ہو جانے کا مجھے شدید صدمہ ہوا۔ سو روپے ماہانہ آمدنی کا یک لخت بند ہو جانا معمولی واقعہ نہ تھا۔ اس پریشانی کے عالم میں چپی پیراڈائز اسکول کے مالک اور پرنسپل کی جانب نظریں اٹھیں۔ چاہا کہ ان سے مدد حاصل کی جائے۔ اپنی پریشان حالی بیان کی جائے اور اس کی بنیاد پر تنخواہ میں اضافے کی درخواست کی جائے۔ ان دنوں وہ خدمت خلق کے جذبے سے سرشار تھے اور علامہ اقبال کی تعلیمات سے شدت کے ساتھ متاثر تھے۔ لہٰذا توقع پیدا ہوئی کہ وہ ضرور کچھ نہ کچھ مدد فرمائیں گے۔

یہ تو میں بتا ہی چکا ہوں کہ وہ اسکول میں بہت کم آتے تھے۔ مگر جتنی بار آئے' ہر بار میں نے ان سے ملنے اور بات کرنے کی کوشش کی۔ وہ اس قدر عجلت میں آتے اور اتنے کم وقت کے لیے آتے کہ ملاقات بھی ہوتی تو بات کرنے کا موقع نہ ملتا۔ آخر ایک روز

ہمت کی۔ اقبال میموریل لائبریری پہنچا۔ سید انور علی اس وقت اپنے دفتر میں تھے اور تنہائی میں تھے۔ لائبریری کی پہلی منزل کی تعمیر کا کام تقریباً مکمل ہو چکا تھا۔ بہت بڑی عمارت تھی۔ بارہ کمرے تھے۔ کشادہ اور طویل ہال تھا' برآمدے تھے' راہداریاں تھیں' وسیع لان تھا۔ غرض کہ سب ہی کچھ تھا۔

انور علی خوش اخلاقی سے پیش آئے۔ کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ مسکرا کر پوچھا۔ ''آج ادھر کیسے نکل آئے؟''

''لائبریری دیکھنے آیا تھا۔'' میں نے ان کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے کہا۔ ''بہت شاندار لائبریری ہے۔ واقعی آپ نے بہت بڑا کام کیا۔''

خوش ہو کر بولے۔ ''میں نے اس کے لیے کتنی جانفشانی کی ہے' اس کے بارے میں اپنی زبان سے کیا بتاؤں۔ سب کچھ تمہارے سامنے ہے۔'' وہ سنجیدہ ہو گئے۔ ٹھنڈی سانس بھری۔ ''چاہتا ہوں زندگی میں ملک وقوم کے لیے ایسا کام کر جاؤں کہ آنے والی نسلوں کی قسمت بدل جائے۔''

میں نے ہاں میں ہاں ملائی۔ ''بہت قابل قدر جذبہ ہے۔ لوگ تو صرف باتیں کرتے ہیں' آپ نے کر کے دکھایا۔''

''علامہ اقبال کا پاکستان پر احسان ہے۔ اسے ہم ان کی ایسی ہی یادگاروں کے ذریعے چکا سکتے ہیں۔''

وہ اقبالیات پر باقاعدہ درس دینے لگے اور میں کان دبائے سنتا رہا۔ ان کی باتوں سے اندازہ لگایا کہ انہوں نے علامہ اقبال کے بارے میں دو چار کتابیں پڑھ لی ہیں۔ کچھ اشعار بھی ازبر کر لیے تھے جنہیں وہ اس طرح سناتے کہ مفہوم خبط ہو جاتا۔ نظم پر نثر کا گمان ہوتا۔ فلسفہ خودی کی انہوں نے ایسی توجیہہ اور تشریح کی وہ اقبال کی فکر سے بھی زیادہ بلندی پر پرواز کرنے لگے۔

ان کا جوش وخروش ذرا ٹھنڈا پڑا تو میں حرف مطلب پر آیا۔ ''آپ کو شاید علم نہیں' مجھے گرین وڈ اسکول سے علیحدہ کر دیا گیا ہے۔''

اظہار ہمدردی کے بجائے چہک کر بولے۔ ''یہ بھی اچھا ہی ہوا' تم کو اس واہیات اسکول سے نجات مل گئی۔ اماں وہ بھی کوئی اسکول ہے اور اس کا مالک تو صورت سے کان میلیا نظر آتا ہے۔ اس قدر ان پڑھ اور جاہل ہے کہ اسکول چلانے کے بجائے اسے گدھا گاڑی چلانی چاہیے۔''

''درست فرمایا آپ نے۔'' میں نے ان کی تائید کی۔ ''میں تو بدرجہ مجبوری وہاں پڑھا رہا تھا مگر اس اسکول سے علیحدہ ہونے کے بعد میں سخت پریشانی میں مبتلا ہو گیا ہوں۔ گزر بسر مشکل ہو گئی ہے۔''

''اللہ پر بھروسہ رکھو وہ بڑا مسبب الاسباب ہے۔'' انہوں نے نصیحت فرمائی اور میں نے اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی' کھل

کر بات کی۔ ''میں اس لیے حاضر ہوا تھا کہ آپ سے درخواست کروں گا کہ میری تنخواہ میں اضافہ کر دیا جائے۔ آپ نے وعدہ بھی کیا تھا۔'' میں نے لہجے میں عاجزی اور رقت پیدا کی۔ ''آپ کو بتا نہیں سکتا کس قدر پریشانی میں مبتلا ہو گیا ہوں۔''

''فی الحال تو بھئی میں کچھ نہیں کر سکتا۔'' انہوں نے ٹکا سا جواب دیا۔

میں اس قدر دل برداشتہ ہوا کہ کچھ بھی نہ کہہ سکا۔

مجھے خاموش اور مضمحل دیکھ کر انہوں نے تسلی دینے کی کوشش کی۔ کسی قدر نرم لہجے میں بولے۔ ''کچھ دن صبر کر لو۔ پھر نہ صرف تمہاری تنخواہ بڑھا دوں گا بلکہ اور بھی بہت کچھ دوں گا۔ مجھے پتہ ہے کہ تم نہایت محنتی ٹیچر ہو۔'' وہ زیر لب مسکرائے۔ ''یہ عمارت تو تم نے دیکھی ہے۔ لائبریری کے لیے کہاں اتنے کمروں کی ضرورت پڑے گی؟ اس کے لیے دو کمرے کافی ہوں گے۔'' ان کا لہجہ رازدارانہ ہو گیا۔ ''بقیہ عمارت تو اپنے اسکول کے کام آئے گی۔ تم میری بات کا مطلب سمجھ گئے نا؟''

میں ان کی بات کا مطلب بالکل سمجھ گیا اور علامہ اقبال سے ان کے عشق کا راز بھی اس طرح عیاں ہو گیا کہ چاروں طبق روشن ہو گئے۔ انہوں نے چھپانے کی کوشش بھی نہ کی۔ صاف گوئی سے کام لیا۔ ''ابھی تو علامہ اقبال کے بارے میں مہینے کے جلسے ہو رہے ہیں۔ لیکن ہر مہینے حاضرین کی تعداد گھٹتی جا رہی ہے۔ کچھ عرصہ بعد جب بالکل ختم ہو جائے گی تو میں اسکول اس عمارت میں منتقل کر دوں گا۔''

''نام تو علامہ اقبال ہی کے تعلق سے رکھا جائے گا۔'' میں نے قیاس آرائی کی۔

انہوں نے میری بات پسند نہ کی۔ قدرے تیکھے لہجے میں بولے۔ ''ان کے نام پر لائبریری تو موجود ہی ہے۔ ویسے بھی ان کے نام سے اسکول' کالج' ادارے' انجمنیں' سڑکیں' اسپتال' کیا نہیں ہے؟'' انہوں نے مجھے داد طلب نظروں سے دیکھا۔ ''اسکول کا نام تو میں ''فہیم چلڈرن اکیڈمی'' رکھوں گا۔'' نام کی وضاحت بھی خود ہی فرمائی۔ ''فہیم میرا چھوٹا بیٹا ہے۔ کیا بتاؤں کتنا ہونہار ہے۔ علامہ اقبال سے تو بس پوچھو نہیں اسے کتنی محبت ہے۔ ویسے بھی ضرورت اس بات کی ہے کہ نئی پود کو علامہ اقبال کی عظمت سے باخبر رکھا جائے اور میں یہی کرنا چاہتا ہوں۔''

''میرے بارے میں آپ نے کیا فیصلہ کیا؟ آپ یقین جانیں ۔۔۔۔۔۔'' میں نے اپنی پریشان حالی ایک بار پھر بیان کرنا چاہی۔ مگر انہوں نے آگے بولنے کا موقع نہ دیا۔ صرف وعدہ فردا پر ٹرخا دیا۔ کہنے لگے۔ ''بھئی سچ تو یہ ہے کہ اس وقت میں خود پریشان ہوں' مگر اسکول ادھر منتقل ہوتے ہی تمہاری تنخواہ فوراً بڑھا دوں گا۔ تم محنت سے پڑھاتے رہو۔ میں تمہارا پورا خیال رکھوں

گا۔"

مزید کچھ کہنے کی گنجائش نہ تھی۔ ان کا شکریہ ادا کیا' اٹھا اور واپس پپی پیراڈائز اسکول آ گیا۔

سید انور علی کی جانب سے مایوس ہونے کے بعد میں نے ملازمت کے لیے ادھر ادھر ہاتھ پیر مارنے کی کوشش کی۔ اسی عالم میں ایک مہینہ گزر گیا۔ دوسرا بھی کسی نہ کسی طور کٹ گیا۔ ملازمت کی تلاش میں اسکولوں اور دفتروں کے چکر کاٹ ہی رہا تھا کہ بچوں کی فیس جمع کرانے کا وقت آ گیا۔ اب میں قلاش ہو چکا تھا۔ کئی روز تک فیس کی رقم مہیا کرنے کی کوشش کرتا رہا مگر کوئی سبیل پیدا نہ ہوئی۔

فیس بروقت نہ پہنچی تو حسب دستور جرمانہ لگا اور بچوں کو کلاس میں خفت بھی اٹھانا پڑی۔ انہی دنوں کا ذکر ہے۔ جس کلاس کا میں کلاس ٹیچر تھا' اس کے طلباء کی فیس ہنوز میری ہی تحویل میں تھی۔ اکاؤنٹنٹ رخصت پر تھا۔ فیس کی پوری رقم میں گھر لے گیا۔ بچوں نے بار بار فیس کا تقاضا کیا۔ میں نے پریشان ہو کر سوچا' اس رقم میں سے بچوں کی فیس دے دوں۔ چند روز میں نائٹ اسکول سے تنخواہ مل جائے گی۔ رقم پوری کر کے اکاؤنٹنٹ کے پاس جمع کرا دوں گا۔ یہی سوچ کر میں نے بچوں کی فیس دے دی۔

مگر نائٹ اسکول کا انتظام خیراتی اسپتال کی مانند تھا۔ تنخواہ کا معاملہ آج اور کل پر ٹلتا رہا۔ غلطی یہ ہوئی کہ بعض گھریلو ضروریات کے لیے بھی فیس کی رقم میں سے خرچ کرتا رہا۔ ایک تہائی سے بھی زیادہ رقم کم ہو گئی۔ سوچا اسکول جاؤں گا تو تقاضا ہو گا۔ لہٰذا ایک ہفتے کی چھٹی لے لی۔ ہفتہ گزر گیا مگر رقم پوری ہونے کے بجائے اور کم ہو گئی۔ نائٹ اسکول سے تنخواہ ہی نہ ملی۔ مل بھی جاتی تب بھی کمی پوری نہ ہوتی۔

دو بار پپی پیراڈائز اسکول کا چپراسی میرے گھر آیا اور میں ہر بار اس سے نہ ملا۔ گھر میں چھپا بیٹھا رہا۔ میری مسلسل غیر حاضری نے پرنسپل صاحب کو سخت برگشتہ کر دیا۔ انہوں نے میرے خلاف پولیس میں رپٹ درج کرا دی۔ رات گئے میں نائٹ اسکول سے واپس ہوا۔ کیا دیکھتا ہوں' دروازے پر پولیس موجود ہے۔ گھر کے اندر جا کر بیوی بچوں کی صورت دیکھنا نصیب نہ ہوئی۔ اسی وقت حراست میں لے لیا گیا اور حوالات میں بند کر دیا گیا۔

پولیس نے غبن اور دھوکہ دہی کے الزام میں میرے خلاف مقدمہ قائم کیا اور عدالت میں چالان پیش کر دیا۔ نہ فیس کی رقم پوری کرنے کا کوئی وسیلہ تھا نہ کوئی مقدمے کی پیروی کرنے والا تھا' لہٰذا ضمانت بھی نہ ہو سکی۔ میری بیوی بیچاری روتی دھوتی پپی پیراڈائز اسکول کے مالک سید انور علی کے پاس گئی۔ گڑگڑائی' آہ وزاری کی۔ مگر ان کا دل نہ پسیجا۔ ان کے پاس دل ہی کہاں تھا۔ وہ تو نناوے

کے پھیر میں الجھا ہوا تھا۔

کئی ماہ تک مقدمہ چلتا رہا' پیشیاں پڑتی رہیں۔ استغاثہ کے پاس گواہ بھی تھے اور ثبوت بھی موجود تھا۔ عدالت نے خورد برد کرنے کے جرم میں ایک سال قید بامشقت کے ساتھ ساتھ پانچ سو روپے جرمانہ بھی عائد کیا۔ جرمانہ ادا کرنے کی توفیق نہ تھی لہٰذا تین ماہ کی مزید قید کاٹنا پڑی۔ جیل میں کیسے گزری' یہ نہ پوچھئے' وہ ایک علیحدہ داستان ہے۔ المناک اور عبرتناک بھی۔

جیل سے رہا ہو کر گھر آیا۔ دیکھا تینوں بچے طاعون زدہ چوہوں کی طرح مرگھلے ہو گئے تھے۔ چہرے مرجھا کر مٹیالے پڑ گئے تھے۔ بیوی کے پاس زیورات کی صورت میں جو ٹوم چھلا تھا وہ بک کر پہلے ہی ختم ہو چکا تھا۔ گھر کے اخراجات کچھ عرصے تک برتن بھانڈے اور گرہستی کا دوسرا سامان بیچ کر پورے کئے گئے۔ بیوی نے پڑوسیوں کے کپڑوں کی سلائی شروع کر دی۔ سلائی سے اتنی یافت بھی نہ ہوئی کہ گزر بسر ہو سکے۔ اکثر فاقہ پڑتا۔ بچوں کے جسم پر لباس کے بجائے چیتھڑے رہ گئے تھے۔ ایسی صورت میں ان کی تعلیم کیسے جاری رہ سکتی تھی۔ وہ ان کی حالت دیکھ کر دل ہی دل میں کڑھتی' بات بات پر روتی۔ جیل میں ملاقات کے دن مجھ سے ملنے آتی تو اس کی حالت زار مجھ سے دیکھی نہ جاتی تھی۔ وہ بھی آنسو بہاتی میں بھی روتا۔ اس کے رخساروں کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں' جسم لاغر اور کمزور پڑ گیا تھا۔ روتے روتے بینائی بھی کم ہو گئی تھی۔

اس قدر بدنام اور رسوا ہو چکا تھا کہ کسی اسکول میں ملازمت ملنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ لہٰذا مدرسی کو خیر باد کہا۔ ٹائپنگ کا پیشہ اختیار کیا۔ بہت بھاگ دوڑ کے بعد ایک معمولی سی فرم میں سوا سو روپے ماہوار پر ملازم ہو گیا۔ مگر وہاں تنخواہ کئی کئی ماہ نہ ملتی۔ یہی وجہ تھی کہ ہر ٹائپسٹ نوکری چھوڑ کر بھاگ جاتا تھا۔ ملازمت مل جانے کے باوجود کپڑوں کی سلائی پر گزارہ تھا۔

میں نے نوکری نہ چھوڑی البتہ دوسری کی تلاش میں سرگرداں رہا۔ ایک روز اقبال میموریل لائبریری کے سامنے سے گزرا۔ حیرت سے دیکھا۔ پھاٹک کے اوپر ''فہیم چلڈرن اکیڈمی'' کا اتنا لمبا چوڑا بورڈ آویزاں تھا کہ دور سے صاف نظر آتا تھا مگر اقبال میموریل لائبریری کا بورڈ کہیں نظر نہ آیا۔ ادھر ادھر نگاہیں دوڑائیں تو ایک گوشے میں چھوٹا سا بورڈ دکھائی دیا۔ اس پر دھندلے حروف میں ''اقبال میموریل لائبریری'' لکھا تھا۔ میں بورڈ کی عبارت پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ عین اسی وقت اسکول کے بڑے پھاٹک سے ایک چمکتی دمکتی کار برآمد ہوئی۔ اس میں سید انور علی نہایت شان سے براجمان تھے۔ کار فراٹے بھرتی ہوئی زن سے میرے قریب سے گزر گئی۔

فرم کی ملازمت برائے نام تھی۔ لہٰذا ایک ہوٹل میں رات کو بیرا گیری کرنے لگا۔ یہ ہوٹل نائٹ کلب بھی تھا۔ شام ہوتے ہی

زندگی کے ہنگامے بیدار ہوتے اور آدھی رات تک جاری رہتے۔ شراب کا دور چلتا۔ آرکسٹرا کی تیز مغربی دھنوں پر ملکی اور غیر ملکی رقصائیں ایسے اشتعال انگیز عریاں اور نیم عریاں رقص پیش کرتیں کہ پسینہ آ جاتا۔ مگر اس ہوٹل کی نوکری میں ایک فائدہ ضرور تھا۔ تنخواہ تو بہت کم تھی مگر بخشش کی صورت میں اچھی خاصی یافت ہو جاتی۔ بچا کھچا کھانا بھی مل جاتا۔ جان پہچان یا پاس پڑوس کا کوئی نظر نہ آتا۔ روزگار سے بھی لگا ہوا تھا اور محلے میں سفید پوشی کا بھرم بھی قائم تھا۔ البتہ ایک رات کو ایک شناسا چہرہ نظر آیا۔ یہ سید انور علی کا لاڈلہ بیٹا فہیم تھا۔ یہ ان کا وہی بیٹا تھا جسے علامہ اقبال سے اس قدر محبت تھی کہ اس سے متاثر ہو کر سید انور علی نے پہلے اقبال میموریل لائبریری قائم کی اور پھر فہیم چلڈرن اکیڈمی کے نام سے نیا اسکول کھولا تھا۔ وہ اس وقت نشے میں دھت تھا اور ایک مصری کیبرے ڈانسر کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کر رہا تھا۔ فسق اور سوقیانہ حرکت کا دھڑلے سے مظاہرہ کر رہا تھا۔

ادھر میرے تینوں بچوں کا حال یہ تھا کہ دن بھر گلی کے آوارہ لڑکوں کے ساتھ اودھم دھاڑ مچاتے' کشتم کشتا کرتے' لڑائی جھگڑے کرتے۔ آئے دن محلے والے میرے پاس آتے اور ان کے خلاف شکایتیں کرتے۔ آخر ایک پڑوسی کے مشورے پر میں نے ٹوٹو کو موٹر مکینک کا کام سیکھنے کی غرض سے ایک آٹو ورکشاپ میں لگا دیا۔ فی فی اور کوکب چھوٹے تھے۔ لہٰذا فی الحال انہیں اودھم دھاڑ مچانے کے لیے چھوڑ دیا۔

سوچا تھا' ٹوٹو کچھ عرصہ بعد کام سیکھ لے گا۔ اس کی تنخواہ مقرر ہو جائے گی۔ کچھ مالی امداد کی سبیل پیدا ہو جائے گی۔ لیکن ایک روز کیا دیکھتا ہوں کہ وہ باورچی خانے کے ایک کونے میں دبکا بیڑی کے کش لگا رہا ہے۔ غصہ تو بہت آیا مگر یہ سوچ کر خاموش رہا کہ اس میں اس کا کیا قصور۔ یہ تو اس ماحول کا اثر تھا جس میں وہ ان دنوں رہتا تھا۔ ورنہ یہ وہی بچہ تھا جو ہر روز سویرے ہی سویرے بیدار ہوتا' منہ ہاتھ دھوتا' برش سے دانت صاف کرتا اور اجلی یونیفارم پہن کر کندھے پر بستہ لٹکائے' ہنستا مسکراتا اس شان سے اسکول جاتا کہ بقول میری بیوی کے کسی بڑے گھر کا بچہ نظر آتا تھا۔

میں نے اسی روز ٹوٹو کو ورکشاپ جانے سے روک لیا۔ موٹر مکینک بنانے کا ارادہ ترک کر دیا اور چند ہی روز بعد ایک پرچون کی دکان پر بٹھا دیا۔ ٹوٹو پابندی سے صبح ہی صبح دکان پر چلا جاتا۔ دو ڈھائی مہینے بعد ایک شام دفتر سے لوٹتے ہوئے دکان کے مالک شیخ حمید کے پاس پہنچا۔ سوچا کہ ٹوٹو اب تک کام سیکھ گیا ہوگا۔ اس کی کچھ تنخواہ لگنا چاہیے۔ شیخ حمید کے پاس اسی ارادے سے گیا۔ دکان پر پہنچا۔ شیخ حمید سے ملا تو یہ عقدہ کھلا کہ ٹوٹو کئی روز سے کان پر نہیں گیا تھا۔ میں بہت چکرایا۔ چکرانے کی بات ہی تھی۔ ٹوٹو میرے

سامنے صبح دکان پر جاتا تھا اور رات کو گھر واپس آتا تھا۔
گمان گزرا کہ شاید گھر پر موجود ہو۔ کہیں کھیل کود میں بچوں کے ساتھ لگ گیا ہوگا' اس لیے دکان پر نہ پہنچا۔ میں خاموشی سے گھر واپس آیا۔ بیوی سے دریافت کیا۔ معلوم ہوا کہ ٹوٹو تو حسب معمول سویرے ہی سویرے گھر سے نکل گیا تھا۔ مجھے غصہ بھی آیا' دکھ بھی ہوا۔ میں ہوٹل بھی نہ گیا۔ بے چینی سے اس کا انتظار کرنے لگا۔ مگر وہ رات گئے تک نہ لوٹا۔ غالباً اسے پتہ چل گیا تھا کہ اس کی چوری پکڑی گئی۔ ساری رات آنکھوں میں کٹ گئی۔ صبح ہوگئی' سورج نکل آیا۔ آنکھیں ٹوٹو کو ڈھونڈتی تھیں اور اس کا کوئی پتہ نہ تھا۔
دفتر سے چھٹی لی اور ٹوٹو کی تلاش میں دن بھر مارا مارا پھرتا رہا۔ کہیں اس کا سراغ نہ ملا۔ پولیس میں رپورٹ درج کرائی۔ اخبارات میں "تلاش گمشدہ" کا اشتہار چھپوایا۔ ریڈیو سے بھی گمشدگی کا بار بار اعلان کرایا مگر کوئی کوشش کارگر نہ ہوئی۔ ٹوٹو کے بارے میں کوئی اطلاع نہ ملی۔ بیٹے کی یاد میں ماں کا یہ حال ہوا کہ کھانا پینا چھوڑ دیا۔ ہر وقت مصلے پر بیٹھی سجدے پر سجدے کرتی۔ گڑگڑا' گڑگڑا کر دعائیں مانگتی۔ روتے روتے آنکھوں کے پپوٹے سوج گئے۔ خود میرا عالم یہ تھا کہ بیوی کو تسلی دیتے دیتے بے ساختہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگتا۔
ہفتہ بھر سے زائد عرصہ اسی عالم میں گزر گیا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں۔ لیکن ایک رکشا والے نے مشکل کشائی کی۔ اس نے ٹوٹو کے حلیے کا ایک لڑکا مصری شاہ کے مزار پر دیکھا تھا۔ رات کے نو بجے کا عمل تھا۔ میں اسی وقت ٹوٹو کی تلاش میں روانہ ہوا۔ اونچے نیچے ویران راستوں پر اندھیرے میں ٹھوکریں کھاتا خانقاہ پر پہنچا۔
اس وقت خانقاہ کا عجب رنگ ڈھنگ تھا۔ ہر طرف شور اور ہنگامہ برپا تھا۔ نیم برہنہ' چیتھڑے لگائے ملنگ اور قلندر' ٹولیوں میں جگہ جگہ سلفے پر دم لگا رہے تھے۔ فضا میں چرس کی بو رچی ہوئی تھی۔ میں نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ دیکھا ملنگوں اور قلندروں کی ایک ٹولی کے ساتھ ٹوٹو بھی بیٹھا ہے۔ ہاں وہی تھا۔ لباس سڑے ہوئے چمڑے کی مانند گندہ اور غلیظ ہو گیا تھا۔ چہرہ خاک سے اٹا' بال وحشیوں کی طرح بکھرے ہوئے۔ میں دم بخود رہ گیا۔ بڑے دکھ کے ساتھ سوچا' کیا یہ وہی بچہ ہے جس کا نام میں نے ایک خوبصورت ہسپانوی بچے کی تصویر دیکھ کر لاذیرو رکھا تھا۔ جس کی شکل و شباہت اور طور طریقوں میں بڑے آدمیوں کی تمام علامتیں پائی جاتی تھیں۔ جو ہر صبح کندھے پر بھاری بھرکم بستہ لٹکائے جھوم جھوم کر چلتا ہوا اسکول جاتا تھا تو ماں باپ فخر سے ایک دوسرے کو یوں دیکھتے جیسے نظروں ہی نظروں میں کہہ رہے ہوں۔
"دیکھو یہ میرا لعل ہے' میں اس کا باپ ہوں۔"

''دیکھو اسے میں نے جنا ہے'میں اس کی ماں ہوں۔''

آج وہ خوبصورت بچہ ''لازیرو'' وہ مستقبل کا بڑا آدمی جسے ڈاکٹر'انجینئر' سائنس داں اور ماہر تعلیم بنانے پر ماں باپ کے درمیان گھنٹوں بحث ہوتی تھی' حتیٰ کہ ان بن بھی ہو جاتی تھی ملنگوں اور جرائم پیشہ لوگوں کے ساتھ اطمینان سے بیٹھا چرس پر دم لگا رہا تھا۔ نشے سے اس کی آنکھیں سرخ تھیں۔ چہرہ دھواں دھواں تھا اور وہ خود غلاظت کی پوٹ بن گیا تھا۔ میں آہستہ آہستہ اس کی جانب بڑھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے اٹھ کر بھاگنے کی کوشش کی۔ مگر جب میں نے جھپٹ کر اس کی گردن دبوچ لی تو وہ زخمی پرندے کی طرح میرے قابو میں آ گیا۔ میں غم وغصے سے کانپ رہا تھا۔ کسی نہ کسی طرح خود کو سنبھالا۔ ٹوٹو کو گھر لایا۔ سوچا اب کیا کیا جائے۔ لیکن میں کچھ نہ کر سکا۔ خاموشی سے بستر پر جا کر بیٹھ گیا۔ البتہ ماں نے بڑھ کر اسے سینے سے لگایا اور بلک بلک کر رونے لگی۔ جب دل کا غبار ذرا کم ہوا تو اسے چمکارا۔ دلجوئی کی' منہ ہاتھ دھلایا۔ کھانا لا کر سامنے رکھا۔

مگر ٹوٹو نے کھانا نہ کھایا۔ جھنجلا کر ٹھوکر ماری۔ کھانے کی پلیٹ دور جا گری۔ ماں کو ذرا بھی غصہ نہ آیا۔ وہ پھر بھی اسے پیار سے چمکارتی رہی۔ روٹی کا نوالہ بنا کر اپنے ہاتھ سے کھلانے کی کوشش کرتی رہی۔ یہ نئی یا انوکھی بات نہ تھی۔ ہم دونوں نے بچپن ہی سے ٹوٹو کی ایسی ہر ضد ہنس ہنس کر برداشت کی تھی۔ لیکن اس وقت تو وہ چرس کے نشے میں جھوم رہا تھا۔ ماں چمکارتی تو وہ ایسی خونخوار نظروں سے گھورتا جیسے کھا جائے گا۔ وہ جس قدر لاڈ پیار کا مظاہرہ کر رہی تھی وہ اسی قدر سرکشی پر اتر آیا۔ بار بار نفرت سے اس کا ہاتھ جھٹک دیتا۔

میں خاموش بیٹھا پیچ وتاب کھاتا رہا۔ ٹوٹو نے ایک بار پھر سالن کی پلیٹ پر لات ماری۔ پلیٹ لڑھکتی ہوئی دور چلی گئی۔ فرش پر سالن پھیل گیا۔ اس کی سرکشی اب میرے لیے ناقابل برداشت ہو گئی تھی۔ میں تڑپ کر اٹھا۔ بستر بند کا تسمہ نکالا اور سڑاک سے ٹوٹو کی پیٹھ پر لگایا۔ زندگی میں پہلی بار میں نے اسے مارا تھا۔ لیکن اس وقت تو میں غصے سے پاگل ہو گیا تھا۔ میں سڑاک سڑاک چمڑے کا تسمہ مارتا رہا' وہ بلبلا کر زمین پر لوٹنے لگا۔ بیوی نے ٹوٹو کو بچانے کی کوشش کی تو میں نے اسے بھی زور سے دھکا دیا۔ وہ پلنگ سے ٹکرا کر گری۔ میں ٹوٹو کو مارتا رہا۔ یہاں تک کہ مارتے مارتے ہانپنے لگا۔ جسم لرزنے لگا۔ وہ بے سدھ ہو کر فرش پر گر پڑا۔

یہ بڑی ہولناک رات تھی۔ ٹوٹو درد سے تلملا رہا تھا۔ سسکیاں بھر رہا تھا۔ بیوی بلک بلک کر رو رہی تھی۔ دونوں بچے خوفزدہ ہو کر چیخ رہے تھے۔ میں تانگے کے گرے ہوئے گھوڑے کی طرح بے حال پڑا تھا۔ رات کے سناٹے میں یہ تمام آوازیں اس قدر لرزہ خیز معلوم ہوئیں جیسے کوئی جان کنی کے عالم میں آخری ہچکی لے کر دم توڑ چکا ہے' مر گیا ہے۔

میں نے فرش پر پڑے پڑے خوابناک نظروں سے دیکھا۔ بیوی نے چمکار کر دونوں بچوں کو بستر پر سلا دیا۔ گلاس میں پانی لا کر مجھے پلایا۔ مجھے سہارا دے کر اٹھانے کی کوشش کی۔ میں نے اشارے سے منع کر دیا۔ وہ باورچی خانے میں گئی۔ انگیٹھی سلگا کر لائی اور کپڑے کی گدی بنا کر ٹوٹو کے بدن کی چوٹوں کو سینکنے لگی۔ ٹوٹو کا چہرہ قبر سے نکلے ہوئے مردے کی طرح ڈراؤنا نظر آ رہا تھا۔

میں نیم بیداری کے عالم میں پڑا سوچتا رہا۔ یہ سب کیا ہے؟ کیا یہ میرا ہی گھر ہے؟ یہ سامنے بستر پر میرے بچے لیٹے ہیں۔ وہ انگیٹھی کے قریب بیٹھا ہے۔ میرا پہلوٹی کا بچہ' جسے میں نے دیوانوں کی طرح مارا ہے۔ اس کے بدن پر جگہ جگہ نیل پڑ گئے ہیں جن سے خون رس رہا ہے اور اس کے برابر جو عورت بیٹھی ہے' وہ میری بیوی ہے۔ اس کے رخساروں کی ابھری ہوئی ہڈیوں کے پیچھے دھندلی دھندلی آنکھیں ہیں۔ وہ رو رہی ہے' وہ سسکیاں بھر رہی ہے۔ یہ سب کہاں سے آ گئے؟ میں نے انہیں کیوں اکٹھا کیا؟ میں نے یہ گھر کیوں بسایا؟ کیا ہی اچھا ہوتا کہ میں یہ سب کچھ نہ کرتا۔

میں ٹھیک ہی سوچ رہا تھا۔ مجھے وہ شب و روز یاد آ رہے تھے جب میں صرف ڈیڑھ سو روپے ماہانہ کماتا تھا۔ بے فکری کی نیند سوتا تھا۔ مزے سے سستے ہوٹلوں میں مردہ خچروں اور کتوں کے گوشت کا سالن اور لکڑی کا برادہ ملی روٹی کھاتا تھا۔ مہینے کی پہلی تاریخ کو بیس پچیس روپے جیب میں ڈال کر قحبہ خانے کی طرف جاتا۔ کسی بیسوا کے ساتھ منہ کالا کرتا۔ کبھی کبھار ہر جینا کا ادھا چڑھا کر سڑکوں پر آوارہ کتوں کی طرح جھومتا پھرتا۔ زندگی یونہی گزر جاتی۔ کسی روز ہوٹل کا کھانا کھاتا اور ہیضے میں مبتلا ہو کر مر جاتا یا کسی قحبہ خانے میں قتل کر دیا جاتا۔

مگر قحبہ خانے میں میرا قتل نہ ہوا۔ البتہ سستے ہوٹلوں کا کھانا کھا کھا کر ٹائیفائیڈ میں مبتلا ہو گیا۔ وہیں میں نے سوچا کہ میرا بھی گھر ہو' میرے لیے بھی کوئی انتظار کرنے والا ہو۔ کوئی میرا دامن پکڑ کر ضد کرے اور مامتا کے جذبے سے سرشار ہو کر اسے سینے سے لگا لوں' پیار کروں' سر پر شفقت سے ہاتھ پھیروں۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ میں نے یہ سب کچھ نہ سوچا ہوتا۔ خدایا! میں نے بہت بڑا جرم کیا۔ میں بدنصیب ہوں' بہت بڑا گنہگار ہوں۔

میں دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ مجھے اپنی آواز بڑی بھونڈی اور بے ہنگم معلوم ہوئی۔ مگر میں روتا رہا۔ پھر میں نے اپنے شانوں پر بیوی کے ہاتھوں کا لمس محسوس کیا۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ اسے سسکیاں بھرتے دیکھا۔ میں چپ رہا۔ کچھ نہ کہہ سکا۔ آنکھیں ایک بار پھر بند کر لیں اور بے خبر ہو کر سو گیا۔

ٹوٹو تول گیا۔ مگر اسے تلاش کرنے کے چکر میں نائٹ کلب کی بیرا گیری سے ہاتھ دھونا پڑا۔ البتہ فرم کی ملازمت برقرار تھی۔ تنخواہ بھی ہر مہینے مل جاتی تھی۔ لیکن نہ کبھی وقت پر ملی اور نہ یکمشت۔ ٹوٹو کا بیشتر وقت اب گھر ہی میں گزرتا۔ دونوں بھائیوں کے ساتھ دھینگا مشتی کرتا' شور کرتا' اودھم دھاڑ مچاتا۔

سوا سو روپے ماہانہ آمدنی میں پیٹ بھی نہ بھرتا تھا' تینوں بچوں کو تعلیم کیسے دلاتا' کہاں سے فیس کی رقم لاتا' کیوں کر ان کی کتابیں اور کاپیاں خریدتا؟ ان کے پیٹ بھی روز بروز پھیلتے جا رہے تھے۔ ایک ہی وقت میں کئی کئی روٹیاں چٹ کر جاتے۔ اگر ان کے پیٹ کا دوزخ نہ بھرتا تو روتے' ضد کرتے' گندی گالیاں بکتے۔ جب تک میں گھر میں رہتا' وہ آنکھوں کے سامنے رہتے۔ میرے باہر نکلتے ہی وہ بھی ماں کی آنکھ بچا کر سٹک جاتے۔ ویسے وہ ماں کو خاطر ہی میں کب لاتے تھے۔ وہ ڈانٹتی ڈپٹتی تو منہ زوری کرتے۔ ترکی بہ ترکی جواب دیتے۔ آنکھیں نکال کر کھڑے ہو جاتے۔ گلی کے آوارہ اور بدقماش لڑکوں کے ساتھ رہتے۔ مار دھاڑ کرتے' طرح طرح کے ہنگامے برپا کرتے۔

میں ان کی شکایتیں سنتا تو دل ہی دل میں کڑھتا۔ جھنجھلا کر سوچتا' یہ بچے تو جونک کی طرح چمٹ گئے ہیں۔ میرا خون پی پی کر مسٹنڈے ہوتے جا رہے ہیں۔ انہوں نے تو دن کا چین چھین لیا۔ راتوں کی نیند اڑا دی۔ گھر کو جہنم بنا دیا۔ کبھی کبھی تو ایسا عاجز آ جاتا' جی چاہتا کہ خواب آور گولیاں لا کر تینوں کو کھلا دوں۔ سوتے کے سوتے ہی رہ جائیں۔

مگر انہیں خواب آور گولیاں نہ کھلا سکا۔ ایک روز جنون کے عالم میں تینوں کو "محافظ اسلام" نامی یتیم خانے میں لے گیا۔ یتیم خانے کا مہتمم تینوں کو داخل کرنے پر راضی ہو گیا۔ لیکن جب اس نے دریافت کیا۔ "ان کے باپ کو فوت ہوئے کتنا عرصہ ہوا؟" تو میں برداشت نہ کر سکا۔ ایسی رقت طاری ہوئی کہ بے اختیار آنکھوں سے آنسو ابل پڑے۔

مہتمم جہاندیدہ اور سن رسیدہ آدمی تھا۔ فوراً اصل حقیقت تاڑ گیا۔ اس نے اپنی کھچڑی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ آنکھوں پر لگا ہوا چشمہ درست کیا۔ تسلی دیتے ہوئے نرم لہجے میں بولا۔ "آپ پریشان نہ ہوں' ہمارے یتیم خانے میں ایسے بھی بچے آتے ہیں۔"

میں اس کی بات کی تہہ تک نہ پہنچ سکا۔ ہونق کی طرح اس کا منہ تکنے لگا۔ "میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔"

وہ زیر لب مسکرا کر بولا۔ "آپ ان بچوں کے والد ہیں نا؟"

میں نے عین موقع واردات پر پکڑے جانے والے ملزم کی طرح خوفزدہ ہو کر انکار میں گردن ہلائی۔ "نہیں' میں ان کا باپ نہیں ہوں۔ یہ تو یتیم ہیں' لاوارث ہیں۔ دنیا میں ان کا کوئی نہیں۔"

کہنے کو تو میں نے جو کچھ کہنا تھا کہہ دیا' مگر اس دفعہ میں دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا کر رونے لگا۔

مہتمم نے مردم شناسی کا ثبوت دیا۔ فوراً بات کا رخ بدلا۔ ''اچھا اب اس قصئے کو چھوڑیے۔ کام کی بات کیجئے۔'' اس نے کھنکار کر گلا صاف کیجئے۔ ''دیکھئے ایک بچہ تو ابھی چھوٹا ہے۔ لیکن دوسرے دونوں بچوں کے عوض یتیم خانے کی جانب سے آپ کو پچیس روپے فی کس کے حساب سے پچاس ماہانہ ملیں گے۔''

میں رونا دھونا بھول کر حیرت سے مہتمم کو دیکھنے لگا۔ وہ میرے چہرے کے تاثرات نظر انداز کرتے ہوئے نہایت سنجیدگی سے گویا ہوا۔ ''آپ ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو آ کر یہ رقم یتیم خانے سے لے جایا کریں گے۔ ساتھ ہی میں یہ بھی واضح کر دوں' یتیم خانے کے رجسٹر میں ان کو یتیم ہی لکھا جائے گا۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کو اس خانہ پری پر اعتراض نہ ہوگا۔''

ظاہر ہے مجھے کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ فوراً ہامی بھر لی۔ ''بہت بہتر ہے۔''

مہتمم نے مجھے مزید اطمینان دلایا۔ ''آپ مطلق پریشان نہ ہوں۔ آپ کے بچے یتیم خانے کی تحویل میں رہیں گے۔ ان کو دونوں وقت کا کھانا ملے گا' پہننے کو کپڑے ملیں گے' تعلیم دی جائے گی' دستکاری بھی سکھائی جائے گی' اچھی طرح دیکھ بھال ہوگی' مناسب تربیت ہوگی۔ بہت آرام سے یہاں رہیں گے۔''

میں خاموش رہا۔ مہتمم میری دلجوئی کی غرض سے کہتا رہا۔ ''کیا کیا جائے بھائی صاحب' بڑا خراب زمانہ ہے۔ لوگ خود اپنے بچوں کو لاوارث بتا کر یتیم خانے میں داخل کراتے ہیں۔ آپ کے ساتھ کوئی نرالی بات نہیں ہے۔ وقت ہی کچھ ایسا ہے کہ اب آپ سے کیا عرض کروں۔''

خاصی دیر تک وہ ایسی ہی باتیں کرتا رہا۔ معاشرے کے بگڑے ہوئے حالات کا رونا روتا رہا۔ یتیم خانے کی فی سبیل اللہ خدمات کی تعریف و توصیف کرتا رہا۔ غرض کہ جب میں اپنے تینوں بچوں کو داخل کرانے کے بعد یتیم خانے سے لوٹا تو ایسا لگا گویا میرے سر کا بہت بڑا بوجھ اتر گیا۔ میں خود کو مطمئن اور ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔

ہم میاں بیوی ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو یتیم خانہ ''محافظ اسلام'' کے دفتر جاتے' مہتمم سے پچاس روپے ماہانہ وصول کرتے اور تینوں بچوں سے بھی مل لیتے۔ وہ بے پھندنے کی ترکی ٹوپیاں اور ایک ہی سے کپڑے کی ڈھیلی ڈھالی شیروانیاں پہنے ہمارے سامنے آ کر مودب کھڑے ہو جاتے۔ ان کے چہروں پر اب یتیموں کی سی لاوارثی برسنے لگی تھی۔ وضع قطع سے بھی وہ بالکل یتیم و یسیر نظر آتے

تھے۔شروع شروع میں تو ماں انہیں دیکھتے ہی رو پڑتی۔مگر رفتہ رفتہ وہ بھی میری طرح اس صورت حال کی عادی ہوگئی۔

یہ سلسلہ چلتا رہا۔گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ یتیم خانے سے ملنے والی رقم میں بھی اضافہ ہوگیا۔اب ٹوٹو اور فی فی کے عوض اسی روپے ماہانہ ملتے تھے۔کوکب کا بھی بیس روپے معاوضہ ملنے لگا۔ہر مہینے سو روپے ملتے تھے۔میں بھی خوش تھا اور بیوی بھی۔اطمینان اور یکسوئی سے گزر بسر ہورہی تھی۔بچوں کی طرف سے بھی اطمینان تھا۔وہ آوارہ گردی اور بے راہروی سے محفوظ تھا۔یتیم خانے کے مکتب میں دینی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔گھریلو صنعت اور دستکاری کی تربیت پارہے تھے۔

مجھے فرم کے ایک کام کے سلسلے میں حیدرآباد جانا پڑا۔بس کا سفر تھا۔آگے کی نشست پر دو نوجوان' جو شکل وصورت سے تعلیم یافتہ نظر آتے تھے' مشرقی پاکستان کی صورت حال کے بارے میں نہایت سنجیدگی سے بات چیت کر رہے تھے۔ایک بس اسٹاپ آیا۔بس ٹھہر گئی۔کچھ مسافر اترے' کچھ سوار ہوئے۔بس آگے روانہ ہوئی۔اچانک عقب سے گھسی پٹی لے میں وہ دکھڑا شروع ہوا جو بس اور ریل گاڑی کے سفر میں عام طور پر سنائی دیتا ہے۔

یتیموں کی فریاد سن لیجئے گا!

گئے ہم سے ماں باپ ہمارے بچھڑ

بحث کرنے والے نوجوانوں کو یہ دخل در معقولات نہایت شاق گزرا۔انہوں نے کنڈیکٹر کو بلا کر کہا۔''یار نکالو ان سالوں کو خواہ مخواہ شور مچانا شروع کر دیا۔'' کنڈیکٹر نے ہاتھ کے اشارے سے کچھ اس طرح منع کیا کہ خاموشی چھا گئی۔

ذرا دیر بعد پچھلی نشستوں سے زور زور سے بولنے اور تکرار کرنے کی آوازیں ابھریں۔میں نے پلٹ کر دیکھا۔کنڈیکٹر دو بچوں کو غصے سے ڈانٹ رہا تھا۔''تم بس کے اندر سگریٹ نہیں پی سکتے۔'' مگر وہ سگریٹ نوشی پر بضد تھے۔

میں نے دونوں کو غور سے دیکھا تو دھک سے رہ گیا۔وہ ٹوٹو اور فی فی تھے۔ٹھاٹھ سے سگریٹ کے کش لگا رہے تھے اور ڈھٹائی سے ہنس رہے تھے۔کنڈیکٹر سے ٹھٹول کر رہے تھے۔

کنڈیکٹر نے جھنجلا کر بس رکوائی' دونوں کو گندی گالی دی۔ٹوٹو کو کان پکڑ کھڑا کر دیا۔فی فی نے مداخلت کرنا چاہی تو اس کے گال پر تراق سے طمانچہ رسید کیا۔مجھ سے ضبط نہ ہوا۔بے قرار ہو کر اٹھا۔ان کی جانب بڑھا۔دونوں نے مجھے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ٹوٹو چپ رہا مگر فی فی کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا۔''ابا!''

مجھے سخت دھچکا لگا۔دماغ جھنجھنا اٹھا۔لپک کر قریب پہنچا۔پہلے تو دونوں کی اچھی طرح مرمت کی۔پھر دھکے دے کر باہر نکال

دیا۔ کنڈیکٹر کے ہاتھ مار کھلوانے سے یہ کہیں بہتر تھا کہ خود ہی ان کی کنڈی کردوں تا کہ نہ ذلت اٹھانا پڑے نہ دل کو چوٹ لگے۔

میں نے بیوی سے اس المناک واقعے کا ذکر نہ کیا۔ اسے ویسے ہی کم دکھائی دیتا ہے۔ یہ بات سنتی تو رو رو کر بالکل اندھی ہو جاتی۔ سوچا پہلی تاریخ کو تنہا جاؤں گا۔ یتیم خانے کے مہتمم سے کھل کر بات کروں گا' زور دوں گا کہ یتیم خانے کے لیے چندہ جمع کرنے کا کام میرے بچوں سے نہ لیا جائے۔ انہیں کوئی ہنر سکھایا جائے۔ اگر وہ اس پر رضامند نہ ہوا تو گھر واپس لے آؤں گا۔ اس طرح تو وہ آگے چل کر پیشہ ور گداگر بن جائیں گے۔ آوارہ اور بدقماش ہو جائیں گے۔

مگر میں پہلی تاریخ کو فرم کی بعض مصروفیات کے باعث نہ جا سکا۔ پورا مہینہ نہ جا سکا۔ پہلے بھی ایسا ہو چکا تھا۔ دوسرے مہینے کی پہلی تاریخ کے بجائے نو تاریخ کو یتیم خانے پہنچا۔ مہتمم کا رویہ بدلا ہوا تھا۔ چہرے پر پہلی سی نرمی اور شگفتگی نہ تھی۔ کرسی پر بیٹھنے کو بھی نہ کہا۔ بے رخی سے بولا۔

"اب کیا لینے آئے ہیں؟"

اس کی بات سن کر میں سخت چکرایا۔ ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ "میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھا۔"

اس نے ٹٹولنے والی نظروں سے مجھے دیکھا۔ "آپ اپنے بچوں ہی سے ملنے آئے ہیں نا؟"

میں نے صاف دلی سے کہا۔ "جی ہاں' بالکل ان ہی سے ملنے آیا ہوں اور پہلی بار نہیں آیا ہوں۔ آپ کو تو معلوم ہی ہے۔"

"مگر آپ کے بچے پچھلے ڈیڑھ ماہ سے بھی زیادہ عرصے سے یہاں نہیں ہیں۔"

"یہاں نہیں ہیں؟" میں نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ "کہاں ہیں وہ؟"

"تو گویا آپ کو کچھ پتہ نہیں؟" اس بار اس کے لہجے میں حیرت کا عنصر شامل تھا۔

میں نے پریشان ہو کر کہا۔ "خدا بہتر جانتا ہے' مجھے کچھ نہیں معلوم۔"

مسکرا کر بولا۔ "بھائی صاحب' وہ تو میرے بھی استاد نکلے۔" اس نے ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ "آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے' انہوں نے اپنا یتیم خانہ کھول لیا ہے۔"

میں ہکا بکا رہ گیا۔ یقین نہ آنے کے انداز میں بولا۔ "انہوں نے یتیم خانہ کھول لیا! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"ایسے ہی جیسے میں آپ سے بتا رہا ہوں۔" وہ بدستور مسکراتا رہا۔

"صاف صاف بتایئے' میں اب تک کچھ نہ سمجھ سکا۔"

اس دفعہ اس نے وضاحت سے بتایا۔ ”انہوں نے ایک نہیں کئی یتیم خانے کھول رکھے ہیں۔ مگر ان کا کہیں وجود نہیں۔ صاف بات یہ ہے کہ وہ جعل سازوں کے ایک گروہ میں شامل ہو گئے ہیں جس نے مختلف یتیم خانوں کے نام سے جعلی رسید بکیں چھپوا رکھی ہیں۔ ان کے نام پر چندہ جمع کرتے ہیں اور مل بانٹ کر کھا جاتے ہیں۔ ملک میں ایسے جعل سازوں کے نہ جانے کتنے گروہ ہیں۔ وہ یتیم خانوں کے بچوں کو بہلا پھسلا کر اپنے ساتھ ملا لیتے ہیں۔ شہر شہر گھومتے پھرتے ہیں۔ طرح طرح کے ہتھکنڈوں سے یتیموں کے نام پر مخیر اور خدا ترس لوگوں سے چندہ اینٹھتے ہیں اور بغیر ڈکار لیے نگل جاتے ہیں۔ یتیم خانے کے نام پر یہ دھندا بہت عام ہے۔“ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”مصیبت یہ ہے کہ ان کے خلاف کوئی کارروائی بھی نہیں کی جاتی۔“

”یقین مانئے مجھے اس سلسلے میں کچھ بھی خبر نہیں۔“ میں نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی۔

”مجھے آپ کی بات پر پورا یقین ہے۔“

میں نے تڑپ کر کہا۔ ”آپ کو پتہ ہے کہ وہ کہاں ہیں؟“

”ٹھیک سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ پچھلے مہینے تینوں کو ملتان اور لاہور میں دیکھا گیا تھا۔ میرا خیال ہے وہ پنجاب کے کسی شہر میں ہوں گے۔ ان کا کوئی مستقل ٹھکانہ تو ہے نہیں۔ ہوٹلوں میں ٹھہرتے ہیں۔ کچھ روز جعلی یتیم خانوں کے نام پر کمائی کرتے ہیں۔ پھر کسی دوسرے شہر چلے جاتے ہیں۔“

مجھ سے کچھ بھی نہ کہا گیا۔ گم صم بیٹھا رہا۔ دل ڈوبتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ مہتمم نے میری آزردگی کو تاڑ لیا۔ دلجوئی کرتے ہوئے بولا۔ ”آپ مجھ سے ملتے رہیں۔ جوں ہی ان کے بارے میں صحیح اطلاع ملی' آپ کو آگاہ کر دوں گا۔ انہیں واپس لانا چاہیں اور جعل سازوں کے چنگل سے چھڑانا چاہیں تو میں آپ کی مدد کروں گا۔ جیسے وہ آپ کے بچے ہیں ویسے ہی میرے بھی ہیں۔ میں ان کو تباہی و بربادی کے گڑھے سے نکالنے کی پوری کوشش کروں گا۔“

اس کی دلجوئی اور یقین دہانی سے میں بہت متاثر ہوا۔ دل شکستہ اور دل گرفتہ یتیم خانہ ”محافظ اسلام“ کے دفتر سے باہر نکلا۔ نڈھال اور بوجھل قدموں سے چلتا ہوا گھر میں داخل ہوا۔ بیوی سے اپنی بے قراری چھپا نہ سکا اور سب کچھ صاف صاف بتا دیا۔ کچھ دیر وہ سکتے کے عالم میں بیٹھی رہی' پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اسے تسلی دیتے ہوئے میں بھی امڈتے جذبات کے ریلے میں بہہ گیا۔ سسکیاں بھر کر رونے لگا۔ ایک روز کا نہیں' اب تو یہ جنم جنم کا رونا ہو گیا تھا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے' جمعے کا دن تھا اور سہ پہر کا وقت تھا۔ میں اپنی فرم کے منیجر سے ملنے نکلا تھا۔ وہ ان دنوں علیل تھے' دفتر نہ آتے تھے۔ گھر پر بلایا تھا۔ ٹائپنگ کا کچھ کام کرانا تھا۔ ان کے مکان کا مجھے صحیح پتہ معلوم نہ تھا۔ پہلی بار آنا ہوا تھا۔ مکان تلاش کرتا ہوا ایک سڑک سے مڑا تو دور سے سید انور علی کا اسکول نظر آیا۔ قریب پہنچا تو دنگ رہ گیا۔ ''فہیم چلڈرن اکیڈمی'' کا بورڈ غائب تھا' ''اقبال میموریل لائبریری'' کا لمبا چوڑا بورڈ آویزاں تھا۔

عمارت بالکل سنسان تھی۔ نہ کوئی آہٹ تھی نہ آواز۔ پھاٹک بند تھا۔ صرف اس کا چھوٹا دروازہ ذرا سا کھلا تھا۔ سوچا اندر جا کر اس تبدیلی کا راز معلوم کیا جائے جس نے میرے ذہن میں کھلبلی مچا دی تھی۔ آگے بڑھا۔ ہچکچاتے ہوئے اندر قدم رکھا۔ وسوسوں نے سر ابھارا' انور علی مل گئے تو کیا ہوگا؟ مگر یہ سوچ کر خود کو مطمئن کیا۔ فیس خرد برد کرنے کا واقعہ بہت پرانا ہو چکا ہے۔ انور علی اسے بھول بھال چکے ہوں گے اور اگر انہوں نے اس کا ذکر نکالا بھی تو معذرت کر لوں گا۔ قصور بہرحال میرا ہی تھا۔

میں نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ کوئی نظر نہ آیا۔ آہستہ آہستہ چلتا ہوا عمارت کے قریب پہنچا۔ سیڑھیاں طے کیں برآمدے میں پہنچا۔ ایک کمرے پر سید انور علی کی تختی لگی تھی مگر اس کا دروازہ بند تھا۔ باہر سے تالا لگا تھا' البتہ برابر کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ بے دھڑک اس میں داخل ہو گیا۔ دروازے کے عین سامنے میز تھی۔ میز کے پیچھے کرسی پر خلیل احمد بیٹھا تھا۔ اس سے پرانی شناسائی تھی۔ وہ پپی پیراڈائز اسکول میں کلرک تھا۔

اس نے مجھے حیرت سے دیکھا۔ اٹھ کر ہاتھ ملایا۔ کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پوچھا۔ ''باقر صاحب! آج ادھر کیسے بھول پڑے؟''

''ادھر سے گزر رہا تھا۔ سوچا انور علی صاحب سے نیاز حاصل کر لوں۔ مگر وہ تو اس وقت موجود نہیں۔ یہاں آتے تو ہوں گے؟''

''کبھی کبھار آتے ہیں۔ مگر آج نہیں آئیں گے۔''

میں نے قیاس آرائی سے کام لیا۔ ''پپی پیراڈائز اسکول گئے ہوں گے۔''

''وہ تو کب کا ختم ہو گیا۔'' خلیل احمد نے مطلع کیا۔ ''اس کا نام بھی بدل گیا۔''

''وہ تو اس عمارت میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ میں نے تو یہاں فہیم چلڈرن اکیڈمی کا بورڈ بھی دیکھا تھا۔ مگر وہ بورڈ اب نظر نہیں آیا۔ اسکول کہاں چلا گیا؟''

''اس سال موسم گرما کی تعطیلات شروع ہوئیں تو اسکول بند کر دیا گیا۔'' خلیل احمد نے بتایا۔ ''تمام ٹیچروں کو علیحدہ کر دیا گیا۔ اسکول کا فرنیچر اور دوسرا سامان کچھ تو فروخت کر دیا گیا کچھ انور علی صاحب اپنے گھر لے گئے۔''

''مگر انہوں نے اسکول بند کیوں کر دیا؟'' میں نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ ''اسکول تو بہت اچھا چل رہا تھا۔''

''انور علی صاحب کو تو آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔ ہمیشہ بہت دور کی سوچتے ہیں۔'' اس نے کھل کر بات نہ کی۔ مگر میں نے یہ اندازہ لگا لیا کہ وہ انور علی سے خوش نہ تھا۔ اس کے لہجے میں گلہ تھا۔

میں نے کرید کر پوچھا۔ ''اسکول بند کرنے کا کوئی تو سبب ہوگا؟ بلا سبب تو اسکول بند نہیں کیا جا سکتا۔''

دبی زبان سے بولا۔ ''آپ سے کیا چھپانا۔ اصل بات یہ ہے کہ پرائیویٹ بینکوں اور صنعتوں کی طرح پرائیویٹ اسکولوں اور کالجوں کو بھی قومی ملکیت قرار دے کر سرکاری تحویل میں لیا جا رہا ہے۔ انور علی صاحب کا اثر و رسوخ تو آپ جانتے ہیں' کہاں نہیں ہے۔ انہیں کسی نہ کسی طور پر حکومت کے اس اقدام کی پیشگی اطلاع مل گئی۔ سرکاری تحویل میں جانے سے پہلے پہلے سب کچھ صاف بچا لے گئے۔''

''کیا بچا لے گئے۔ اسکول کا فرنیچر؟ وہ کتنے کا ہوگا؟'' میں نے قدرے تیکھے لہجے میں کہا۔ ''فرنیچر کی خاطر انہوں نے چلتا چلاتا اسکول بند کر دیا۔ سارے ٹیچروں اور عملے کے دوسرے افراد کو بے روزگار کر دیا۔''

''باقر صاحب آپ کمال کرتے ہیں۔ انہیں کسی کے بے روزگار ہونے سے کب سروکار رہا ہے۔ آپ کو تو پتہ ہی ہے۔ گرمی کی تعطیلات کے ساتھ ٹیچروں کی ملازمت ختم کر دی جاتی تھی۔'' خلیل احمد کھل کر بات کرنے لگا۔ ''اجی انہوں نے تو اس عمارت کو بچا لیا ہے۔ یہ تو ان کے قبضے میں رہے گی۔ سنا ہے اب تو اس زمین کا الاٹمنٹ بھی انہوں نے اپنے ہی نام کرا لیا ہے۔'' وہ زیر لب مسکرایا۔

''اسکول قومی ملکیت قرار دیا جاتا تو اس کے ساتھ یہ زمین اور جائیداد سب ان کے ہاتھ سے نکل جاتی۔ غلط کہہ رہا ہوں؟''

''بھئی اپنے انور علی صاحب بھی بڑی چلتی رقم ہیں۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''پہلے سے پیش بندی کر لیتے ہیں۔ لائبریری کا بورڈ بھی انہوں نے کسی مصلحت سے لگا رکھا ہے۔''

''یہ بورڈ تو ان کے لیے بہت بڑی ڈھال ہے۔ جب تک یہ موجود ہے ان پر ذرا آنچ نہیں آئے گی۔''

میں نے پوچھا۔ ''تم کیا کر رہے ہو؟''

''فی الحال تو میں آفس سیکرٹری ہوں۔'' اس نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''مگر آثار نظر آ رہے ہیں کہ مجھے بھی دوسروں کی طرح جلد ہی نکال باہر کیا جائے گا۔ صرف لائبریری کا بورڈ رہ جائے گا اور سید انور علی صاحب''

''مگر یہ سلسلہ کب تک چلے گا؟ انور علی صاحب کو اس سے کیا حاصل ہوگا؟''

خلیل احمد نے بتایا۔"وہ پھر یہاں اپنا اسکول کھول لیں گے۔ انور علی صاحب کو تو یہی امید ہے۔ آپ جانتے ہیں امید پر دنیا قائم ہے۔"

وہ ہنسنے لگا۔ میں بھی اس کے ساتھ ٹھٹھا مار کر ہنسا۔ بات آئی گئی ہوگی۔

ملک میں ایک بار پھر مارشل لاء لگا۔ ذوالفقار علی بھٹو ختم ہوگئے۔ جنرل ضیاء الحق اور ان کے جرنیل اقتدار مملکت پر قابض ہو گئے۔ قومی اور صوبائی اسمبلیاں توڑ دی گئیں۔ آئین لپیٹ کر داخل دفتر کر دیا گیا۔ فوجی حکمرانوں کی جانب سے آئے دن نت نئے قوانین اور آرڈی ننس نافذ ہونے لگے۔ طرح طرح کی تبدیلیاں دیکھنے میں آئیں۔ سابقہ حکومت کے فیصلے رد کر کے نئے احکامات جاری کئے گئے۔ نجی تعلیمی ادارے قائم کرنے کے بھی احکامات جاری ہوئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہر محلے' ہر گلی میں اسکولوں کے بورڈ نظر آنے لگے۔ سب انگلش میڈیم اسکول ہیں اور عام طور پر کسی نہ کسی مسیحی سینٹ کے نام پر ہیں۔ ہونا بھی چاہیے کہ ایسے اسکولوں میں خوب تگڑی فیس وصول کرنے کی پوری گنجائش ہوتی ہے۔

میں نے ایک بار دیکھا۔"اقبال میموریل لائبریری" کا بورڈ مختصر ہو گیا۔ اور اس پر لکھی ہوئی عبارت کے حروف بھی دھندلے پڑ گئے۔ پھاٹک کے اوپر "فہیم چلڈرن اکیڈمی" کا لمبا چوڑا بورڈ آویزاں ہو گیا۔ سید انور علی کی چمکتی دمکتی کار نہایت شان سے پھاٹک میں داخل ہوتی۔ وہ کار سے اتر کر خراماں خراماں اپنے دفتر کی جانب بڑھتے۔ چپڑاسی ادب سے سلام کرتا۔ بڑھ کر دروازہ کھولتا اور وہ اندر داخل ہو جاتے۔ چپڑاسی اس تختی کے عین نیچے لکڑی کے اسٹول پر بیٹھ جاتا جس پر خوبصورت حروف میں "پرنسپل" لکھا تھا۔

انور علی کا اسکول اب دو شفٹوں میں چلتا ہے۔ فیس بھی تگڑی وصول کرتے ہیں۔ یعنی ڈیڑھ سو روپے ٹیوشن فیس اور سو سے سوا سو روپے تک فاصلے کے مطابق بس کا کرایہ۔ اسکول کی اپنی بسیں ہیں جن میں ہر صبح بچوں کو بوریوں کی طرح ٹھونس دیا جاتا ہے۔ جس کلاس میں تیس بچوں کی گنجائش ہے' ساٹھ پینسٹھ بیٹھتے ہیں۔ ہر سال طلباء کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اور اس اضافے کے ساتھ ساتھ اسکول پر دھن برس رہا ہے۔ یوں سمجھئے سید انور علی دولت میں کھیل رہے ہیں۔ لکشمی ان کے قدم چومتی ہے۔

ان کے چھوٹے بچے اور بچیاں گھوڑا گلی اور مری کے شاندار اسکولوں میں پڑھتے ہیں۔ پر فضا مقامات پر رہتے ہیں۔ اپنے مستقبل کے گیسوئے تابدار کو اور تابدار بناتے ہیں۔ بڑا لڑکا ایف آر سی ایس کرنے کے بعد واپس آ گیا ہے۔ اس کا ذاتی کلینک ہے۔ نامور سرجن ہے۔ ایک آپریشن کے پانچ ہزار نقد سکہ رائج الوقت وصول کرتا ہے۔ ایک ایکڑ سے بھی زیادہ بڑے قطعہ اراضی پر بہت

عالیشان اسپتال تعمیر کر رہا ہے۔ دوسرا انجینئر ہے اور کسی امریکی تحقیقاتی ادارے میں ملازم ہے۔ ملک کو زر مبادلہ بھی کما کر نہیں بھیجتا۔ اس نے ایک امریکی لڑکی سے شادی کر لی ہے۔ گرین کارڈ حاصل کر لیا ہے۔ امریکہ میں مستقل رہائش اختیار کرنے کا پروگرام ہے۔

میرے بچوں کا حال احوال بھی سن لیجیے۔ ٹوٹو اور فی ملتان سنٹرل جیل میں ہیں۔ پہلے جعل سازی کے جرم میں قید ہوئے۔ جیل میں عادی مجرموں کے ساتھ رہ کر طاق ہو گئے۔ رہا ہوئے تو ڈکیتی اور رہزنی کے اسرار و رموز سے پوری طرح واقف ہو چکے تھے۔ جرائم کی دنیا میں خوب نام کمایا۔ نہایت دیدہ دلیری سے ڈاکے ڈالتے تھے۔ پکڑے گئے۔ اب قید بامشقت کاٹتے ہیں۔

کوکب نے جیب کاٹنے کے فن میں مہارت حاصل کی۔ ایک بار جیب کاٹنے کے بعد چلتی بس سے کود کر فرار ہونے کی کوشش کی مگر دونوں پیر پہیوں کے نیچے آ کر کٹ گئے۔ وہ حیدر آباد میں ہے۔ اپاہج ہونا اس کی کمائی کا وسیلہ بن گیا ہے۔ ہاتھوں کے بل گھسٹ گھسٹ کر چلتا ہے۔ دردناک صدا لگاتا ہے۔ فقیروں کا بھیس بنا کر تماشائے اہل کرم دیکھتا ہے۔ وہ ایک منجھا ہوا گداگر بن چکا ہے۔

میرا یہ عالم ہے کہ بیکار اور ناکارہ ہوں۔ زندگی عذاب بن گئی ہے۔ بیوی کماتی ہے اور میں کھاتا ہوں۔ وہ پڑوسیوں کے کپڑے سیتی ہے۔ دن رات کھٹا کھٹ مشین چلاتی ہے۔ اس کی بینائی کمزور اور کمزور ہوتی جا رہی ہے۔ چشمے کا نمبر بڑھتے بڑھتے آخری حد تک پہنچ گیا ہے۔ پھر نہ نمبر بڑھ سکے گا نہ وہ دیکھ سکے گی' اندھی ہو جائے گی۔ میں پہلے ہی ٹوٹ پھوٹ کا کھنڈر رہ گیا ہوں۔ سید محمد باقر کے بجائے اس کا جیتا جاگتا میموریل بن گیا ہے۔ لوگ مجھے خبطی اور دیوانہ کہتے ہیں۔ مجھے جہاں اور جس جگہ ایسا بورڈ نظر آتا ہے جس پر اس قسم کی عبارت درج ہوتی ہے۔۔۔۔۔۔

بچے قوم کی امانت ہیں

بچے نئے پاکستان کے معمار ہیں

اپنے بچوں کا مستقبل درخشندہ بنایئے

مجھ پر فوراً ہذیانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ دیوانگی کا ایسا شدید دورہ پڑتا ہے کہ میں ہر ایسے بورڈ پر پان کی پیک تھوک دیتا ہوں۔ کیچڑ' غلاظت' گھوڑوں گدھوں کی لید' جو کچھ ہاتھ میں آتا ہے کھینچ کر مارتا ہوں۔ کسی نہ کسی طور پر بورڈ کا ستیاناس کر دیتا ہوں۔ اس کی عبارت مٹا دیتا ہوں۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔

میری دیوانگی پر راہ گیر ٹھٹک جاتے ہیں۔ ہنستے ہیں' نفرت سے منہ بگاڑتے ہیں' گالیاں دیتے ہیں' کبھی کبھی تو مارنے سے بھی

دریغ نہیں کرتے۔ پچھلے ہی مہینے میری ایسی حرکت پر ایک شخص نے غصے سے مجھے اس بیدردی سے مارا کہ چہرہ لہولہان ہوگیا۔ بایاں رخسار پھٹ گیا۔ اس کا نشان ہلال کی صورت میں اب تک موجود ہے۔ لیکن میری دیوانگی میں پھر بھی فرق نہ آیا۔ جی چاہتا ہے' کوئی سر پر جوتا مار کر کہے۔ "ابے گھر بسائے گا؟"

کوئی ٹھوکر مار کر کہے۔ "الو کے پٹھے باپ بنے گا؟"

کوئی میرے منہ پر تھوک کر کہے۔ "کیوں بے' اپنے بچوں کا مستقبل روشن بنائے گا؟"

لوگو! خدا کے لیے مجھے اس طرح قہر آلود نظروں سے نہ دیکھو۔ میرے حال پر یوں نہ ہنسو۔ میں پاگل اور دیوانہ نہیں ہوں۔ میں اپنے ہوش وحواس میں ہوں۔ میں انسان کے ہاتھوں ستایا ہوا ایک انسان ہوں' ایک باپ ہوں۔

لو میں نے تمہارے آگے ہاتھ پھیلا دیے۔

دل صاحب اولاد سے' انصاف طلب ہے!



بھگوان داس درکھان

کچہری شروع نہیں ہوئی تھی۔ جس کمرے میں مقدمات کی سماعت ہوتی تھی ابھی تک خالی تھا۔ البتہ صدر دروازے کی دہلیز کے پاس دو ملازم کواڑوں سے ٹیک لگائے فرش پر پھسکڑ مارے بیٹھے تھے۔ کمرے کے بیچوں بیچ دیوار سے ذرا ہٹ کر رنگیل کھٹ پڑی تھی۔ یہ چوڑا چکلا پلنگ تھا۔ اس کے پائے اونچے اونچے تھے۔ ان پر رنگ روغن سے نہایت خوشنما نقش و نگار بنے تھے۔ پلنگ پر صاف ستھری جھلکتی ہوئی سفید چادر بچھی تھی۔ پائتی کی جانب دوہتی تھی۔ اس پر رنگین دھاگوں سے دیدہ زیب کشیدہ کاری کی گئی تھی اور حاشیہ سرخ ٹول کا تھا۔ سرہانے بڑے بڑے کارنامے دبیز تکیے رکھے تھے۔

کمرے کے آگے طویل برآمدہ تھا۔ برآمدے کے سامنے وسیع احاطہ تھا۔ جس کے مشرقی گوشے میں گھنے درختوں کا جھنڈ تھا۔ برآمدے میں اور درختوں کے نیچے مزارعے، بزگر اور مختلف پیشوں سے تعلق رکھنے والے کی جگہ جگہ چھوٹی بڑی ٹولیوں میں بیٹھے تھے۔ ان میں بڑی تعداد ایسے مرد اور عورتوں کی تھی جن کے مقدمات سردار کی کچہری میں زیر سماعت تھے یا جن کی سماعت ابھی شروع نہیں ہوئی تھی۔ وہ ہنس رہے تھے۔ باتیں کر رہے تھے یا اپنے مقدمات کے بارے میں ایک دوسرے سے تبادلہ خیال کر رہے تھے۔ ان کی ملی جلی آوازوں کا شور آہستہ آہستہ ابھر رہا تھا جس میں سرائیکی کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں بلوچی کی آمیزش تھی۔

تمام آوازیں یکا یک بند ہو گئیں۔ ہر طرف گہری خاموشی چھا گئی۔ کچہری کے صدر دروازے کی دہلیز پر بیٹھے ہوئے دونوں ملازم گھبرا کر اٹھے اور نظریں جھکا کر مستعدی سے کھڑے ہو گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے دروازے پر سردار شہ زور خان مزاری نمودار ہوا وہ گھٹنوں سے بھی نیچی لمبی قمیض اور پورے بیس گز کی گھیر دار شلوار پہنے ہوئے تھا اس کے اجلے لباس پر عطر لگا تھا جس کی تیز خوشبو سے کمرے کی فضا مہکنے لگی۔ اس کی سیاہ داڑھی خوب گھنی تھی۔ مونچھیں بھی گھنی تھیں اور چڑھی ہوئی تھیں۔ آنکھوں سے جلال ٹپکتا تھا۔ چہرے پر رعب و دبدبہ تھا۔ عقب میں اس کا کم دار چاکر خان سرگانی اور حویلی کا ماشیا تھا۔ دونوں گردنیں جھکائے اس کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔

سردار کو دیکھتے ہی ملازموں نے آگے بڑھ کر اس کے پیروں کو ہاتھ لگا کر پیرن پون کیا۔ اونچی آواز سے دعائیہ جملے ادا کئے۔

''سیں سردار سدا جیویں۔ سکھی صحت ہوویں، خیر خیریت ہووے، بالیں بچیں سکھی صحت ہوویں، رب راضی باضی ہووے۔''

سردار مزاری نے ہولے ہولے گردن ہلائی اور ان کی جانب دیکھے بغیر کہا۔ ''خیر خیر صلائے۔'' وہ گردن اٹھائے آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ پلنگ کے قریب گیا۔ ٹانگیں سمیٹ کر اوپر پہنچا۔ چاکر خان سرگانی نے جھک کر اس کے پیروں سے کھسے اتارے۔ سردار تکیوں سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس نے دونوں پیروں کے پنجے جوڑ کر ایک دوسرے سے ملائے اور گھٹنے اٹھا کر اونچے کر لیے سرگانی کے اشارے پر ایک ملازم بڑھ کر آگے آیا۔ اس کے ہاتھ میں خیری تھی۔ یہ سفید ململ کا ڈھائی گز لمبا ٹکڑا تھا جسے تہہ کر کے لگ بھگ چھ انچ چوڑا کر لیا گیا تھا۔ ملازم جھکا اور اور نہایت مستعدی سے خیری اس کی کمر اور گھٹنوں کے گرد لپیٹ کر بغل بندی کر دی۔ پھر خیری کے دونوں سرے جوڑ کر اس طرح دمولگایا کہ آنکھوں کے سوا چہرے کا بیشتر حصہ چھپ گیا۔

بلوچ نژاد سرائیکی کی روایت کے مطابق جب سردار اس طرح ولیٹھ مار کر بیٹھ گیا تو ایک ملازم نے حقہ تازہ کر کے پلنگ کے قریب اسٹول پر رکھ دیا۔ سردار نے حقے کی نے سنبھالی اور ہونٹوں میں دبا کر کش لگانے لگا۔ تمباکو کی خوشبو کمرے میں پھیلنے لگی۔ مالشیا فوراً سردار مزاری کی پشت پر پہنچا اور چابک دستی سے اس کے کندھے اور کمر ہولے ہولے دبانے لگا۔

کچہری کی کارروائی کا آغاز ہوا تو چاکر خان سرگانی نے' جو پیش کار کے فرائض انجام دے رہا تھا' پہلا مقدمہ سماعت کے لیے پیش کیا۔ ملزم گلہ بان تھا اور سردار کے روبرو گردن جھکائے سہما ہوا کھڑا تھا۔ اس کے خلاف یہ الزام تھا کہ اس کے ریوڑ کی دو بھیڑیں سردار مزاری کے ایک کھیت میں گھس گئی تھیں اور مکی کے کئی پودوں کو نقصان پہنچایا تھا۔ گلہ بان گڑگڑا کر معافی مانگتا رہا۔ قسمیں کھا کر یقین دلاتا رہا کہ آئندہ ایسی غلطی سرزد نہیں ہوگی مگر اس کی ایک نہ سنی گئی۔ سردار کی نظر میں جرم کی نوعیت سنگین تھی لہٰذا اسے جرمانے میں پانچ بھیڑیں مال خانے میں پہنچانے کے علاوہ تین مہینے جیل میں قید رکھنے کی سزا دی گئی۔

چاکر خان سرگانی نے دبی زبان سے مطلع کیا۔ ''سیں سردار! جیل میں جگہ نہیں ہے۔''

''جیل میں جگہ نہیں ہے تو مجرم کو سکے کھوہ میں ڈال دیا جائے۔'' سردار مزاری نے حکم صادر کیا۔ ''جب تک جیل میں جگہ نہیں ہے سزا پانے والے تمام قیدیوں کو سکے کھوہ میں بند کیا جائے۔''

سکے کھوہ اندھے کنوئیں تھے۔ یہ چوڑے دہانے کے ایسے بڑے بڑے کنوئیں تھے جو کبھی آبپاشی کے کام آتے تھے مگر خشک ہو جانے کے باعث نہ ان میں اب پانی تھا اور نہ اس کے نکلنے کا کوئی امکان تھا۔ سردار کی نجی جیل جب قیدیوں سے بھر جاتی اور اس میں مزید گنجائش نہ رہتی تو قیدیوں کو سکے کھوہ میں بند کر دیا جاتا۔ وہ اندھے کنوئیں میں اٹھتے بیٹھتے' سوتے' کھانا کھاتے اور وہیں پیشاب پاخانے سے فارغ بھی ہوتے۔ انہیں کسی سے ملنے کی اجازت ہوتی نہ بات کرنے کی۔ کھانا پانی مقررہ وقت پر صبح وشام رسی

سے باندھ کر پہنچا دیا جاتا۔ جاڑا ہو گرمی ہو یا برسات' وہ کھوہ سے باہر نہ آ سکتے۔ البتہ موسم سرما میں قیدیوں کو ایک کمبل دے دیا جاتا اور وہ بھی ان کے لواحقین مہیا کرتے۔ قیدیوں کو جو کھانا دیا جاتا' خواہ وہ سردار کی نجی جیل میں بند ہوں یا سکے کھوہ میں' اس کی قیمت بھی عزیز و اقارب ہی ادا کرتے۔ اگر قیمت ادا نہ ہوتی تو قیدیوں کو فاقہ کرنا پڑتا۔ اکثر قیدی مسلسل فاقہ کشی سے سسک کر مر جاتے۔ سکے کھوہ میں سانپ' بچھو اور ایسے ہی زہریلے کیڑے مکوڑے بھی ہوتے جو قیدیوں کی ہلاکت کا سبب بنتے۔

سردار کا فیصلہ صادر ہونے کے بعد اس پر فوری طور پر عمل درآمد شروع ہو گیا۔ جرمانے کی ادائیگی اور سکے کھوہ میں قید کرنے کی غرض سے مجرم کو کشاں کشاں کچہری سے باہر لے جایا گیا۔ سردار کا فیصلہ آخری اور اٹل فیصلہ تھا۔ اس کے خلاف کسی بھی عدالت میں نہ عذرداری ہو سکتی ہے نہ اپیل۔

چاکر خان سرگانی نے دوسرا مقدمہ پیش کیا۔ یہ مقدمہ سردار شہ زور خان مزاری کے روبرو پہلی بار پیش نہیں کیا گیا تھا۔ اس کی سماعت لگ بھگ چار مہینے سے جاری تھی۔ اب تک کئی پیشیاں پڑ چکی تھیں۔ مقدمہ خاصا پیچیدہ اور نہایت سنگین تھا۔ لہٰذا سردار مزاری مصلحت اندیشی سے کام لیتے ہوئے اسے قصداً طول دے رہا تھا تاکہ گزرے وقت کے ساتھ ساتھ فریقین کے دلوں میں پایا جانے والا شدید غم و غصہ سرد پڑ جائے اور اس کے فیصلے سے ہر فریق اس طرح مطمئن ہو جائے کہ دلوں سے کدورت اور رنجش مٹ جائے۔

یہ پانی کی تقسیم کا پرانا تنازعہ تھا۔ نوعیت اس کی یہ تھی کہ فریقین ایک ہی رودکوہی سے اپنی فصلوں کو سیراب کرتے تھے۔ رودکوہی کے کھڈ میں پانی کا ذخیرہ کم تھا اور فصلوں کے لیے ضرورت زیادہ تھی۔ انجام کار پانی کی تقسیم پر جھگڑا پیدا ہوا۔ ایسے جھگڑے ان بارانی علاقوں میں اکثر ہوتے ہیں جہاں رودکوہیوں سے کھیتوں کو پانی دیا جاتا ہے۔ ڈیرہ غازی خان اور اس کے قرب و جوار کے کوہستانی علاقے میں آبپاشی کا یہ نظام بہت قدیم ہے۔ اتنا قدیم کہ صحیح طور پر یہ بھی علم نہیں کہ کب رائج ہوا اور کس نے کیا۔

اس نظام آبپاشی کے تحت بارش کا پانی ایک طرف تو ضائع ہونے سے بچایا جاتا ہے اور دوسری طرف اسے زراعت کے لیے زیادہ سے زیادہ کارآمد بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ جب کوہساروں پر بارش ہوتی تو پانی اونچی نیچی چوٹیوں اور چٹانوں کی بلندیوں سے نشیب کی جانب نہایت تیز رفتاری سے بہتا ہے۔ مشہور ہے کہ اس کے تیز دھارے میں ایسی کاٹ ہوتی ہے کہ اگر اونٹ زد میں آ جائے تو اس کے پیروں اور کوچوں کی ہڈیاں بھی آری کی طرح کاٹ دیتا ہے۔

یہ برساتی پانی آن کی آن میں طغیانی اور سیلاب کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اس کے تیز اور تند ریلے میں مسافروں سے بھری ہوئی بسیں بہہ جاتی ہیں۔ فصلیں برباد ہو جاتی ہیں۔ انسان اور مویشی بہہ جاتے ہیں' مٹی اور گھاس پھوس کے بنے ہوئے مکان ڈھے

جاتے ہیں۔ ہر طرف جل تھل ہو جاتا ہے۔ تباہی اور بربادی کا بازار گرم ہو جاتا ہے۔ یہی پانی جو پہاڑوں اور کوہساروں کے دامن میں بسنے والوں کے لیے باران رحمت بن سکتا ہے زحمت اور مصیبت بن جاتا ہے۔

لیکن وہ مقامات جہاں رودکوہیاں موجود ہیں اس تباہی سے محفوظ رہتے ہیں۔ ان مقامات پر پانی کے تیز بہاؤ کا رخ موڑنے کے لیے ڈھلان پر جگہ جگہ مٹی اور پتھروں کے مضبوط اور اونچے اونچے پشتے بنائے گئے ہیں۔ اس طرح بارش کا پانی چھوٹی بڑی نالیوں سے بہہ کر اس زمین کو سیراب کرتا ہے جس پر کھیتی باڑی ہوتی ہے۔ مگر ایسی بارانی زمین پر عام طور پر صرف ایک فصل ہوتی ہے اور وہ خریف کی فصل ہوتی ہے جس میں مکئی کے علاوہ جوار اور باجرہ پیدا ہوتا ہے۔

ایسی رودکوہیاں کوہستانی سلسلے کی تلیٹی میں جگہ جگہ دیکھنے میں آتی ہیں۔ لیکن متنازعہ رودکوہی عام رودکوہیوں سے مختلف تھی۔ زیادہ کارآمد اور دیرپا بھی تھی۔ اپنی نوعیت اور افادیت کے اعتبار سے وہ ایک چھوٹے سے بند کی مانند تھی۔ اس کی تعمیر اس طرح کی گئی تھی کہ بارش کا پانی کا تیز دھار پشتوں سے ٹکرا کر جب اپنا راستہ بدلتا تو نالیوں سے گزرتا ہوا نشیب میں اس طرح بہہ کر جاتا جہاں زمین کھود کر پانی کا ذخیرہ کرنے کا نہایت مناسب انتظام تھا۔ پانی کا ذخیرہ سطح زمین سے کسی قدر بلندی پر تھا اور اس کا بڑا حصہ ایک وسیع غار کے اندر دور دور تک پھیلا تھا۔

یہ ذخیرہ آب جسے مقامی بولی میں کھڈ کہا جاتا ہے۔ کوہستانی چٹانوں کے سخت اور بڑے بڑے پتھر توڑ پھوڑ کر نہایت محنت اور جانفشانی سے بنایا گیا تھا۔ تاکہ موسم گرما میں پانی خشک ہونے سے محفوظ رہے۔ کھڈ کا پانی عام گھریلو استعمال کے بھی کام آتا تھا۔ کھڈ سے کھیتوں کو سیراب کرنے کے لیے کاریز اور نالیاں بنائی گئی تھیں جو خریف کے علاوہ کبھی کبھی ربیع کی فصل کی کاشت کے واسطے بھی پانی مہیا کرتی تھیں۔

فریقین کا تعلق تمن مزاری کے رستمانی اور مصدانی قبائل سے تھا۔ وہ کوہ سلیمانی کے جنوبی سلسلے کے دامن میں کھیتی باری کے ساتھ ساتھ گلہ بانی بھی کرتے تھے۔ مشترکہ رودکوہی سے اپنے کھیتوں کو پانی دیتے تھے۔ یہ علاقہ بلوچستان کے بگٹی قبائل کے مسکن ڈیرہ بگٹی سے متصل ہے جو شہ زور خان مزاری کی ایک بلوچ بیوی کو باپ کی طرف سے ترکے میں ملا تھا۔ چنانچہ اب وہ اس کی جاگیر میں شامل تھا۔

پانی کی تقسیم کا قضیہ بڑھ کر رفتہ رفتہ رستمانیوں اور مصدانیوں کے درمیان پرانی قبائلی دشمنی کی شکل اختیار کرتا گیا۔ انتقامی کارروائی کے طور پر مویشی اٹھا لیے جاتے۔ فصلوں کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی جاتی' رات کے اندھیرے میں چوری چھپے پانی کے

بہاؤ کا رخ موڑ دیا جاتا۔ ذخیرہ آب یعنی کھڈ کے دہانے سے رکاوٹیں ہٹا دی جاتیں اور اپنے کھیتوں کو زیادہ سے زیادہ سیراب کرنے کی غرض سے پانی کی چوری کی جاتی۔

کئی بار لڑائی جھگڑے ہوئے مگر پچھلے دنوں زبردست مسلح تصادم ہوا۔ تصادم سے قبل باقاعدہ فریق مخالف کو للکار کر خبردار کیا گیا تھا تاکہ وہ پوری تیاری کے ساتھ مقابلے پر آئے چنانچہ فریقین نے اپنے اپنے قبیلے سے جنگ آزماؤں اور سورماؤں کو اکٹھا کیا۔ رات بھر جاگتے رہے۔ صلاح مشورہ کرتے رہے۔ اپنی اور دشمن کی حربی قوت کا تجزیہ کرتے رہے اور اس کی روشنی میں موثر جنگی حکمت عملی اختیار کرنے کے منصوبے بناتے رہے۔

رات آنکھوں میں کٹی۔ سورج طلوع ہوا۔ دھوپ کوہساروں کی چوٹیوں سے پھسلتی ہوئی نیچے اترنے لگی۔ صبح ہوگئی۔ وہ کمربستہ ہو کر ہمکل کے مقام پر پہنچ گئے۔ وہ نہایت جوش وخروش سے نعرے لگا رہے تھے۔ ڈھول بجا رہے تھے۔ پگڑیاں اچھال رہے تھے۔ ہاتھوں میں دبے ہوئے ہتھیاروں کو سروں سے اوپر اٹھا کر لہرا رہے تھے۔ طرح طرح سے خون کو گرما رہے تھے۔ اپنے حوصلے بلند کر رہے تھے۔ بلوچوں کی حربی اصطلاح میں یہ میل کشی تھی۔

وہ کچھ دیر تک آمنے سامنے کھڑے رہے۔ میل کشی کے ذریعے اپنی قوت اور جرات کا مظاہرہ کرتے رہے۔ پھر تلواریں سونت کر اور تبر نما کلہاڑیاں اور دوسرے اسلحہ سنبھال کر وہ آگے بڑھے اور داڑھیوں دانتوں تلے دبا کر غیظ وغضب کے عالم میں ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑے۔ تلوار تلوار سے اور کلہاڑی کلہاڑی سے ٹکرائی۔ گرد کے بادل اٹھے۔ فضا دھواں دھواں ہوگئی۔ نعرے بلند سے بلندتر ہوتے گئے۔ شور بڑھتا گیا۔ ہر طرف خون کے چھینٹے اڑنے لگے۔

غضب کا رن پڑا۔ مگر بہت زیادہ خون خرابے کی نوبت نہ آئی۔ ہوا یہ کہ لڑائی شروع ہوتے ہی ایک ہندو چیختا' چلاتا' دہائی دیتا ایک سمت سے نمودار ہوا اور تیزی سے دوڑتا ہوا قریب پہنچ گیا۔ اس کا نام بھگوان داس تھا۔ ادھیڑ عمر تھا۔ سر اور داڑھی کے بال کھچڑی تھے۔ مگر جسم مضبوط تھا۔ قد اونچا تھا۔ پیشے کے اعتبار سے وہ درکھان تھا یعنی بڑھئی ہونے کے ساتھ ساتھ معمار کا کام بھی کرتا تھا۔ وہ پڑوس کی بستی کوٹلا شیخ میں رہتا تھا۔ اس کے علاوہ کوٹلا شیخ میں ہندوؤں کے کئی اور خاندان بھی آباد تھے جو کھیتی باڑی کرتے تھے۔ گلہ بانی کرتے تھے یا بھگوان داس درکھان کی طرح محنت مزدوری کرتے تھے۔

بھگوان داس درکھان بھاگ دوڑ کرنے کے باعث بری طرح ہانپ رہا تھا۔ اس کا چہرہ پسینے سے شرابور تھا۔ پگڑی کھل کر گلے میں آ گئی تھی۔ سر کے لمبے لمبے بال بکھرے ہوئے تھے۔ ہمکل کی اطلاع سورج نکلنے سے پہلے ہی اسے مل گئی تھی۔ اطلاع ملتے ہی وہ

تاروں کی چھاؤں میں گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ اس نے ہنگل کے مقام پر جلد سے جلد پہنچنے کی کوشش کی اور افتاں وخیزاں بروقت پہنچنے میں کامیاب بھی ہوگیا۔ اس نے نہایت جرات اور بیباکی کا مظاہرہ کیا۔ اپنی جان کی بازی لگا کر بے دھڑک لڑنے والوں کی صفوں میں گھس گیا۔ میرٹھ کرنے کے لیے چیخ چیخ کر دہائی دیتا رہا۔ اوران کے درمیان چٹان کی مانند تن کر کھڑا ہوگیا۔ اس نے دونوں ہاتھ بلند کئے۔ تلواروں اور کلہاڑیوں کے وار ہاتھوں پر روکے۔ زخمی ہوا اور زخموں سے نڈھال ہوکر گر پڑا۔

اس نے کشت وخون بند کرانے کے لیے یہ حربہ آزمایا تھے جسے بلوچی میں میرٹھ کہا جاتا ہے۔ بھگوان داس درکھان ہندو تھا۔ اور ہندو چونکہ اقلیت میں ہیں لہٰذا مسلمان بلوچ اپنی اعلیٰ قبائلی روایات کے مطابق ان کی جان ومال کا اس حدتک خیال رکھتے ہیں کہ انہیں میار سمجھا جاتا ہے۔ کسی کو میار بنانے کے بعد اس کا خون بہانا یا کسی طور گزند پہنچانا بلوچوں کے قبائلی ضابطہ اخلاق کی رو سے نہایت مکروہ اور قابل مواخذہ فعل قرار دیا جاتا ہے۔ چنانچہ بھگوان داس درکھان کی کوشش اور جرات رندانہ بارآور ثابت ہوئی۔ ہنگامہ کارزار سرد پڑ گیا۔ اٹھے ہوئے ہاتھ رک گئے۔ جو جہاں تھا وہیں ٹھہر گیا۔ لڑائی فوراً بند ہوگئی۔ ویسے میرٹھ کے لیے اس ہندو درکھان کے علاوہ اگر کوئی سیدزادہ قرآن شریف اٹھائے برسر پیکار فریقین کے درمیان آجاتا یا قبیلوں کی چند بوڑھیاں سر کھولے بال بکھرائے گلے میں چادر ڈالے عین لڑائی کے دوران رزم گاہ میں پہنچ جاتیں تو ان کے احترام میں بھی لڑائی بند کرنے کا اعلان کردیا جاتا۔

میرٹھ کی رو سے عارضی طور پر جنگ بند ہوگئی۔ بھگوان داس درکھان کی فوری طور پر مرہم پٹی کی گئی اور اسے کوٹلا شیخ پہنچادیا گیا۔ رستمانی اور مصدانی نبردآزما بھی اپنے اپنے زخمیوں کو اٹھا کر چلے گئے۔ مگر ان کے چہروں پر ابھی تک غیظ وغضب چھایا تھا۔ آنکھیں شکار پر جھپٹنے والے عقاب کی مانند چمک رہی تھیں۔ خون کھول رہا تھا۔ نبردآزمائی کا جوش سوا نیزے پر تھا۔ دونوں طرف کشیدگی اور غم و غصے کی فضا تھی لیکن اس وقت صورت حال نہایت سنگین ہوگئی۔ جب تیسرے روز غروب آفتاب سے کچھ دیر قبل مصدانی قبیلے کا ایک زخمی چل بسا۔ مقتول کے گھر میں کہرام برپا ہوگیا۔ اس کے بھائیوں اور قبیلے کے دوسرے افراد کے سینوں میں انتقام کی آگ شدت سے بھڑک اٹھی۔ اور مسٹ کرنے یعنی خون کے بدلے خون کی تیاریاں زوروشور سے ہونے لگیں۔

ایسی انتقامی کارروائی کو لسٹ دبیر کہا جاتا ہے۔

رستمانیوں کو جب اس لسٹ دبیر کا علم ہوا تو ادھر بھی لوہا گرم ہوا۔ مرنے مارنے کی تیاریاں شروع کردی گئیں۔ فوراً اڈاہ کا بندوبست کیا گیا۔ اس کے لیے یہ طریقہ کار استعمال کیا گیا کہ ایک ایسے شخص کو ڈاہ ڈوک مقرر کیا گیا جس کا تعلق غیر جانبدار قبیلے سے تھا۔ ڈاہ ڈوک قدرآور جوان تھا اور منجھا ہوا ڈھولکیا تھا۔ دن چڑھے وہ گلے میں ڈھول ڈال کر نکلا۔ اور ڈھول بجا کر منادی کرنے لگا۔ وہ

پہلے تڑاتڑ کئی کئی بار ڈھول پر تیلی سے چوٹ لگاتا اور پھر بایاں ہاتھ جھٹک کر مخصوص انداز میں اس طرح تھاپ دیتا جس کا واضح مفہوم یہ تھا کہ نبرد آزمائی کا خطرہ سروں پر منڈلا رہا ہے۔ طبل جنگ بجا چاہتا ہے۔ وہ دن ڈھلے تک اس طور فریقین کو خبردار کرتا رہا۔

ڈاہ کا اعلان ہوتے ہی ایک بار پھر دونوں طرف جنگ کی تیاریاں ہونے لگیں۔ مگر کچھ ایسے قبائل بھی تھے جو اس لڑائی جھگڑے میں ہنوز غیر جانبدار تھے۔ ان کا تعلق بلیجانی اور سرگانی قبائل سے تھا۔ وہ خون خرابے کے بجائے فریقین میں صلح صفائی کرانے کے خواہاں تھے۔ انہوں نے باہمی صلاح مشورے سے میرٹھ مرکہ یعنی معرکہ آرائی ختم کرانے کا منصوبہ بنایا۔ مقتول کے قبیلے کو اپنی آمد سے مطلع کیا اور صلح کرانے کی غرض سے پہنچ گئے۔ ان کے ہمراہ قبائل کے بزرگ اور معتبرین بھی تھے۔ علاقے کا ایک سیدزادہ تھا اور جس قبیلے کے ہاتھوں قتل ہوا تھا' اس کے معتبرین بھی تھے۔

بات چیت کا آغاز ہوا تو فضا نہایت کشیدہ تھی۔ فریقین ایک دوسرے کے خلاف سنگین الزامات عائد کر رہے تھے۔ خصوصیت کے ساتھ مقتول کے بھائیوں کا رویہ نہایت جارحانہ تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ میرٹھ مرکہ کا منصوبہ ناکام ہو جائے گا۔ صلح صفائی کی کوشش رائیگاں جائے گی۔ صورت حال سنبھلنے کے بجائے بگڑنے لگی۔ مگر معتبروں اور بزرگوں نے بروقت مداخلت کی۔ میانہ روی سے کام لیا۔ دونوں طرف کے مشتعل اور بپھرے ہوئے نوجوانوں کا غصہ ٹھنڈا کیا۔ مقتول کے لواحقین کو مست کرنے سے روکا۔ انتقامی کارروائی کے خطرناک اور دوررس نتائج سے خبردار کیا۔

رفتہ رفتہ کشیدگی کم ہونے لگی۔ چہروں پر چھائی ہوئی کدورت اور جھنجلاہٹ کا غبار چھٹنے لگا۔ آنکھوں سے نکلتی ہوئی چنگاریاں بجھنے لگیں۔ معتبروں کی خواہش تھی کہ قصاص کے بجائے مقتول کا خون بہا اور زخمیوں کے تاوان کا باہمی رضامندی سے تعین کر دیا جائے۔ لیکن مقتول کی ماں زرینہ بی بی خون بہا اور تاوان لینے پر آمادہ نہ ہوئی۔ وہ بیوہ تھی۔ اس کے پانچ بیٹے تھے۔ ایک کے ہلاک ہونے کے بعد چار رہ گئے تھے۔ چاروں کڑیل جوان تھے۔ ان کے قد اونچے اور جسم مضبوط تھے۔ وہ بھی اپنی ماں کے ہمنوا تھے۔ وہ بار بار مطالبہ کر رہے تھے کہ ان کے جذبہ انتقام کی آگ صرف اسی صورت میں ٹھنڈی پڑ سکتی ہے کہ سروں کی پگڑیاں گردنوں میں ڈال کر اور ملزموں کی طرح نظریں جھکا کر باقاعدہ سب کے روبرو معافی مانگی جائے۔ ان کے قبیلے کے معتبر بھی یہی چاہتے تھے مگر فریق مخالف کو یہ مطالبہ کسی طور منظور نہ تھا۔ یہ ان کی قبائلی آن کی کھلی تحقیر تھی۔

دیر تک بحث مباحثہ ہوتی رہی۔ کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ دونوں فریق اپنے اپنے موقف پر اڑے ہوئے تھے۔ آخر کار یہ طے ہوا کہ چند روز بعد پھر سر جوڑ کر بیٹھا جائے اور مصالحت کی ازسرنو کوشش کی جائے۔ اس وقت تک لڑائی جھگڑا نہ ہوگا۔ میرٹھ یعنی جنگ بندی کا پوری

طرح احترام کیا جائے گا۔ کسی طور پر اشتعال انگیزی کا مظاہرہ نہیں کیا جائے گا۔

غیر جانبدار قبیلوں' معتبروں اور بزرگوں نے جو کشت و خون کی بجائے صلح اور آشتی کے خواہش مند تھے' اپنی کوششیں برابر جاری رکھیں۔ فریقین سے مسلسل رابطہ قائم رکھا اور ایسا طریقہ کار وضع کرنا چاہا جو دونوں کے قابل قبول ہو۔ آخر وہ اس میں کامیاب بھی ہو گئے۔ بلوچوں کے قبائلی قوانین کے مطابق یہ ہنج کا طریقہ کار تھا۔ اس کی نوعیت یہ تھی کہ سزا کے طور پر مقتول کے ایک بھائی سے مخالف قبیلے کی کسی لڑکی کا رشتہ طے کر دیا جائے جو میر ٹھ مرکہ کی رو سے ہنج کہلاتی۔

ہنج کا دستور صرف بلوچوں ہی میں نہیں ملک کے بعض دوسرے علاقوں کے قبائل اور برادریوں میں بھی رائج ہے اور اسے سوارہ کہا جاتا ہے۔

ہنج ہونے والی لڑکی گل زریں کے باپ کا نام نور بخش رستمانی تھا۔ وہ کھیتی باڑی کے علاوہ کھجور کی فصل کا ٹھیکہ لینے والا زمان دار بھی تھا۔ نور بخش رستمانی اپنے قبیلے کا خوشحال اور ممتاز فرد سمجھا جاتا تھا۔ پانی کی تقسیم کے تنازعے کا وہ اس حیثیت سے نمایاں اور اہم کردار تھا کہ اس کے کھیتوں کا رقبہ زیادہ بڑا تھا اور اس کے کھیت متنازعہ رود کوہی سے متصل بھی تھے۔ مسلح تصادم میں بھی وہ پیش پیش تھا اور بڑھ چڑھ کر حملے کر رہا تھا۔ مقتول کے سر پر جو مہلک زخم تھا' عینی گواہوں کے مطابق وہ بھی نور بخش رستمانی کی کلہاڑی کے وار سے آیا تھا۔

نور بخش رستمانی کی معتبرین اور بزرگوں کے دباؤ کے سامنے کھل کر انکار کرنے کی جرات نہ ہوئی۔ مگر وہ اپنی بیٹی کو ہنج بنانے کے لیے کسی طور پر آمادہ نہ تھا۔ وہ شدید پریشانی میں مبتلا تھا۔ اس کی بڑی بہن شیریں کی الم انگیز زندگی اس کے سامنے تھی۔ قتل کی ایک واردات کے بعد قبائلی جرگے کے فیصلے کے مطابق شیریں کو بھی ہنج بننے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔

ہنج قرار پانے کے بعد شیریں کا مقتول کے بڑے بھائی کے ساتھ نکاح پڑھایا گیا۔ وہ بوڑھا تھا اور دمے کا پرانا مریض تھا۔ سر اور داڑھی مونچھوں کے بال سفید ہو چکے تھے۔ وہ نہ صرف شادی شدہ تھا بلکہ اس کی دو بیویاں بھی موجود تھیں۔ شیریں رخصت ہو کر شوہر کے گھر پہنچی تو اس نے صرف شب عروسی اس کے ساتھ بسر کی اور وہ بھی اس طرح کہ اپنے جذبہ انتقام کی تسکین کے لیے۔ وہ اسے مادر زاد برہنہ کر کے رات بھر طرح طرح سے اذیت پہنچاتا رہا' ذلیل و خوار کرتا رہا۔ صبح ہوتے ہی اسے میکے بھیج دیا گیا۔ دوبارہ نہ کبھی بلایا نہ اس سے ملا اور نہ ہی طلاق دی۔ شادی سے پہلے وہ جوانی کی امنگوں سے سرشار ایک خوبرو اور طرح دار دوشیزہ تھی۔ ایک ہی رات میں وہ جل کر راکھ ہو گئی تھی۔ اس کا رنگ روپ دھندلا گیا تھا۔ آنکھوں کے کنول بجھ گئے۔ چہرے پر ویرانی چھا گئی۔

اس صدمے کو وہ کچھ عرصے تو برداشت کرتی رہی پھر اس کا دماغی توازن بگڑ گیا۔ وہ ہر وقت خاموش بیٹھی خلاؤں میں گھورتی رہتی۔

نہ کسی سے بولتی نہ بات کرتی۔ پوچھنے پر بھی کچھ نہ کہتی۔ ماں کو گمان گزرا کہ خوف اور دہشت سے اس کا دل کمزور پڑ گیا ہے۔ لہٰذا تیر ریچ کرایا گیا۔ اس طریق علاج کے مطابق شیریں کو بستر پر چت لٹا کر پیتل کا کٹورا پانی بھر کر سینے پر رکھ دیا جاتا۔ اس میں سیسہ پگھلا کر ڈال دیا جاتا۔ یہ عمل کئی بار کیا گیا لیکن کوئی افاقہ نہ ہوا۔

شیریں کا علاج معالجہ برابر ہوتا رہا۔ دوا کے ساتھ ساتھ ٹونے اور ٹوٹکے بھی آزمائے جاتے چنانچہ شامرز منگوایا گیا۔ یہ سبز رنگ کا گول پتھر تھا جس پر مختلف رنگوں کے ننھے ننھے نقش ونگار تھے۔ اس میں سوراخ کیا گیا اور ایک ڈوری میں پرو کر شیریں کے گلے میں ڈال دیا گیا تا کہ کوئی آسیب اور جھپٹ ہو تو اس کا اثر زائل ہو جائے۔ اس مقصد کے لیے شیریں کے سرہانے آسان پری رکھا گیا۔ یہ بھی ہلکا کوئلہ نما بدبودار پتھر تھا۔ خاتون بی بی کی منت بھی مانی گئی۔ پاک صاف ہو کر طرح طرح کے کھانے پکائے گئے اور ایسی محفوظ جگہ پر پکائے گئے جہاں کسی مرد کا گزر نہ ہو۔ کھانا بھی غریب غرباء اور محتاجوں کو اس طور خیرات میں دیا گیا کہ سامنے بٹھلا کر کھلایا گیا۔ اس میں کسی بچے، مرد یا حاملہ عورت کو مطلق شریک نہ کیا گیا۔ ایسی منت کو بی بی دتی کہا جاتا ہے۔

مگر نہ کوئی منت کارگر ثابت ہوئی نہ کوئی دوا دارو کام آئی نہ ٹونا ٹوٹکا۔ شیریں کی دیوانگی بڑھتی گئی نہ کھانے کا ہوش رہا نہ پہننے کا۔ کبھی ہنستی کبھی پھوٹ پھوٹ کر روتی۔ کبھی جھنجھلا کر جسم کے تمام کپڑے جھر جھر پھاڑ دیتی اور بالکل برہنہ ہو جاتی۔ دیوانگی کا شدید دورہ پڑتا تو آنکھیں سرخ ہو جاتیں۔ چہرے پر وحشت طاری ہو جاتی۔ اسی وحشت کے عالم میں گھر سے باہر نکل جاتی۔ جدھر منہ اٹھتا ادھر چلی جاتی۔ باپ اس وقت زندہ تھا۔ وہ بار بار اسے پکڑ کر گھر واپس لاتا۔ جب وہ اس کی دیوانگی سے بہت عاجز آ گیا تو گھر میں قید کر دیا۔ پیر میں لوہے کی زنجیر ڈال دی۔ ہر وقت کڑی نگرانی بھی کی جاتی تا کہ وہ گھر سے باہر نہ جا سکے۔

ایک روز وہ کسی طرح گھر سے نکل گئی۔ باپ کو اطلاع ملی۔ وہ گھوڑے پر سوار ہو کر اس کی تلاش میں نکلا۔ آخر وہ اس بستی سے دور ایک ویران راہگذر پر مل گئی۔ عالم یہ تھا کہ لباس تار تار تھا اور ایک طرف بکھرا ہوا پڑا تھا۔ وہ مادرزاد برہنہ تھی اور راستے سے ہٹ کر جنگلی جھاڑیوں کی اوٹ میں پڑی تھی۔ اس کی زبوں حالت دیکھ کر صاف پتہ چلتا تھا کہ کسی نے اسے اپنی جنسی ہوس کا نشانہ بنایا ہے۔ یہ اس کی بیٹی شیریں نہ تھی اس کی عزت وناموس کا جنازہ تھا۔ غم وغصے سے اس کا خون کھولنے لگا۔ وہ گھوڑے سے نیچے اترا۔ شرم سے نظریں جھکائے اس کے قریب پہنچا اور اپنی پگڑی سر سے اتار کر اسکے جوان اور برہنہ بدن پر ڈال دی۔

کچھ دیر وہ اس کے پہلو میں نڈھال اور دل گرفتہ کھڑا رہا، پھر اس کے سرہانے بیٹھ گیا۔ محبت نے جوش مارا تو دل بھر آیا۔ آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ وہ ہولے ہولے بیٹی کا سر تھپکنے لگا۔ بیٹی نے آنکھیں کھول کر باپ کو دیکھا اور کراہتی ہوئی اٹھ کر بیٹھ

گئی۔اس نے باپ سے کوئی بات نہ کی۔اس کی ویران آنکھوں میں نہ شرم تھی نہ ندامت۔چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔یکا یک اس نے باپ کو قہر آلود نظروں سے دیکھا اور جسم کے گرد لپٹی ہوئی پگڑی کھینچ کر پھینک دی۔باپ نے فوراً پگڑی اٹھائی اور اس کا بدن ڈھانپ دیا۔لیکن وہ باز نہ آئی۔پگڑی ہٹا کر پھر علیحدہ کر دی۔باپ نے دوبارہ اس کا بدن ڈھانپ' کئی بار ایسا ہوا۔

باپ کے لیے اس کی دیوانگی نا قابل برداشت ہوگئی۔چہرے پر جھنجلاہٹ کے سائے پھیل گئے' وہ بھی غصے سے دیوانہ ہو گیا۔اس نے شیریں کے چہرے پر تڑاک سے تھپڑ مارا۔دوسرا مارا' تیسرا مارا۔اس کا غصہ کم ہونے کے بجائے سوا ہوتا گیا۔غیظ وغضب کے عالم میں وہ اسے مسلسل زدوکوب کرتا رہا۔یہاں تک کہ وہ ہانپنے لگا۔

شیریں نے مطلق مزاحمت نہ کی۔نہ روئی نہ چلائی۔نہ فریاد کی نہ دہائی دی۔چپ چاپ مار کھاتی رہی۔اس کی ایک آنکھ سوجھ گئی تھی۔زخمی ہونٹ سے خون رس رہا تھا۔وہ زمین پر خاموش اور بے حال پڑی تھی۔اس کے سر کے بال خاک سے اٹے ہوئے تھے۔چہرہ بھی گرد آلود ہو کر مٹیالا پڑ گیا تھا۔مگر وہ زیادہ دیر تک اس عالم میں نہ رہ سکی۔اس نے کروٹ بدلی اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ایک بار پھر اس پر پاگل پن کا دورہ پڑا۔اس نے جسم سے لپٹی ہوئی پگڑی کا ایک کونا پکڑ کر کھینچا اور اسے تار تار کر کے ایک طرف حقارت سے پھینک دیا۔

باپ نے غضب ناک نظروں سے اسے دیکھا۔پگڑی اٹھائی اور اسی سے شیریں کا جسم لپٹ کر پشتارہ بنایا۔اٹھا کر گھوڑے پر ڈالا۔خود بھی سوار ہوا اور گھوڑا سرپٹ دوڑانے لگا۔مگر وہ اپنے گھر نہ گیا۔سنسان اور پر پیچ راستوں سے گزرتا ہوا ایک ویران لوپ میں پہنچا۔یہ ایسا مقام تھا جس کے تین طرف کالے کالے پتھروں کی بنجر پہاڑیاں تھیں۔ان میں بسیرا کرنے والی چڑیاں بھی کالی کالی تھیں۔گھوڑا لوپ میں داخل ہوا اور اس کی ٹاپیں ابھریں تو چڑیوں کا ایک غول بھرا تا مار کر اڑا اور سیاہ بادل کی طرح فضا میں بکھر گیا۔باپ نے ان کی جانب کوئی توجہ نہ دی۔گھوڑا ایک پہاڑی کے دامن میں روکا۔نیچے اترا بیٹی کو گھوڑے سے اتار کر پتھریلی زمین پر ایک طرف ڈالا۔وہ بالکل گم صم تھی۔خالی خالی نظروں سے باپ کا چہرہ تک رہی تھی۔مگر اس نے مڑ کر بیٹی کی جانب نہ دیکھا۔کمر سے بندھا ہوا خنجر نکالا۔بیٹی کی جانب بڑھا۔اس کے گرد آلو بالوں کو ایک ہاتھ سے پکڑ کر سر جھکایا۔گھٹنوں کے بل فرش پر بیٹھا اور خنجر سے بیٹی کا گلا کاٹ ڈالا۔خون کا فوارہ ابلا جس کے چھینٹوں سے باپ کا چہرہ بھی خون سے تر ہو گیا۔

خنجر سے ذبح کرنے کے بعد وہ چند لمحے تک بیٹی کے تڑپتے ہوئے جسم کو دیکھتا رہا۔اس کی گھنی داڑھی اور مونچھوں کے سخت بالوں پر خون کے لال لال قطرے بکھرے ہوئے تھے۔آنکھوں کے چراغ جل رہے تھے' بجھ رہے تھے۔وہ رک رک کر گہری

سانس بھرتا رہا۔ پھر اس نے خون آلود خنجر مضبوطی سے پکڑا اور ایک چٹان سے اڑا کر پوری قوت سے اپنے سینے میں اتار دیا۔ وہ نڈھال ہو کر گرا اور خاک میں لتھڑا ہوا پتھریلی زمین پر پھڑ کنے لگا۔

نور بخش رستمانی کو اس ہولناک سانحے کی اطلاع ایک چرواہے سے ملی۔ وہ بدحواسی کے عالم میں گھوڑا دوڑاتا ہوا لوپ میں پہنچا۔ سورج لوپ کی پہاڑیوں کی چوٹیوں پر جگمگا رہا تھا۔ اس کی رنگت سرخ پڑتی جا رہی تھی جس سے سیاہ پہاڑیاں بھی سرخی مائل ہو گئی تھیں۔ اوپر آسمان میں چیلوں اور گدھوں کا غول منڈلا رہا تھا۔ ایک پہاڑی کے نشیب میں اس کے باپ اور بڑی بہن شیریں کے جسم قریب قریب پڑے تھے۔ لال لال خون جم کر سیاہ پڑ گیا تھا۔ دونوں مر چکے تھے۔

باپ کا ہاتھ ابھی تک خنجر کے دستے پر جما ہوا تھا۔ گردن ایک طرف ڈھلک گئی تھی۔ بہن کی بے نور آنکھیں کھلی تھیں۔ وہ دم بدم سرخ ہوتے ہوئے آسمان کو تک رہی تھی۔ نور بخش رستمانی کی عمر اس وقت سولہ برس کے لگ بھگ تھی۔ ہر چند کے اس کے سر اور داڑھی کے بالوں میں اب کہیں کہیں سفیدی جھلکنے لگی تھی مگر یہ دل خراش منظر وہ ابھی تک فراموش نہیں کر سکا تھا۔

نور بخش رستمانی اپنی لاڈلی بیٹی گل زریں کو ہنج بنا کر بڑی بہن شیریں کے اس روح فرسا روپ میں کسی طور دیکھنا نہ چاہتا تھا جسے یاد کر کے وہ ہمیشہ تڑپ اٹھتا تھا۔ وہ دل گرفتہ اور سخت پریشان تھا۔ اس کی پریشانی کی ایک بنیادی وجہ یہ بھی تھی کہ کچھ ہی عرصہ قبل وہ گل زریں کا رشتہ اپنے ہم مرتبہ ایک خوشحال گھرانے کے ایک نوجوان سے طے کر چکا تھا جو لاہور کے ایک کالج میں اپنی تعلیم مکمل کر رہا تھا۔ رشتہ طے کرنے کے بعد وہ ۲۵ ہزار روپے بطور ولور بھی لے چکا تھا۔ یہ وہ رقم تھی جو بلوچوں کے سماجی دستور کے مطابق لڑکی کے والدین اس کے ہونے والے شوہر سے وصول کرتے ہیں۔ بہاولپور اور اس کے گردونواح کے علاقوں میں بھی یہ رسم عام ہے۔ البتہ ولور کی رقم کو سمھا وا کہا جاتا ہے۔

گل زریں اگر میرتھ مرکہ کی رو سے ہنج بن جاتی تو نور بخش کو دوہرا نقصان ہوتا۔ اس طرح اس کی بیٹی نہ صرف مقتول کے وارثوں کے جذبہ انتقام کی بھینٹ چڑھ جاتی بلکہ اسے ولور کے پچیس ہزار روپے بھی واپس کرنا پڑتے۔ چنانچہ اس کی یہ خواہش تھی کہ گل زریں بیاہ کر اپنے ہونے والے شوہر کے پاس چلی جائے اور اس کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی بسر کرے اور ولور کے پچیس ہزار کی رقم خون بہا کے طور پر مقتول کے وارثوں کو دی جائے۔ لیکن جرگے میں میرتھ مرکہ کا فیصلہ اس کی خواہش کے برعکس ہونے والا تھا۔

جرگہ بیٹھنے میں ابھی دو روز رہتے تھے۔ نور بخش نے ایک آخری کوشش کی۔ وہ راتوں رات چھپتا چھپاتا شاہ میر پہنچا۔ چاکر خان سرگانی سے خفیہ طور پر ملا۔ اسے صورت حال سے آگاہ کیا' اپنا دکھ درد بتایا۔ گڑگڑایا' پانچ سو روپے نکال کر سردار کے لیے نذرانہ پیش

کیا اور اس خواہش کا اظہار کیا کہ جرگے کے بجائے سردار اپنی کچہری میں مقدمے کا فیصلہ کرا اور اس کی بیٹی گل زریں کو ونج ہونے سے بچالے۔

چاکر خان سرگانی سے ملنے کے بعد نور بخش فوراً واپس چلا گیا۔

سرگانی تخلیہ میں سردار شہ زور خان مزاری سے ملا۔ نور بخش رستمانی نے جو پانچ سو روپے نذرانے کے دیئے تھے پیش کئے۔ نور بخش کی پریشانی بیان کی اور دبی زبان میں یہ بھی بتایا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ چاکر خان سرگانی جاں نثار اور وفادار ہونے کے ساتھ ساتھ سردار مزاری کا محرم راز اور مشیر بھی تھا۔ چنانچہ سردار مزاری نے تمام تفصیلات سننے کے بعد صورت حال کا جائزہ لیا۔

سرگانی سے صلاح مشورہ کیا اور جرگے میں میر تھ مرک کا فیصلہ ہونے سے پہلے ہی مقدمہ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

مقدمہ کی سماعت شروع ہوئے کئی گھنٹے گزر چکے تھے۔ کنوار کے مہینے کا تپتا ہوا سورج چڑھ کے آسمان کے بیچوں بیچ پہنچ گیا تھا۔ کچہری میں مصدانیوں کے دو معتبروں کے علاوہ مقتول کی بیوہ ماں زرینہ بی بی اور اس کے بیٹے بھی موجود تھے۔ رستمانیوں کے معتبروں کے ساتھ ساتھ نور بخش بھی عدالت میں حاضر تھا۔

کچہری پر سناٹا چھایا تھا۔ سب خاموش تھے۔ سردار شہ زور خان مزاری بھی چپ تھا۔ وہ نظریں جھکائے سوچ رہا تھا کہ مقدمے کو اب مزید طول نہیں دیا جاسکتا۔ پچھلی پیشیوں میں فریقین بیانات دے چکے تھے اور اپنے موقف کی تائید میں طرح طرح کے دلائل بھی پیش کر چکے تھے۔

شہادتیں بھی ہو چکی تھیں۔ ثبوت بھی مہیا کئے جا چکے تھے۔ فریقین اور ان کے گواہوں پر جرح بھی کی جا چکی تھی۔ اب وہ مرحلہ آگیا تھا کہ سردار مزاری کو مقدمے کا فیصلہ سنانا تھا۔ مگر وہ فیصلہ سناتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔ مقدمے کی کارروائی کے آغاز ہی سے اندازہ ہو گیا تھا کہ اسے سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا ہوگا۔ مقدمہ بہت پیچیدہ اور سنگین تھا۔ فیصلے کی تین ہی واضح صورتیں تھیں اور وہ یہ تھیں کہ مقتول کے وارثوں کو آمادہ کیا جائے کہ خون بہا کے طور پر نقد رقم وصول کر لیں اور اگر وہ اس پر رضامند نہ ہوں تو رستمانیوں پر دباؤ ڈالا جائے کہ وہ مصدانیوں کے مطالبے کے مطابق معافی مانگ لیں۔ اس کے علاوہ نور بخش رستمانی کی بیٹی گل زریں کو ونج قرار دینے کا طریقہ کار تھا جو غیر جانبدار قبائل کے معتبروں اور بزرگوں نے قبول کیا تھا۔ لیکن نور بخش سے نذرانے کی صورت میں پانچ سو روپے لینے کے بعد وہ ایسا کرنا نہ چاہتا تھا۔

مگر وہ جو بھی فیصلہ کرتا کسی فریق میں اتنی جرات نہ تھی کہ اسے قبول کرنے سے انکار کرتا۔ وہ سردار تھا اور اس کا فیصلہ آخری فیصلہ

تھا۔ لیکن زبردستی مسلط کرنے کی صورت میں خدشہ لاحق کہ میرٹھ مرکہ پر پوری طرح عمل درآمد نہ ہوتا اور فریقین کے درمیان معرکہ آرائی اور دشمنی ختم ہونے کی بجائے اور بڑھ جاتی۔ کسی نہ کسی بہانے چھیڑ چھاڑ ہوتی اور ایک بار پھر مسلح تصادم ہوتا۔ خون خرابہ ہوتا۔ کچھ جاں بحق ہوتے کچھ زخمی۔ یہ صورت حال مزاری کے لیے خفت اور بدنامی کا باعث ہوتی۔ اس کے عدل وانصاف پر حرف آتا۔ لہٰذا اس کی کوشش یہ تھی کہ ایسا فیصلہ کرے جسے دونوں فریق بہ رضا و رغبت تسلیم کرلیں۔

سردار مزاری اسی ادھیڑ عمر میں مبتلا تھا اور حقے کی نے ہونٹوں میں دبائے آہستہ آہستہ کش لگا رہا تھا۔ اسی اثناء میں بھگوان داس درکھان کچہری میں داخل ہوا۔ مگر دروازے ہی پر ٹھٹک کر رہ گیا۔ سردار نے اسے دیکھا تو پہلی ہی نظر میں پہچان لیا۔

پچھلے جاڑوں کا ذکر ہے۔ سردار مزاری نے بڑی بیٹی کی شادی سے قبل اپنی حویلی کے صدر دروازے کی ازسرنو تعمیر کرائی تو پھاٹک کے بدرنگ اور بوسیدہ کواڑ بدل کر نئے بنوائے تھے۔ اس کام کے لیے چاکر خان سرگانی نے بھگوان داس درکھان کو لگایا تھا۔ وہ ماہر کاریگر تھا اور اپنی ہنرمندی اور مہارت کے لیے مشہور تھا۔ اس کی رہائش کا بندوبست بھی حویلی کے وساخ یعنی مہمان خانے کے اس گوشے میں کر دیا گیا جہاں نوکر اور دوسرے شاگرد پیشہ کوٹھریوں میں رہتے تھے۔

بھگوان داس' سخت محنتی اور جفاکش تھا۔ ہمیشہ اپنے کام سے کام رکھتا۔ سورج نکلتے ہی اوزار سنبھال کر اپنی کوٹھری سے نکلتا اور غروب آفتاب تک کام میں جتا رہتا۔ البتہ منگل کو وہ چھٹی کرتا اور پیر کی شام کو کوٹلا چلا جاتا اور بدھ کی صبح واپس کام پر آجاتا۔ اس کے ان معمولات میں کبھی فرق نہ آیا۔ سردار مزاری چاہتا تھا کہ حویلی کے صدر دروازے کی تعمیر کا کام جلد سے جلد ختم ہوجائے۔ چنانچہ ایک بار اس نے بھگوان داس درکھان کو روکنا چاہا تو وہ ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہوگیا۔ عاجزی سے گویا ہوا "سائیں تو سردار ہے' تو جم شیر ہے۔ تیرا حکم سرآنکھوں تے پر میں منگل کو ادھر نہیں رہ سکتا۔ منگل وار کو میں وتی میں صرف اپنا مندر بنانے کا کام کرتا ہوں' کوئی دوسرا کام نہیں کرتا۔"

بھگوان داس درکھان نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ ان دنوں اس پر ایک ہی دھن سوار تھی اور وہ تھی کوٹلا شیخ میں مندر کی تعمیر اور یہ کام بھی وہ تن تنہا کر رہا تھا۔ کوئی بال بچہ بھی نہ تھا' بیوی تھی وہ گزشتہ سال ہیضہ میں مبتلا ہوکر داغ مفارقت دے گئی تھی۔ وہ اس کی مونس وغمخوار تھی۔ اسی کے روکنے پر بھگوان داس درکھان نے شرنارتھی بن کر بمبئی جانے کا ارادہ ترک کر دیا تھا جہاں اس کا چھوٹا بھائی اور کئی رشتے دار پہلے ہی پہنچ چکے تھے۔

بیوی کے مرنے کے بعد زندگی میں جو خلا پیدا ہوگیا تھا اسے پر کرنے کے لیے بھگوان داس درکھان نے مندر بنانے کی ٹھانی اور

اس کام کے لیے منگل کا دن مختص کر دیا۔ اس کی بیوی کا انتقال منگل ہی کو ہوا تھا۔ وہ ہفتے میں چھ روز محنت مزدوری کرتا اور جو کچھ بچتا اسے مندر کی تعمیر پر لگا دیتا۔

غرض کہ سردار شہ زور خان مزاری نے اسے دوبارہ روکنے کی کوشش نہیں کی۔ بھگوان داس پوری لگن اور انہماک سے سردار مزاری کی حویلی میں کام کرتا رہا۔ پھاٹک کے اونچے اونچے کواڑوں کی جوڑی تیار کرنے کے ساتھ ساتھ حویلی کی روکار کی تعمیر کا کام بھی اسی نے انجام دیا۔ کواڑوں کی جوڑی پر اس نے نہایت نفاست اور دیدہ ریزی سے پھول بوٹے اور نقش ونگار کندہ کئے اور پھاٹک کی بلندی پر ایسی سجل محرابیں بنائیں کہ حویلی کی شان دوبالا ہوگئی۔ جو دیکھتا عش عش کرتا۔ سردار مزاری اس کے کام سے اس قدر خوش ہوا کہ رخصت کرتے وقت پچاس روپے بطور انعام دیئے۔

بھگوان داس درکھان پہلی بار سردار مزاری کی کچہری میں حاضر ہوا تھا حالانکہ وہ مقدمے کا ایک اہم گواہ تھا۔ فریقین نے اپنے بیانات میں اس کا ذکر بھی کیا تھا۔ مگر کسی نے اسے بطور گواہ پیش نہیں کیا تھا۔

سردار مزاری ٹکٹکی باندھے اسے چند لمحے تک تکتا رہا پھر ہاتھ کے اشارے سے قریب بلایا۔ وہ آگے بڑھا اور سنبھل سنبھل کر قدم اٹھاتا ہوا سردار کے روبرو پہنچ گیا۔ حسب دستور دعائیہ جملوں سے اظہار نیاز مندی کیا۔ "سائیں سردار سدا جیوں' بال بچے سب کی خیر ہو۔"

وہ سردار کے قدموں کی جانب جھکا مگر پیرن پون کے لیے پیروں کو ہاتھ نہ لگایا۔ جھکا ہوا سر اٹھایا اور سیدھا کھڑا ہوگیا۔ سردار شہ زور خان مزاری کو اس کا رویہ شاک گزرا۔ مگر درگزر سے کام لیا۔ اس نے غور کیا' بھگوان داس درکھان کی داڑھی اور مونچھوں کے بال کچھ اور سفید ہو گئے تھے۔ وہ اب لاغر اور نڈھال نظر آ رہا تھا۔ سر پر ڈھیلی ڈھالی پگڑی تھی اور گرمی کے باوجود بدن کے گرد ملگجی چادر لپٹی ہوئی تھی۔ اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے تھے اور آنکھیں بجھی بجھی تھیں۔

سردار مزاری کو معاً یاد آیا کہ وہ منگل کا دن تھا اور اس روز بھگوان داس صرف اپنا مندر تعمیر کرنے کا کام کرتا تھا۔ اس نے حیرت سے دریافت کیا۔ "درکھان! آج تو کیسے آ گیا؟ تو نے آج مندر بنانے کا کام نہیں کرنا؟"

"نا سائیں! میں اب مندر نہیں بناتا۔"

"کیوں؟" سردار اور زیادہ حیرت زدہ ہوگیا۔

بھگوان داس درکھان نے کوئی جواب نہ دیا۔ خاموشی سے بائیں جانب سر جھکا دیا۔ گردن کے پاس اڑسا ہوا چادر کا کونا دانتوں

سے پکڑ کر ایک جھٹکے سے علیحدہ کر دیا۔ چادر ڈھلک کر نیچے گر گئی۔ بھگوان داس نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کر سامنے کر دیا جو کہنیوں تک کٹے ہوئے تھے۔

''سائیں! جو درکھان مندر بناتا تھا اس کا مرن ہو گیا۔ جب درکھان ہی نہ رہا تو مندر کیسے بن سکتا ہے؟'' اس نے آہ سرد کھینچی۔ ''میرا مندر بنانے کا سفنا' سفنا ہی رہ گیا۔ وہ اب کبھی پورا نہ ہوگا۔''

کچہری پر سکتہ طاری ہو گیا۔ ہر شخص دم بخود تھا اور حیران و پریشان نظروں سے بھگوان داس کے بریدہ بازوؤں کو دیکھ رہا تھا جنہیں وہ پر کٹے کبوتروں کی طرح ہولے ہولے جنبش دے رہا تھا۔ چند لمحے گہری خاموشی چھائی رہی۔ پھر سردار مزاری کی آواز ابھری۔

''بھگوان داس' تیرے یہ ہاتھ مصدانیوں اور رستمانیوں کی لڑائی میں میرٹھ کراتے ہوئے کٹ گئے تھے؟''

''نا سائیں' کٹے نہیں زخمی ہوئے تھے۔'' بھگوان داس نے وضاحت کی۔ ''جب وقت میں زخم ٹھیک نہیں ہوئے' پکنے اور سڑنے لگے تو میں شہر جا کر سرکاری ہسپتال میں داخل ہو گیا۔ وہاں ڈاکٹروں نے دونوں ہاتھ کاٹ دیئے۔ میں اب تک ہسپتال ہی میں تھا۔ پچھلے اتوار کو ٹلا شیخ واپس پہنچا تھا۔''

''یہ تو بہت برا ہوا۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔'' سردار نے اظہار تاسف کیا۔ ''تیرے ساتھ بہت ظلم ہوا۔''

''نا سائیں! کوئی ظلم شلم نہیں ہوا۔ جب لڑائی بھڑائی ہوتی ہے تو ایسا ہی ہوتا ہے کوئی مرتا ہے کوئی زخمی ہوتا ہے۔'' بھگوان داس نے مڑ کر مقتول کی ماں کی جانب دیکھا۔ ''مجھے تو یہ دکھ ہے میں میرٹھ کرانے کے لیے کچھ پہلے پہنچ جاتا تو شاید زرینہ بی بی کا پتر بچ جاتا۔ کئی زخمی ہونے سے بچ جاتے۔'' اس نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ ''سائیں! میں تو یہ سوچ کر کچہری میں آیا تھا کہ میرٹھ.....''

''ٹھیک ہے ٹھیک ہے'' سردار نے اسے مزید کچھ کہنے نہ دیا۔ ''بھگوان داس تو نیک بندہ ہے' تو نے بہت چنگا کام کیا۔'' سردار مزاری کا چہرہ اچانک سرخ پڑ گیا۔ آنکھوں سے جلال ٹپکنے لگا۔ اس نے قہر آلود نظروں سے سامنے کھڑے ہوئے مصدانیوں اور رستمانیوں کو دیکھا۔ ہاتھ اٹھا کر بھگوان داس درکھان کی جانب اشارہ کیا۔ تیکھے لہجے میں مصدانیوں کو مخاطب کیا۔

''اسے دیکھ رہے ہو' یہ تمہارا میار ہے۔ اس کی جان و مال کی حفاظت کرنا تمہارا فرض ہے۔ پر تم اپنا دعویٰ لے کر آ گئے۔ تم نے یہ نہیں سوچا کہ تمہارے میار پر کیا بیتی۔ یہی تمہاری میار داری ہے؟ بولو جواب دو۔''

''سائیں سردار! توں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔'' مصدانیوں کے ایک معتبر نے اپنے قبیلے کی ترجمانی کرتے ہوئے اظہار معذرت کیا۔ ''سائیں! ہم سے بھل ہوگئی' معافی دے دے۔''

سردار نے رستمانیوں کی سمت دیکھا۔ ''تم نے اپنے میار کے لیے کیا کیا؟ تمہاری میارداری کو کیا ہوگیا؟ تم اپنے جرم کی صفائی پیش کرنے آگئے۔ اپنے گواہ بھی لائے۔ ثبوت بھی دیئے۔'' اس نے ایک بار پھر بھگوان داس درکھان کی طرف ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ ''اس جرم کی صفائی تم کس طرح پیش کرو گے؟''

اس دفعہ رستمانیوں کے ایک معتبر نے اظہار معذرت کیا۔ ''سائیں! ہم سے بھی بھل ہوگئی' معافی دے دے۔'' اس نے اپنی گھنی داڑھی پر ہاتھ پھیرا اور گردن جھکا کر گڑگڑانے لگا۔ ''سائیں! تو سدا جیویں' رب راضی باضی ہو' ہمیں معافی دے دے۔''

''اس طرح کام نہیں چلے گا۔'' سردار مزاری نے نظریں گھما پھرا کر پھر مصدانیوں اور رستمانیوں کو دیکھا۔ ''میار پر جو ظلم ہوا ہے معافی مانگنے سے اس سنگین جرم کی تلافی نہیں ہوسکتی۔'' اس نے غصے سے گردن کو جھٹکا۔ ''ہرگز نہیں ہوسکتی۔''

کمرے میں گہرا سکوت طاری تھا۔ سب خاموش تھے۔ سہمے ہوئے تھے۔ سردار نے حقے کی نے سنبھالی۔ ہونٹوں میں دبائی اور ہولے ہولے کش لگانے لگا۔ اس کا کم دار چاکر خان سرگانی ہاتھ باندھے' نظریں جھکائے' مودب کھڑا تھا۔ مالشیا چابک دستی سے سردار کی کمر اور بازوؤں کے پٹھے دبا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ تیزی سے چل رہے تھے۔

سردار مزاری نے حقے کی نے ایک طرف کردی۔ کھنکار کر گلہ صاف کیا اور بھاری بھرکم لہجے میں فریقین کو مخاطب کیا۔ ''بھگوان داس درکھان کے کچہری میں حاضر ہونے کے بعد کیونکہ مقدمے کے نوعیت بدل گئی ہے لہٰذا اس کے بارے میں نئے سرے سے سوچ بچار کرنا ہوگا۔ مقدمے کی کارروائی کل بھی جاری رہے گی۔ کچہری اب برخاست کی جاتی ہے۔''

سرگانی کے اشارے پر ایک ملازم فوراً آگے بڑھا۔ سردار مزاری کے قریب پہنچا اور اس کی کمر اور گھٹنوں کے گرد لپٹی ہوئی کھیری کی گرہ کھولنے لگا۔

دوسرے روز پہر دن چڑھے مقدمے کی کارروائی پھر شروع ہوئی۔ مگر زیادہ دیر جاری نہ رہی۔ نہ کسی فریق کا بیان لیا گیا نہ کوئی گواہی پیش ہوئی نہ جرح۔ سردار مزاری نے صرف مقدمے کا فیصلہ سنایا جو بہت مختصر تھا۔

''عینی گواہوں کی شہادتوں سے رستمانیوں کے خلاف جرم ثابت ہوچکا ہے۔ لہٰذا ان کو حکم دیا جاتا ہے کہ ۲۵ ہزار خون بہا مصدانیوں کو ادا کریں۔ خون بہا کی رقم نور بخش رستمانی مہیا کرے گا۔ مگر یہ ۲۵ ہزار مقتول کی ماں زرینہ بی بی کو نہیں بلکہ بطور تاوان

بھگوان داس درکھان کو دیئے جائیں۔ نور بخش رستمانی کو ایک ہفتے کی مہلت دی جاتی ہے۔ اگر اس مدت میں وہ یہ روپیہ مہیا نہ کر سکے تو اسے سکے کھوہ میں ڈال دیا جائے۔ اسے تب تک رہا نہ کیا جائے جب تک وہ بھگوان داس درکھان کو پورا تاوان ادا نہ کرے۔"

سردار شہ زور خان مزاری کے اس فیصلے کے خلاف نہ کسی فریق نہ اعتراض کیا نہ احتجاج۔ ان کے چہروں پر نہ کسی قسم کی جھنجھلاہٹ تھی نہ کدورت۔ انہوں نے خاموشی سے فیصلہ سنا اور کچہری سے باہر چلے گئے۔

